محمد علی جوہر کے سیاسی و خلافتی کردار کا

ناقدانہ جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

نگرانِ اعلیٰ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم احمد

مقالہ نگار

شاہدہ الیاس

شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور

2000ء

انتساب

دنیا کی عظیم ترین ہستیوں محترم والد صاحب
اور محترمہ والدہ صاحبہ کے نام،
جن کی دوائیں اور دعائیں میری زندگی کا
سرمایہ ہیں۔

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ابتدائیہ

انگریزی زبان کے مشہور شاعر لانگ فیلو(Longfellow) کے اس شعر

Lives of Great men all remind us

we can make our lives sublime.

کی روشنی میں تاریخی شخصیات کا مطالعہ شروع سے میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مختلف شخصیات کے مطالعہ کے دوران محمد علی جوہر کی حق گوئی، جرات مندی، مذہبیت، حریت وآزادی اور پان اسلام ازم کے جذبے نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خصوصاً گول میز کانفرنس لندن میں تقریر کے دوران انکے یہ الفاظ کہ :۔

"میں غلام ملک میں واپس نہیں جاونگا۔ مجھے آزادی دینا ہوگی یا قبر کیلئے (آزاد ملک میں) جگہ دینا ہوگی۔"

اور یہ کہ :۔

"مجھے یہ شکایت نہیں ہے کہ مسٹر ریڈنگ نے مجھے جیل کیوں بھیجا۔ میں تو صرف انسانی حقوق چاہتا ہوں کہ اگر مسٹر ریڈنگ غلطی کریں تو میں بھی انہیں جیل بھیج سکوں۔"

میری توجہ کا مرکز بن گئے۔ لہذا تحصیلِ علم کے دوران اور بعد میں محمد علی جوہر میرے مطالعے کا خاص جزو رہے۔ اسی دوران دوسری چیز جو ابھر کر سامنے آئی وہ یہ کہ محمد علی کے ناقدین و مخالفین انکے بارے میں انتہائی رائے رکھتے ہیں۔ وہ ان کی ہر خوبی کو منفی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ یہی چیزیں میرے تحقیقی مقالے کیلئے "محمد علی جوہر" کے انتخاب کا سبب بنیں۔

کسی چیز کی خواہش کرنا آسان، لیکن اسکا حصول بہت کٹھن ہوتا ہے خصوصاً تحقیق کی دنیا میں۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنی تحقیقی خواہش کا اظہار پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم احمد صاحب چیرمین شعبہ "تاریخ و مطالعہ پاکستان" اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے کیا۔ توانہوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ بلکہ راہنمائی و تعاون کا بھی مکمل یقین دلایا۔ بفضل تعالیٰ یہ جو مقالہ پیش خدمت ہے اسکے لیے میں استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم احمد صاحب کی انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مقالے کی تیاری کے دوران نہ صرف مجھے وقت دیا، بلکہ موضوع سے متعلق ضروری مواد بھی فراہم کیا۔

دورانِ تحقیق دیگر محترم شخصیات کا تعاون میرے شامل حال رہا۔ ان میں جناب ڈاکٹر محمد آصف رضوی صاحب چیرمین (موجودہ) شعبہ "تاریخ و مطالعہ پاکستان" اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی رہنمائی و تعاون قابلِ ذکر ہے۔ جنکی میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

میرے محترم بزرگ چچا میر سید زاہد حسین صاحب، کے از کار کنانِ تحریک پاکستان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انکی شفقت پدرانہ اور علمی وادبی راہنمائی سے " تاریخ و پاکستانیت " سے وار فتگی میری زندگی کا جزو لا ینفک بن گئی۔ انکے ذاتی کتب خانہ "بیت الحکمت" صادق آباد سے میں نے مکمل استفادہ کیا۔ بلکہ آغازِ کار اسی کتب خانے سے کیا۔

جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب، جناب ممتاز الاسلام صاحب چیف لائبریرین "بیت الحکمت" ہمدرد یونیورسٹی کراچی، محترمہ ملاحت کلیم شیروانی صاحبہ چیف لائبریرین کراچی یونیورسٹی، چوہدری محمد ظہیر احمد صاحب ڈائریکٹر نیشنل لائبریری آف پاکستان اسلام آباد اور نیشنل ارکائیوز آف پاکستان اسلام آباد کے خصوصی تعاون پر تہہ دل سے انکی شکر گزار ہوں۔

اس کام کی تیاری کے دوران ملک کی مختلف لائبریریوں میں جانا ہوا۔ جہاں سے مجھے بہت مدد ملی۔ ان تمام اداروں، کارکنان و منتظمین کے نام ایک طویل فہرست کی شکل اختیار کرنے کے خوف سے انکا فرداً فرداً حوالہ ممکن نہیں۔ تاہم میں ان سب کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنھوں نے میرے تحقیقی کام کے سلسلے میں مدد و تعاون کیا۔

بفضل تعالیٰ مجھے مختلف شہروں کے علمی و ادبی اور تعلیمی اداروں کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ لیکن کراچی کے علمی و ادبی حلقوں کی خصوصی طور پر مشکور ہوں، جنھوں نے توقع سے بھی بڑھکر تعاون کیا۔ بسلسلہ پروف ریڈنگ محترمہ زاہدہ نور صاحبہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج برائے خواتین خانپور، اور بسلسلہ کمپوزنگ جناب کاشف نور صاحب "النور" کمپوزنگ سنٹر خانپور کی انتہائی مشکور ہوں۔ جنھوں نے اپنا قیمتی وقت دیکر میرے مقالے کی تکمیل میں بھر پور تعاون کیا۔

بغیر مادی وسائل کی فراہمی اور حوصلہ افزائی کے کوئی تحقیقی کام صحیح معنوں میں تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں میرے والد محترم، والدہ محترمہ اور بڑے بھائی محمد اکرم الیاس خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے میرے ہر مسئلے اور پریشانی کا فوری ازالہ کر کے قدم قدم پر میری راہنمائی فرمائی۔ میرے چھوٹے بھائیوں محمد اختر الیاس، محمد امجد الیاس اور محمد راشد الیاس نے واقعی صحیح معنوں میں اپنا حق ادا کیا۔ مواد کی فراہمی اور میرے ساتھ ملک کے مختلف (دور و نزدیک) کتب خانوں میں جانے کے سلسلے میں مکمل تعاون کیا۔ میں اپنی بہنوں، بھابھیوں، دوستوں اور دیگر عزیزوں کی از حد ممنون و مشکور ہوں۔ جنھوں نے بھر پور تعاون کر کے میرے مقالے کی تکمیل کو یقینی بنایا۔

حقیقتاً وہی ذات باری تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ جس نے یہ تمام اسباب و وسائل فراہم کئے۔ اور مجھے مقالے کی تکمیل میں کامیابی عطا فرمائی۔

شاہدہ الیاس
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ و مطالعہ پاکستان
گورنمنٹ کالج برائے خواتین خانپور
ضلع رحیم یار خان

14 اگست 2000ء (پیر ۱۳ جمادی الاول ۱۴۲۱ھ)

اختصاریہ

ہماری قومی زندگی کا یہ ایک بڑاالمیہ رہا ہے کہ اسلام کے نام لیوا اپنے محسنوں اور مخلصوں سے انجام کار اچھا سلوک نہیں کرتے۔ وہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کیلئے کبھی انکے خون سے ہاتھ رنگ لیتے ہیں۔ کبھی انپر بہتان تراشیوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور کبھی انکی خدمت کرنے کی بجائے انہیں کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے ان محسنوں میں محمد علی جوہر بھی سر فہرست ہیں۔ جو ساری عمر ملک و قوم کیلئے قربانیاں دیتے رہے۔ مسلمانوں کے حقوق کیلئے لڑتے رہے۔ دارورسن تک پہنچ کر لوٹتے رہے اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ ہی نام نہاد راہنماؤں کی طرح ارباب غرض سے مفاد اٹھایا۔ اور نہ ہی کبھی کسی نے انکی تنگ دامنی کی فکر کی۔ بلکہ انکے خلاف منفی پروپیگنڈے کی مہم جاری رہی۔ مخالفین نے الزامات و اعتراضات کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش کئے بغیر انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ انہیں محمد علی میں کوئی خوبی ہی نظر نہیں آتی، جو حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ انہی عوامل کا جائزہ لینے کے لیے میں نے تحقیقی موضوع کے طور پر "محمد علی جوہر" کا انتخاب کیا۔ کہ آیا اس انتہا پسندی کی کیا وجوہ ہیں؟ حتی الامکان کوشش کی ہے کہ تحقیق کر کے صحیح نتائج اخذ کر سکوں۔ اس مقصد کیلئے میں نے موضوع کو سن وار مختلف ابواب میں تقسیم کر کے مطالعہ کی کوشش کی ہے تا کہ واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

باب اول 1857ء سے 1906ء کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں پس منظر کے طور پر ان حالات کا جائزہ لیا ہے جو 1857 کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو پیش آئے۔ دورِ غلامی کا آغاز ہوا۔ مسلمان معاشی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی غرض کہ ہر میدان میں تنزل کا شکار ہو گئے۔ اور ہندوؤں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ محمد علی نے بھی انہی حالات میں جنم لیا۔ والدہ بی اماں (آبادی بانو بیگم) نے انہیں معاشی پریشانیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور خاندانی مخالفت کے باوجود علی گڑھ و آکسفورڈ جیسی درسگاہوں سے جدید تعلیم دلوائی۔ اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ محمد علی نے کن حالات کی بنا پر 1902ء میں عملی زندگی کا آغاز نواب رامپور کی ملازمت سے کیا۔ پھر بڑودہ میں اعلیٰ افسر مقرر ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کر کے ایک باعزت اور آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔ ترقی کی شاہراہ میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ چلیں۔ اسلئے دوران ملازمت علی گڑھ کالج انکی توجہ کا مرکز رہا۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستہ رہے۔ سیاسی اتار چڑھاو، ہندوؤں کی سیاسی و نیم سیاسی تحریکوں اور دیگر واقعات جن میں تقسیم بنگال 1905ء اور شملہ وفد 1906ء قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ان میں سیاسی تحریک پیدا کی۔ گو 1906ء کے وسط تک محمد علی عملی سیاست سے دور رہے۔ لیکن ملکی حالات و سیاست پر انکی گہری نظر تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ تو ان کے حقوق کی طلبی کیلئے 1906ء کے آخر میں قیام مسلم لیگ کے ساتھ ہی میدانِ سیاست میں قدم رکھا۔

باب دوم 1906ء سے 1919ء کے واقعات پر محیط ہے۔ جس میں اس بات پر بحث کی گئی ہے۔ کہ مختلف اسباب خصوصاً اردو ہندی جھگڑے کے اثرات نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام میں اہم کردار ادا

کیا۔ اور محمد علی اسکے بانیوں میں شمار ہوئے۔ مسلم لیگ کے ساتھ انکی وابستگی اور دیگر سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔
ترکِ ملازمت اور میدانِ سیاست و صحافت کے انتخاب کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ جسکے تحت انہوں نے 1911ء میں انگریزی
اخبار "کامریڈ" اور 1913ء میں اردو اخبار "ہمدرد" کا اجراء کیا۔ طرابلس و بلقان کی جنگیں، تنسیخِ تقسیم بنگال، سانحہ مسجد کانپور
اور جنگ عظیم اوّل کے سلسلے میں محمد علی کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں انکا جذبہ اتحادِ ملی و بین الملی جھلکتا نظر آتا
ہے۔ علاوہ ازیں اندرونِ ملک جدت پسند اور قدامت پسند مکاتبِ فکر کے درمیان ہم آہنگی و مفاہمت کی کوششیں شامل ہیں۔
مسلمانوں کے سیاسی و آئینی مسائل کے حل اور حصول کی کوششوں، قومی و بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی
ناانصافیوں اور زیادتیوں کے ازالے کیلئے محمد علی کے کردار اور ترکوں کی حمایت میں "چوائس آف دی ٹرکس" مضمون لکھنے کی
پاداش میں قید و بند سے متعلق حکومتِ وقت کے طرز عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس کے تحت محمد علی پر بے بنیاد الزامات عائد
کر کے انہیں دسمبر 1919ء تک مختلف جیلوں مہرولی، لینسڈاؤن، چھندواڑہ اور بیتول میں قید رکھا گیا۔

باب سوم 1919ء سے 1924ء کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ جس میں بحث کی گئی ہے کہ محمد علی کی
نظربندی کے دوران جنگ کے خاتمے پر ترکوں کے ساتھ حکومت کا ناروا سلوک، رولٹ ایکٹ، سانحہ جلیانوالہ باغ، گاندھی
کی ستیہ گرہ تحریک، مظالم پنجاب اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات جیسے واقعات کیوں کر پیش آئے۔ جنھوں نے ہندوؤں اور
مسلمانوں میں اتحاد و تعاون کی راہیں ہموار کیں۔ مسلمانانِ ہند نے ترکی کی بقاء، خلافت کی بحالی اور مقدس مقامات کے تحفظ
کیلئے مولانا عبدالباری فرنگی محل کی قیادت میں تحریک خلافت کا آغاز کر دیا۔ دسمبر 1919ء میں رہائی کے بعد محمد علی کو تحریک
کی کمان سونپ دی گئی۔ جنھوں نے اسکے ارتقاء و عروج کیلئے شب و روز جدوجہد کی۔ وفد خلافت لیکر یورپ گئے۔ ملک
واپسی پر تحریک عدم تعاون و ترکِ موالات کو کامیاب بنانے کیلئے گاندھی کے ساتھ ملک گیر دورے کئے، جلسے کئے، تقاریر
کیں اور عوام میں شدید جوش و خروش پیدا کر دیا۔ وہ یہ سب کچھ مذہبی و قومی جذبے کے تحت کر رہے تھے۔ تحریک خلافت
کے ارتقاء و عروج اور ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں محمد علی کی مجاہدانہ کاوشوں پر بحث کی گئی ہے۔ تحریک عدم تعاون و
ترک موالات، تحریک ہجرت اور موپلا بغاوت کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ خلافت کانفرنس کراچی 1921ء کی صدارت کے
بعد محمد علی کی گرفتاری، انکی عدم موجودگی میں مسٹر گاندھی کے طرز عمل اور فروری 1922ء میں خلافت تحریک کو ختم کرنے
کے اقدام پر بحث کی ہے۔ ہندو مسلم منافرت و انتشار، شدھی و سنگھٹن اور ان کے مقابلے میں تبلیغ و تنظیم کا آغاز،
ہندو مہا سبھا و آریہ سماج کی سرگرمیاں، کانگریس میں گروہ بندی، محمد علی کے خلاف پروپیگنڈہ مہم اور 1923ء میں رہائی کے بعد
محمد علی کی ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں کوششوں کا جائزہ شامل ہے۔ اسکے علاوہ محمد علی کے مسلم و غیر مسلم ناقدین
نیازی برکس، پروفیسر بایور، فرانسس رابنسن، محمد مجیب اور حامیوں محمد صادق، افضل اقبال، پی ہارڈی، جی مینالٹ اور
پروفیسر گون گور وغیرہ پر بحث شامل ہے۔ تحریک خلافت کی ناکامی اور اسکے مثبت و منفی پہلوؤں کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش
کی ہے۔

باب چہارم میں 1924ء سے 1931ء تک ہندو مسلم سیاست کا مطالعہ شامل ہے۔ سیاسی اتار چڑھاؤ،
جمود و تعطل، ہندو مسلم اختلافات اور مسلمانوں کے باہمی انتشار و افتراق پر بحث کی گئی ہے۔ اس تنزل میں محمد علی کی کوششوں

کا ذکر ہے، جو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی استواری، مسلمانوں کے باہمی نفاق کے خاتمے اور ملک کے آئینی و سیاسی بحران کو حل کرنے کے سلسلے میں سرانجام دیں۔ یعنی وہ سید احمد خان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے الزامات، اعتراضات، اور مخالفتوں کے باوجود بھی ملک و قوم کی بھلائی کیلئے سرگرم عمل رہے۔ اتحاد کانفرنس دہلی، شملہ یونٹی کانفرنس، مسئلے حجاز و مؤتمر، اسپیشل خلافت کانفرنس، انڈین نیشنل یونین، خواجہ حسن نظامی کے ساتھ معرکہ آرائی، آل پارٹیز صلح کانفرنس، سائمن کمیشن، تجاویز دہلی، پولیٹکل کانفرنس یوپی، آل پارٹیز کانفرنس دہلی، نہرو رپورٹ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس پٹنہ، کلکتہ کنونشن، مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی، مسلم لیگ میں گروپ بندی کا خاتمہ، چودہ نکات، علماء کانفرنس وجدید جمعیت علماء کانفرنس، علماء کانفرنس کانپور، لاہور کا قومی میلہ اور پہلی گول میز کانفرنس لندن وغیرہ میں محمد علی کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔

طوالت کی وجہ سے تمام ابواب میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا ہے کہ اگر کوئی وضاحت طلب واقعہ ہے تو اسکی تفصیل حوالہ جات میں دینے کی کوشش کی ہے تاکہ تشنگی باقی نہ رہے۔

میں نے درج بالا واقعات کے سلسلے میں اپنی بساط کے مطابق غیر جانبداری پر مبنی تحقیق کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ تاریخ میں کوئی بات قطعی اور حتمی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق حالات وواقعات کی جانچ پرکھ کا حق حاصل ہے۔ آئندہ تحقیق کرنے والا کوئی بھی محقق اس بارے میں مزید حقائق منظر عام پر لا سکتا ہے۔ یہ نقطۂ آغاز ہے۔ یقیناً بعد میں آنے والے محققین اس میں اضافے کا باعث ثابت ہونگے۔

شاہدہ الیاس

باب اول

محمد علی : پس منظر و پیش منظر

1857ء تا 1906ء

پس منظر

محمد علی بن عبد العلی (1848ء -1880ء) بن علی بخش (1813ء -1867ء) بن محبوب بخش (1770ء -1828ء) بن امان اللہ (1785- 86ف) بن طفیل محمد بن فیض محمد بن مدار بخش بن محمد اعظم اللہ بن حیات اللہ) جنھوں نے تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کے نام سے شہرتِ عام وبقائے دوام حاصل کی۔ 10 دسمبر 1878ء مطابق 15 ذوالحجہ 1295ھ بروز منگل ہندوستان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست رامپور (یوپی) میں پیدا ہوئے[1]۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی قیادت وسیادت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ قبل ازیں مسلمانوں نے یہاں چھ سو سال تک حکومت کی تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی سے وہ مسلسل مائل بہ تنزل رہے۔ یہاں تک کہ 1857ء میں انکی حکومت کا باقاعدہ خاتمہ ہو گیا۔ اور انکی جگہ اب عیسائی حکومت نے لے لی۔ اس حکومت کا تعلق ملک انگلستان سے تھا۔ ابتدا میں یہ لوگ تاجروں کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے سیاسی عدم استحکام، درباری سازشوں، گروہی تعصبات اور کمزور قیادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کامیاب حکمت عملی کی بدولت وسط انیسویں صدی میں کل ہندوستان کے مالک بن گئے۔ ہمارے خطے کا سیاہ نصیب نوآبادیاتی دور اس سلسلے کی کڑی تھا[2]۔

غیر ملکی عیسائی حکومت جو کہ تاریخ میں عام طور سے انگریز حکومت کے نام سے مشہور ہوئی اسکے دور اقتدار میں مسلمانان ہند کو بالخصوص سنگین مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی طور پر انکا اثر ورسوخ ختم ہو گیا تو معاشی پریشانیاں انکی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ وہ خاندان جو سیاسی افق پر آفتاب وماہتاب کی مانند جگمگا رہے تھے اپنا اقتدار چھن جانے کے بعد اب معاشی مسائل سے دوچار ہوئے۔ تو لامحالہ اسکا اثر انکی سماجی زندگی پر بھی پڑا۔ سماجی ومعاشی پریشانیوں کی ایک وجہ نئی حکومت کی زرعی لگان اور سرکاری ملازمتوں کے بارے میں نئی حکمت عملی تھی۔ جسکا براہ راست اثر مسلم معاشرے کے اعلی طبقے یعنی "اشراف" پر پڑا۔ کیونکہ نئے قوانین اور حکمت عملی "طبقہ اشراف" کے خیالات ورجحانات اور اعتقادات ونظریات سے متصادم تھے۔ جنھیں ایک عرصہ تک انہوں نے قبول نہ کیا۔ اسکی وجہ سے وہ دن بدن معاشی بدحالی اور سماجی ابتری کا شکار ہوتے گئے۔ انگریز بھی اس حقیقت سے خوبی آگاہ تھے۔ ایک سرکاری رائے کے مطابق :-

> "بنگال میں مغل حکومت کے جانے اور انگریزوں کے ہاتھ حکومت آنے کے وقت مسلمانان بنگال خاصے خوشحال اور دولت مند تھے۔ سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں کا ایک بڑا حصہ انکے پاس تھا۔ لیکن انگریزی اثر ورسوخ قائم ہونے کے بعد انکی حیثیت پر برا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ جائیداد کی ترقی اور فارسی کی بجائے

انگریزی کا بطور دفتری زبان کے اجراء یہ سب مسلم زوال کے اسباب ہیں۔"[3]

یہ تو صرف بنگال جیسے زرخیز صوبے کے بارے میں ایک مختصر سا سرکاری حوالہ تھا۔ ہندوستان کے دیگر صوبوں مثلاً پنجاب، سندھ، مدراس، بمبئی، یوپی اور سی پی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی حالت کسی طور بہتر نہ تھی۔ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں نے نئے حکمرانوں کی حکمت عملی، تعلیمی پالیسیوں اور نئے نئے قوانین کو فوراً قبول کر لیا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ نتیجتاً انکے لئے نئی حکومت کی طرف سے پیش کردہ ان تمام مراعات کا حصول آسان ہو گیا جو مقامی لوگوں کیلئے مختص تھیں۔ لہٰذا ہندو ترقی کی دوڑ اور معاشی و سماجی خوشحالی کے لحاظ سے مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے۔ جہاں نئے نظام اور نئی تبدیلیوں کو فوری طور پر قبول کرنے سے ہندوؤں کو معاشی لحاظ سے خوشحال، سماجی لحاظ سے مستحکم ہونے اور نئے حکمرانوں کے قریب آنے کا موقع ملا۔ وہاں مسلمانوں سے انتقام لینے کا نادر موقع بھی انکے ہاتھ آگیا۔ ایک انگریز نے خود اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ :۔

"سرکاری ملازمت کے ہر شعبے اور ہر سرکاری دفتر میں مسلمانوں کی راہ میں ناجائز روڑے اٹکائے جاتے ہیں کیونکہ اکثر اعلیٰ ملازم ہندو ہیں۔"[4]

ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر نے مسلمانوں کی قابل رحم حالت کی اسطرح تصویر کھینچی ہے کہ :۔

"مسلمان اس حد تک بے یار و مددگار ہو چکے تھے کہ کوئی شخص بھی انکی طرف دھیان نہیں دیتا تھا اور اعلیٰ حکام تو انکے وجود تک کا اعتراف کرنا بھی کسر شان سمجھتے تھے۔ نہ صرف حکومت مسلمانوں کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ کھلے بندوں انکی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اس ناانصافی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب سندربن کے کمشنر کے دفتر کیلئے چند آسامیوں کا اشتہار دیا گیا تو اس میں یہ ضمنی اعلان بھی شامل تھا کہ صرف ہندوؤں کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔"[5]

یہ فطری بات تھی کہ نئے حکمرانوں نے اپنے پیشروں پر شک و شبہ کیا اور انکے مقابلے میں ہندوؤں کو نوازا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ :۔

"انکے اقتدار کی توسیع اور بقا میں جو واحد رکاوٹ باقی رہ گئی تھی وہ مسلمان تھے۔ اسلئے انھیں کچل کر رکھ دینا چاہیے۔"[6]

لہٰذا جب مسلمانوں میں سے کچھ نے اپنے آپکو نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اہل بنایا اور حکومت کی پیش کردہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی تو انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ انگریز کا دل انکی طرف سے صاف نہ تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ہر جگہ ہندو چھائے ہوئے تھے۔ جن سے مسلمان کسی خیر یا بھلائی کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمان معاشی طور پر مفلوک الحال اور سماجی طور پر ابتری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اس افسوسناک صورتحال کے بارے میں صوبوں کے اخبارات نے کھل کر تنقید اور اظہار خیال کیا۔ صوبہ سندھ کے ایک اخبار "الحق" نے مسلمانوں کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :۔

" سرکاری دفتروں میں ہندو افسروں نے سندھ کے مسلمانوں کو جائز حقوق سے

> محروم کر رکھا ہے۔ چونکہ سندھ کے تمام اضلاع میں دفتردار اور ہیڈ منشی (کلرک) ہندو ہیں۔ اسلئے انہی کا اثرورسوخ چلتا ہے اور مسلمان ملازمت کے سلسلے میں دفتروں کے اعلیٰ آفسر تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔"[7]

ایک دوسرے صوبے مدراس کے مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہاں کے ایک اخبار نے اسطرح لکھا کہ :۔

> "جب بھی کسی سرکاری دفتر میں کوئی عہدہ خالی ہوتا ہے توکوئی ایسٹ انڈین یا ہندو اسکے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر دفتر میں منیجر یا معاون اسسٹنٹ انڈین یا ہندو ہے نتیجتًا وہ کسی اپنے رشتہ دار یا پٹھو کا تقرر کردیتے ہیں اور مسلمانوں کو جا کھجا بھی نہیں دیتے۔"[8]

اگر کسی جگہ مسلمان بہتر حالت میں تھے بھی تو ہندوؤں نے انکے خلاف ایسی تحریکوں اور تنظیموں کو جنم دیا جنکا مقصد مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت پر کاری ضرب لگانا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوپی میں جہاں دوسرے صوبوں کی طرح انگریزی زبان کا اجراء ہو چکا تھا۔ لیکن اردو زبان کو وہاں اب بھی دفتری حیثیت حاصل تھی۔ ہندوؤں نے یہاں بھی واویلا شروع کردیا کہ اردو زبان کو یہاں سے بھی ختم کردیا جائے۔[9] ہندی تحریک کے رہنما بابو شیو پرشاد (1823ء -1895ء) نے 1869ء کو بنارس انسٹیٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

> "مسلم اقتدار و حکومت اب باقی نہیں ہے۔ دلی اور لکھنؤ سے انکے بادشاہ اپنی بادشاہت کے ساتھ دریابُرد ہو گئے ہیں۔ ملکہ (وکٹوریہ) کے زیر تسلط آنے کے بعد سے اس ملک میں انکے نقشہ حکومت پر سرخ نشان پھر گیا ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ملک کی عدالتوں میں اب بھی اردو کو برقرار رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"[10]

اس افسوسناک صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقمطراز ہیں کہ :۔

> "گویا ہندو قومیت کے جوش میں تمدنی زندگی کے اس بنیادی رشتے ہی کو کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی جس میں ہندو اور مسلمان ہزار اختلاف کے باوجود کئی صدیوں سے بندھے ہوئے تھے۔"[11]

اس تناظر میں انگریزی زبان و تعلیم کی لیاقت بھی مسلمانوں کیلئے سودمند نہ ہو سکی۔ دوسرا مسلمان بھی اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کی ترویج مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور انکے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔[12] انکا یہ خیال کچھ غلط بھی نہ تھا۔ جسکا اندازہ لارڈ میکالے کی 1835ء کی اس تعلیمی یادداشت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں انگریزی تعلیم کی غرض و غایت ان الفاظ میں واضح کی گئی تھی کہ :۔

> "ہمارا مقصد بہر طور ایک ایسا تقلیتی طبقہ پیدا کرنا ہے جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان، جس پر ہم حکمران ہیں، ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا

طبقہ جو نسل و رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات، خیالات، اخلاق اور
فکر کے لحاظ سے انگریز ہو۔"[13]

ابتدائی حالات

یہ تھا برصغیر کا سیاسی، سماجی اور معاشی پسِ منظر جب محمد علی نے جنم لیا۔ محمد علی بھی شاید ان حالات کا شکار ہو کر کچھ نہ کر پاتے لیکن انکی والدہ کی ہمت و جرأت نے انکی جدید تعلیم کیلئے راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی والدہ محترمہ آبادی بانو بیگم جو تاریخ میں "بی اماں" (1852ء - 1924ء) کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں، ایک عالی حوصلہ، راسخ الارادہ، روشن خیال، نیک طنیت اور دین دار خاتون تھیں۔ اگرچہ خود انہوں نے کسی مکتب و مدرسے سے تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن وہ جدید تعلیم کے حصول کی حامی تھیں۔ کیونکہ یہ چیز عین تقاضائے وقت تھی۔ وہ غلامی سے متنفر اور آزادی کی خواہاں تھیں۔ آبادی بانو بیگم دختر نواب درویش علی خان پنج ہزاری دربار اکبری، کا تعلق ایسے خاندان سے تھا۔ جس نے 1857ء کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف بڑی جرأت مندی اور بے جگری سے حصہ لیا تھا۔[14] محمد علی کے ننھالی بزرگوں میں سے مولوی بشارت علی خان، ولایت علی خان اور مہربان علی خان سر فہرست تھے جو اس جرم کی پاداش میں تختۂ مشق بنائے گئے۔ سامراجی ظلم و بربریت اور انکے بہیمانہ سلوک کا شکار ہوئے۔ جائیدادیں ضبط کر کے انکو مفلوک الحالی پر مجبور کر دیا گیا۔ جب ظلم کی انتہا ہو گئی تو مجبوراً محمد علی کے ننھالی بزرگوں کو روپوش ہونا پڑا۔ ان حالات نے محمد علی کی والدہ کے دل میں انگریز کی نفرت کو جاگزیں کر دیا اور آئندہ وقتوں میں آزادی عمل کیلئے سرگرم عمل کر دیا۔ دوسری طرف محمد علی کا ددھیالی خاندان انگریزوں کا وفادار اور مراعات یافتہ تھا۔[15] لیکن محمد علی کی شخصیت بی اماں کے زیر اثر پروان چڑھی تھی۔ یہ انہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جس نے محمد علی کے خیالات و نظریات اور کاموں کا دھارا ددھیالی خاندان کی روایات کے برعکس انگریزی حکومت و طاغوتی قوتوں کے خلاف موڑ دیا۔

اگرچہ والدہ محمد علی انگریزوں سے نفرت کرتی تھیں۔ لیکن وہ جدید تعلیم کے خلاف نہیں تھیں۔ وہ ایک باشعور اور دور بیں خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمہ جہت مخالفتوں کے باوصف اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اپنے اس ارادہ کے ساتھ اس مسلمان مشرقی خاتون کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو حوصلہ شکن ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے اسکے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ عین عالم جوانی میں انکے شوہر عبدالعلی (1848ء - 1880ء) انہیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس وجہ سے چھ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہم ذمہ داریاں ان کے ناتواں کندھوں پر یکایک آن پڑیں۔ لیکن حالات کی اعصاب شکن سختیاں بی اماں کے حوصلے کا امتحان نہ بن سکیں۔ ان کا عزم صمیم مصائب کے سامنے ڈھال بن گیا۔ بقول محمد علی

> " میری ماں 27 سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ بعض ہمدردوں نے اصرار کیا کہ
> دوسری شادی کر لیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے شوہر نے میری کافی
> دیکھ بھال کی ہے اور اب میں اپنے پانچ شوہروں (لڑکوں) اور ایک بیوی (لڑکی)

کی دیکھ بھال کرونگی۔"[16]

محمد علی کے ولد عبد العلی نے کوئی بڑا اثاثہ گھر کی گزر اوقات کیلئے نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ وفات کے وقت وہ 30,000 (تیس ہزار روپے) کے مقروض تھے۔ گذارے کیلئے ایک معمولی سی جاگیر میں حصہ تھا جو ضلع مراد آباد میں واقع موضع "خانی سمار" تھی۔ جسکی سالانہ آمدنی تقریباً تین ہزار تھی، جو محمد علی کے چچا منشی اصغر علی خاں کے زیر نگرانی تھی۔[17] یہ آمدنی گھریلو ضروریات کی بمشکل کفالت کرتی تھی۔ لیکن آمدنی کا یہ ذریعہ بھی اس وقت ختم ہو گیا جب بی اماں نے اپنے بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تاکہ وہاں وہ جدید تعلیم سے روشناس ہو سکیں۔ جوں ہی چچا کو بی اماں کے ارادوں کا علم ہوا تو یہ معمولی رقم دینے سے بنابریں انکار کر دیا کہ انگریزی تعلیم سے بچے کافر ہو جائیں گے۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ چچا بچوں کی تعلیم اور ترقی کے خلاف تھے۔ وہ صرف انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کا مقصد کفر و الحاد ہے اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے انکے بھتیجے گمراہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تہہ میں انکا جذبہ خلوص پوشیدہ تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ موجودہ دور میں انگریزی تعلیم کے بغیر ترقی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ انکے برعکس بی اماں جدید تعلیم کی اہمیت وافادیت سے واقف تھیں۔ اسلئے انہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ اور انکے عزم واستقلال کے سامنے کوئی دلیل یا مخالفت کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ اگرچہ ان حالات میں محمد علی کی والدہ کیلئے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لیکن بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر انہوں نے ہر قسم کی جسمانی محنت و مشقت برداشت کی۔ حتیٰ کہ بچوں کے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کے لیے ذاتی زیورات گروی رکھ دیے۔ آخر چچا بی اماں کی ثابت قدمی کے سامنے جھک گئے۔ زیورات واپس کرا دیئے اور تعلیم کے اخراجات کی ادائیگی بھی جائیداد سے شروع کر دی۔[18] بی اماں ایک انتھک خاتون تھیں جو رکاوٹوں کو پھلانگنے والی شیرنی کی طرح اپنے بچوں کے دل و دماغ کو غلامانہ ذہنیت اور پست خیالات سے چھاتی آزادی اور عالی حوصلگی کے مراحل طے کرنے کے اسباب فراہم کرتی رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اسی عالی حوصلہ خاتون کی ابتدائی تربیت کا ثمر تھا جس نے محمد علی کو محمد علی جوہر بنا دیا۔

محمد علی کو انکی والدہ نے جسطرح خانگی و معاشی مسائل کی فراوانی کے باوجود جدید تعلیم دلوائی۔ اس نے ابتدائی عمر میں ہی محمد علی کو جدید تعلیم کا حامی بنا دیا۔ جس کا اندازہ اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے رامپور اسکول میں دورانِ تعلیم "جدید تعلیم کی ضرورت" پر لکھا۔ اور رامپور اسٹیٹ گزٹ میں انسپکٹر آف اسکول کی رپورٹ کے ساتھ شائع ہوا۔[19] محمد علی قدیم و جدید تعلیم کا موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ قدیم تعلیم جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر اور بہت سی خامیوں سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں قدیم تعلیم کی خامیاں بیان کرتے ہو تحریر کیا کہ :۔

> "ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص، ادھوری بلکہ خطرناک ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پاکر فقط قوت کو کام میں لاتے ہیں۔ فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ غور و خوض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔"[20]

محمد علی نے جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر کیا کہ :۔

> " جدید تعلیم کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں، ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے۔ جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب " نیم وحشی" انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے۔"[21]

محمد علی کا یہ مضمون انکی ذہنی و مادی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔ ایک تو انگریزی تعلیم کیلئے انکی فراخ دلی و ذہنی وسعت اور دوسرا گھریلو دینی تعلیم کے بعد ایک باقاعدہ اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے انکی تعلیمی سرگرمیوں کا حال۔ جن میں وہ بریلی ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفے میں مصروف رہے۔ محمد علی نے اپنی اس تحریر میں جدید تعلیم کی جسطرح وکالت کی ہے۔ اس سے اُنکے ذہن رسا کی داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے اسکی اہمیت کو اتنی کم عمری میں سمجھ لیا کہ اسکو کوئی معمولی واقعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس وقت انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا اس وقت تک غالبًا انہیں علی گڑھ تحریک اور اسکے رہنما کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہ ہوں۔ اسکے باوجود انکے ان خیالات پر یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہ علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان (1817ء - 1898ء) یا انکے رفقاء الطاف حسین حالی (1837ء - 1914ء) اور محسن الملک (1837ء - 1907ء) وغیرہ کے قلم کا شاہکار ہو۔ درحقیقت یہ محمد علی کے اپنے خیالات تھے۔ لیکن انکو سمجھنے کیلئے محمد علی کی عملی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ ضروری ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالصتاً مشرقی عادات و خصائل کے آدمی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی مادری زبان بولنا گناہ سمجھتے ہوں۔ انکی مستقبل کی زندگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی خود سپردگی کی وہ روش اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے بیگانگی ثابت ہو وہ جذباتی ضرور تھے لیکن اس جذباتی پن میں بگاڑ کی جائے سلجھاؤ نمایاں تھا۔

محمد علی کو کچھ عرصہ بعد رامپور اسکول سے گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی بھیج دیا گیا جو رامپور سے تقریباً چالیس میل دور تھا۔ بریلی بھیجنے کی یقیناً چند اہم وجوہات تھیں۔ اولاً محمد علی کے دو بڑے بھائی ذوالفقار علی اور شوکت علی (1872ء - 1938ء) پہلے ہی سے وہاں زیرِ تعلیم تھے، جن سے نگرانی و سرپرستی مقصود تھی۔ (ذوالفقار علی رامپور کے پہلے طالب علم تھے جنھیں تمام مخالفتوں کے باوجود والدہ نے جدید تعلیم کیلئے بریلی بھیجا تھا) ثانیاً جدید تعلیمی معیار کے اعتبار سے یہ اسکول نئے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ ثالثاً دیگر اعلیٰ خاندانوں کے بچے بسلسلہ تعلیم بورڈنگ میں رہائش پذیر تھے۔ جنکے ساتھ میل جول سے آدابِ معاشرت، تہذیب و ثقافت سے آگاہی اور روابط استوار کرنا اہم تھے۔

رامپور کے علمی وادبی اور ثقافتی ماحول نے محمد علی کے ذہنی دریچے کھولنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں بریلی کے ماحول نے محمد علی کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ اسکول میں انکی قابلیت کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ بلا کے ذہین مگر کم محنتی تھے۔ لیکن غیر معمولی ذہانت نے انکی کم محنتی کو ہمیشہ سربلند رکھا۔ درسی کتب کے مطالعہ میں دلچسپی کم مگر مباحثوں میں گرماگرم حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ مزاج میں تیزی تھی لیکن حاضر جوابی، راست گوئی ان کا خاص وصف تھا۔ اسکول میں مسلم

طلبہ کی تعداد کم ہونے کے باوجود محمد علی میں جرأت، بے باکی اور حق گوئی بدرجہ اتم موجود تھی۔ میر محفوظ علی بدایونی کا بیان ہے کہ :۔

"محمد علی بریلی میں بلا کے ذہین، مگر کم محنت تھے۔ استاد خوش تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی تھی۔"[22]

محمد علی فطری طور پر قائدانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انہوں نے عملی زندگی میں جس کا بھرپور انداز میں مظاہرہ کیا۔ قیامِ بریلی کے دوران کم عمری میں ہی انہوں نے اپنے ہم عمر طلبہ کی ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی جسکے وہ خود سیکریٹری تھے۔[23]

اگرچہ محمد علی کا خاندان معاشی پریشانیوں سے دوچار رہا۔ لیکن ہوشمند ماں نے اپنے بچوں کو ان اثرات سے محفوظ رکھا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کروانے کے بعد والدہ نے محمد علی کو علی گڑھ کالج میں داخل کروادیا (1890ء - 1898ء)۔ ہندوستان کی یہ عظیم درسگاہ جسکے بانی سید احمد خان تھے، علمی وادبی لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ جو مسلمانانِ ہند کیلئے سرمایہ عزت ووقار تھی۔ جہاں مسلمان خاندان اپنے بچوں کو تحصیلِ علم کیلئے بھیجنا باعث افتخار سمجھتے تھے۔ لیکن دوسری طرف تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک علی گڑھ کفر والحاد کا مرکز تھا۔ وہ اس سے گریزاں تھے۔ اور اسکی تخریب میں ہمہ وقت مصروف۔ یہاں رہ کر یقیناً محمد علی کی جدید تعلیم کے بارے میں قائم کردہ رائے جسکا اظہار انہوں نے اوائلِ عمر میں کیا تھا کوجلا ملی اور مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اسی درسگاہ میں انہوں نے اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں سے شاندار کامیابی حاصل کی اور نام کمایا۔ غیر معمولی ذہانت نے انہیں ہر دلعزیز بنادیا۔ کالج میں انکی عدیم النظیر ذکاوت اور نادر المثال ذہانت کی دھوم تھی۔ محمد علی میں انگریزی کی استعداد بھی قابلِ رشک تھی۔ اس بات کا اندازہ ان کی انگریزی زبان کی تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ کالج میں شعبہ انگریزی کے ہیڈ مسٹر ماریسن نے محمد علی کی انگریزی دانی کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

"محمد علی تم ایک زمانہ میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہوگے۔"[24]

اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ مسٹر ماریسن کی یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔

علی گڑھ میں محمد علی کو سجاد حیدر یلدرم (1880ء - 1940ء) اور حسرت موہانی (1875ء - 1951ء) جیسے طلبہ کی رفاقت ملی۔ جنھوں نے ادب وسیاست میں جھنڈے گاڑے۔ محمد علی بھی کسی طرح ان سے پیچھے نہ رہے۔ علی گڑھ کے شائستہ ادبی ماحول میں انکی شاعرانہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ سجاد حیدر کی معیت میں شعر وسخن کا ذوق پروان چڑھا، جسے حسرت موہانی کی صحبت نے چار چاند لگادیے۔ کالج کے مباحثوں میں محمد علی خصوصی دلچسپی لیتے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ غلط بات پر خاموش رہنا اور ناجائز کو برداشت کرنا انکی لغت میں شامل نہ تھا۔ وہ مصلحت اندیشی کو ناپسند کرتے تھے۔ انگریز حکام کا تحکمانہ لہجہ انہیں سرکشی پر آمادہ کردیتا تھا۔ جسکا پرتو بعد میں انکی عملی وسیاسی زندگی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ وہ حاکمیت کے جلال اور غیر معقول کو کبھی بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ اسلئے انگریز اساتذہ محمد علی کی قابلیت اور صلاحیتوں کے معترف ہونے کے باوجود انکے اس بے باکانہ کرداری پہلو کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ انگریز حکام واساتذہ اقتدار واختیارات کے نشے میں تعمیری تنقید کو بھی برداشت کرنے کے متحمل نہ تھے۔ محمد علی غلط کو غلط اور صحیح کو

صحیح کہنے کی جرأتِ رندانہ رکھتے تھے۔ خواہ اس سلسلے میں انہیں کیسی ہی مخالفت اور دشمنی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ انکا یہی طرز عمل بعد کی تحریک آزادی میں بھی بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم محمد علی کی انہی کرداری خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے یہاں پہنچ کر انکے (محمد علی) کردار کی خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے اقران و ہمعصروں میں سب سے علیحدہ کر دیا۔ (یعنی) محمد علی کی آزادی رائے اور آزادی عمل۔ وہ (صحیح بات پر) اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے۔ یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے۔ جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں کی چیں بہ جبیں کا باعث ہوتا تھا۔ تقریر انکی (محمد علی) زوردار، زبان شستہ اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے نہایت موثر ہوتی تھی۔"[25]

قیام علی گڑھ کے دوران جن شخصیات نے محمد علی کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان میں انکے بڑے بھائی شوکت علی، کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک (1859ء - 1899ء) اور مولانا شبلی نعمانیؒ (1857ء - 1914ء) تھے۔ جسطرح شوکت علی علی گڑھ کالج میں ایک حلقے کے لیڈر تھے، محمد علی نے نسبتاً کم عمر لڑکوں میں اپنے لئے بھی ایسا ہی مقام پیدا کر لیا تھا۔ شوکت علی طالب علموں کے رہنما تھے۔ ان کے مسائل کا حل تلاش کرتے۔ ان کے تنازعات کا فیصلہ کرتے۔ استادوں سے نوک جھوک بھی ہوتی۔ یونین کے سیکریٹری بھی رہے اور کرکٹ کے کپتان بھی۔ محمد علی غیر شعوری طور پر انکے نقش قدم پر چلتے رہے۔ انکا اپنا حلقہ، اپنی شرارتیں اور شوخیاں تھیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود علی گڑھ کالج ہی وہ سرزمین ہے جس نے محمد علی کی اسلام سے شدید رغبت بڑھائی۔ انکے دل میں جو چنگاری محصور تھی۔ اُسے مولانا شبلی نعمانیؒ نے شعلہ فساں دیا[26] جسکا اعتراف محمد علی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بڑے فخر سے کیا ہے کہ :۔

"علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں علامہ شبلیؒ کے درسِ قرآن اور "اسلام اور اسلامی زندگی" پر انکے لیکچرز نے ماضی کے تسلسل اور اسکی صحت مند روایتوں سے انھیں زندگی بھر جوڑے رکھا۔"[27]

قیام علی گڑھ کے دوران محمد علی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر خاص و عام سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ 1898ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن میں بی۔اے کا امتحان پاس کر کے صوبہ متحدہ میں اول رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔[28] مسٹر گوکھلے کی وفات پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا۔ جسمیں پنڈت مدن موہن مالوی اور سر نیدر ناتھ وغیرہ نے اپنی تقاریر میں کہا کہ مسٹر گوکھلے کا ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے 21 (اکیس) سال کی عمر میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اس پر محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ :۔

"گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے۔ انکے لئے یہ امور باعثِ فخر نہیں۔ آپکا یہ نیاز مند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں

اول آچکا ہے۔"[29]

یہ سن کر حاضرین و ناظرین حیرت زدہ رہ گئے۔

اس شاندار کامیابی نے شوکت علی کو محمد علی کے بہتر مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ قبل ازیں انہوں نے کبھی محمد علی کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد نہ صرف انہیں معترف ہونا پڑا۔ بلکہ اپنے سابقہ غیر ذمہ دارانہ رویے کی تلافی کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شوکت علی علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمہ افیون میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ علی گڑھ کالج کے دستور کے مطابق محمد علی کو کالج کی طرف سے نامزد کیا گیا کہ حکومت انہیں مجسٹریٹ بنادے یا لینڈ ریونیو کا عہدہ دے دے۔ ایسی صورت میں محمد علی کو ملازمت کے آغاز ہی میں اتنی تنخواہ مل جاتی جتنی شوکت علی کو اپنی ملازمت کے آغاز سے لیکر پندرہ سال تک بھی میسر نہ آتی۔[30] لیکن شوکت علی نے تمام معاشی پریشانیوں اور خانگی مسائل کے باوجود فیصلہ کیا کہ وہ محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرانے کیلئے انگلستان بھیجیں گے۔ انکا خیال تھا کہ محمد علی کو اعلیٰ سرکاری ملازمت کیلئے اہل بنائیں۔ تاکہ مالی پریشانیوں سے نجات مل سکے۔ دوسرا یہ کہ اپنے آپکو معاشی، سماجی اور سیاسی طور پر مستحکم کرنے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کیلئے آئی۔ سی۔ ایس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ خانگی مسائل کی موجودگی میں محمد علی کے تعلیمی مصارف کیلئے کم سے کم رقم کا انتظام کرنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ لیکن بڑے بھائی شوکت علی نے یہ معجزہ کر دکھایا اور محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرانے کیلئے لندن بھیج دیا۔ محمد علی کو بھائی کے جذبہ ایثار پر بڑا فخر تھا۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ :۔

> "ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔"[31]

محمد علی کو بغرض تعلیم لندن بھیجنے کیلئے مالی ضروریات واخراجات پورے کرنے میں شوکت علی کے علاوہ نواب اسحٰق مدار المہام ریاست رامپور نے اہم کردار ادا کیا۔ انکی بھرپور کوششوں کے نتیجے میں نواب رامپور حامد علی خاں (1875ء - 1930ء) نے وظیفہ کی منظوری دے دی۔ لیکن مشروط طور پر کہ انگلستان سے واپسی پر محمد علی اس وقت تک ریاست رامپور کی ملازمت کرتے رہیں گے جب تک وظیفے کی رقم پوری نہیں ہو جاتی۔[32]

قیام انگلستان (1898ء - 1902ء) کے آغاز ہی میں محمد علی نے ادبی و سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں کوپر فیملی، مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج، مسٹر آرنلڈ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج، مسٹر ہیمس (MR. Haymes) پرنسپل کاونٹی ہائی سکول لندن وغیرہ کے خاندان سرفہرست تھے، جنکے ساتھ محمد علی کے خوشگوار مراسم قائم ہوئے۔ انکے ساتھ ادب، فلسفہ، تاریخ اور سیاسیات کے موضوعات پر بحث وتمحیص میں اچھا وقت گذارا۔ لندن کی علمی و ادبی اور سماجی تقریبات و سرگرمیوں میں شرکت سے محمد علی کو یہاں کے لوگوں کے نظریات و خیالات، عادات و خصائل، معاشرتی ماحول اور سماجی اداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں کے منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ اس تمام عرصے میں میاں فضل حسین (1877ء - 1936ء) جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے

کیلئے پہلے سے لندن میں مقیم تھے، محمد علی کیساتھ ہوتے تھے۔ محمد علی نے لندن میں چند ماہ میاں فضل حسین کے ساتھ اسی مکان میں قیام کیا، جو مسٹر ہیمس کی ملکیت تھا۔[33]

چند ماہ لندن گذارنے کے بعد محمد علی آکسفورڈ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے حسبِ دستور ممبر آف یونیورسٹی کا امتحان پاس کرنے کے بعد لنکن کالج میں داخلہ لے لیا۔ محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں ریاضی، جغرافیہ، قانون اور نظم و نسق جیسے خشک مضامین کا مطالعہ کرنا پڑا، جنکے کے لیے میلانِ طبع مفقود تھا۔ بلکہ طبیعت پر ادب و تاریخ کا گہرا ذوق غالب تھا۔ وہ نصابی مضامین میں محنت کرنے کی جائے تاریخ، ادب، فلسفہ، سیاسیات اور لبرل ازم سے متعلق مضامین میں دلچسپی لیتے رہے۔ جو انکی افتادِ طبع کے موافق تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے گئے تھے اس میں ناکام ہو گئے۔ محمد علی کے علاوہ دیگر فیل ہونے والے انکے رفقاء میں فضل حسین، (جو انتہائی سنجیدہ اور محنتی تھے) سی۔ آر۔ داس، سر شادی لال، سر شاہ محمد سلیمانArbindo Ghoseاورmanmohan Ghose تھے۔ بعد ازاں جنہوں نے تاریخ میں بڑا اہم مقام پیدا کیا۔ اگرچہ محمد علی مطلوبہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن انہوں نے انگلستان میں رہ کر ایک آزاد قوم کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ آزادی کے مظاہر دیکھے، آزادی اور غلامی کا تجزیہ کیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں محمد علی نے اپنے غلام ملک ہندوستان اور آزاد ملک انگلستان کا موازنہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ غلامی سے نجات اور آزادی کے حصول کیلئے انسان کو کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی آئندہ زندگی اسی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقف ہوئی اور وہ آزادی کے آتش زیرپا نقیب بنے۔ اس سلسلے میں مختلف آزاد قوموں کی تاریخ دسیاست اور معاشرت کا مطالعہ محمد علی کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ بقول محمد علی

> "الغرض مجھے آکسفورڈ میں جہاں سے میں نے تاریخِ جدید میں آنرز کی ڈگری حاصل کی تھی، مجھے بہت اچھا موقع ملا کہ میں نے اپنے School کیلئے عام تاریخ کا مضمون لیا تھا۔ اس ضمن میں اپنے ہم مذہبوں کی تاریخ کے ایک حصے سے اچھی طرح واقف ہو گیا، جو مشتمل تھا اسلامی سلطنت کے آغاز اور اسکے عروج پر۔ اور اس میں شروع کی صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی آتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود میں مذہب کے بارے میں جو عہدِ قدیم کے مسلمانوں کیلئے تلوار او ڈھال دونوں تھا، آکسفورڈ میں مزید کچھ نہ پڑھ سکا۔"[34]

محمد علی کے اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ دنیاوی اور جدید علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے اندر اس کی کو وہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ بعد ازاں اس کمی کو انہوں نے اپنے زمانہ اسیری و نظر بندی میں مطالعہ قرآن و اسلامی کتب سے دور کیا۔ وہ صرف ذاتی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی و قومی سطح پر جدید علوم کے ساتھ اسلامی علوم کی ترویج چاہتے تھے۔ بعد ازاں تحریک خلافت کے دوران عدم تعاون اور ترک موالات کا آغاز ہو، تو محمد علی نے علی گڑھ کالج کی انتظامیہ سے اختلاف کرتے ہوئے الگ سے ایک ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور بحثیت شیخ الجامعہ اس کا نصاب مرتب کیا۔ جو مکمل طور پر اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ تھا۔ اس طرح محمد علی کی بے چین روح کو کچھ تسکین ملی۔ لیکن پھر سیاست کی خار دار وادی میں ایسے الجھے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو وقت ہی نہ دے سکے۔

اگرچہ محمد علی مطلوبہ مضامین میں عدم دلچسپی کی وجہ سے ناکام ہوگئے۔ لیکن اس ناکامی میں خدائے بزرگ وبرتر کی طرف سے مصلحت پوشیدہ تھی۔ کہ یہ جوہر ملت سول سروس کی نمک کی کان میں جاکر محکومی کا نمک بننے کی بجائے ملک و قوم کے کام آئے۔ اس ناکامی نے محمد علی کو سول سروس کے مابعد اثرات و نتائج سے بچالیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ واقعی ملک و قوم کیلئے گوہر نایاب ثابت ہوئے۔ محمد علی آئی۔ سی۔ ایس میں اپنی ناکامی کی وجہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

" یہ انگلستان میں موسم بہار اور نوجوان شخص کے غیر دانشمندانہ فیصلہ کے باعث ہوا۔"[35]

انگلستان کے موسم بہار سے مراد وہاں کی خوشگوار علمی وادبی شامیں، ہندوستانی ویورپین حلقہ احباب، جن میں حاکم بڑودہ کے صاحبزادے فتح سنگھ، (جنکی سفارش پر بعد میں محمد علی کو ریاست بڑودہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔) کنور جگدیش پرشاد جنکا تعلق مرادآباد کے شاہی خاندان سے تھا اور عبدالوحید خان جو جنرل اعظم خان کے عزیز تھے، یہ سب محمد علی کے آکسفورڈ میں ہم جماعت تھے۔[36] علاوہ ازیں سماجی وغیر نصابی سرگرمیاں ہیں جنکا میاں فضل حسین نے اپنی غیر مطبوعہ ڈائری میں مفصل تذکرہ کیا ہے۔ جن میں محمد علی بھرپور انداز میں دلچسپی لیتے رہے، مگر اخلاقیات کے اندر رہتے ہوئے۔ جسکا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی (1893ء - 1977ء) کو لکھتے ہیں کہ :۔

" کالج چھوڑا تو ولایت جانا پڑا۔ جہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہیں تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی ۔ تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستور عام زہد و تورع کی طرف مائل تھا۔"[37]

محمد علی کی آئی۔ سی۔ ایس میں ناکامی نے شوکت علی کے مستقبل کے تمام خواب چکنا چور کر دیئے۔ لیکن انکی والدہ نے حوصلہ نہیں ہارا۔ 1902ء میں بیٹے کو ہندوستان بلایا اور عظمت علی خان کی بیٹی امجدی بیگم (1885ء - 1947ء) سے شادی کرنے کے بعد دوبارہ اسی سال واپس انگلستان بی۔ اے آنرز کا امتحان دینے کیلئے بھیج دیا۔ محمد علی نے آکسفورڈ سے "جدید تاریخ" میں بی۔ اے کا امتحان شاندار کامیابی سے پاس کیا اور 1902ء ہی میں رامپور کے پہلے آکسفورڈ گریجویٹ کی حیثیت سے ملک واپس آئے۔[38]

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز

محمد علی جب ہندوستان واپس آئے تو ہندوؤں کی نمائندہ سیاسی جماعت کانگریس کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ملک کے سیاسی افق پر چھا گئی تھی۔ جس وقت آپ انگلستان گئے تھے کانگریس کو قائم ہوئے تقریباً ایک عشرہ سے زائد ہو چکا تھا۔ کانگریس کے قیام 1885ء سے پہلے ہندوؤں کی بہت سی تنظیمیں مثلاً برہمو سماج، پرارتھنا سماج، دیو سماج، آریہ سماج اور گئو رکھشا سبھا وغیرہ قائم ہو چکی تھیں[39] لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر حیثیت حاصل نہ تھی۔ ہندوؤں کی اس قسم کی تحریکیں اور تنظیمیں جنکا مقصد بظاہر مذہب کی اصلاح تھا۔ مگر درحقیقت ہندو قومیت کا سیاسی فروغ تھا، یکے بعد دیگرے وجود میں آرہی تھیں۔ انگریزوں کی خواہش کے مطابق ایک ریٹائرڈ انگریز آئی۔ سی۔ ایس آفیسر مسٹر اے۔ او ہیوم Hume

(1829ء -1912ء) کی تجویز پر 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوؤں کی ملک گیر سیاسی جماعت معرض وجود میں آئی۔ بقول سید حسن ریاض

"ہندوؤں کے پاس پہلے ہی سے بہت سی انجمنیں موجود تھیں مثلاً انڈین ایسوسی ایشن بمبئی ، مدراس میں مہاجن سبھا اور پونا میں سروجنک سبھا۔ ہندوؤں میں تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے، مگر سب صوبائی۔ پورے ہندوستان کی ایک انجمن کوئی نہ تھی۔"[40]

کانگریس کے قیام نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ کانگریس نے کیوں اور کن حالات میں جنم لیا۔ اس بارے میں کانگریس کے ممتاز لیڈر پٹابھی سیتارامیا تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"مسٹر ہیوم برطانوی عہدہ دار تھے۔ انکو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یکایک شورش پھیل جائے، پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت ہو جائے۔ اس پر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام قائم ہونا چاہیے جس سے برطانوی حکومت ان سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔"[41]

کانگریس سرکاری سرپرستی میں پروان چڑھی۔ بظاہر کانگریس کے اغراض و مقاصد کا تعلق تمام ہندوستانیوں سے تھا۔ اس نے "کل ہند" جماعت کا حسین نعرہ لگایا۔ اور ہندوستان کے لوگوں کو حکومت کے نظم و نسق میں حصہ دلوانے کی مہم شروع کی۔ لیکن حقیقت میں یہ صرف اور صرف ہندوؤں کی جماعت تھی۔ نمائندہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے کانگریس ملک گیر حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس حقوق کی طلبی اور تحفظ کے لیے کوئی مضبوط سیاسی پلیٹ فارم نہ تھا۔ ملک واپسی کے وقت محمد علی کے ذہن میں بھی قوم کے بارے میں کوئی سیاسی خاکہ نہ تھا۔ اس لئے تلاشِ معاش میں سرگرداں ہوئے۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن (1859ء- 1925ء) تھے۔ 1891ء میں وزیر ہند کی حیثیت میں وہ ہندوستانی معاملات کو بطریق احسن جان چکے تھے۔ سیاسی حلقوں میں انکی دانائی اور تدبر کا سکہ جما ہوا تھا۔ کرزن 1899ء سے 1905ء تک ہندوستان کے وائسرائے رہے۔ انہوں نے لارڈ ولزلی (بحیثیت گورنر جنرل 1798ء -1805ء) اور لارڈ ڈلہوزی (بحیثیت گورنر جنرل 1848ء -1856ء) کی حکمت عملی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اس نے والیانِ ریاست کو سلطنت کا رکن ٹھہراتے ہوئے ایک "امپیریل کیڈٹ کور" بنائی جسمیں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے بیٹوں کو فوجی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ جسکے کل اخراجات ریاستوں کے ذمے تھے۔ اگرچہ اس پر والیان ریاست نے ناراضگی کا اظہار کیا مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔ جنگ عظیم کے دوران لارڈ کرزن کا یہ کام حکومت برطانیہ کیلئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ مالگزاری کے انتظام میں خرابیوں کے خاتمے کیلئے 1900ء میں قانون انتقالِ اراضی نافذ کیا۔ زمینداروں کی زمین گراں قدر سود در سود کی وجہ سے ساہوکاروں کے قبضہ میں جارہی تھیں۔ اس قانون نے زمینداروں کو بے زمین ہونے سے بچالیا۔ اس کے ساتھ ہی سود در سود سے چھٹکارے کیلئے زمیندارہ بنک یعنی کواپریٹو کریڈٹ سوسائیٹیاں قائم کیں اور زراعتی کالج بھی قائم کئے۔

لارڈ کرزن نے تعلیم کو اعلیٰ و جدید معیار کے مطابق ڈھالنے کیلئے یونیورسٹی ایکٹ پاس کیا۔ جسکی رو سے

یونیورسٹیوں کا کام امتحان لینے کے علاوہ تحقیقات و سائنس کی تعلیم دینا بھی تھا۔ مگر ہندوستانیوں نے سمجھا کہ اس ایکٹ کا مقصد تعلیم کو محدود کرنا ہے۔ لہذا تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اسکی پر زور مخالفت کی۔ محمد علی جو جدید تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سے واقف تھے۔ انہوں نے تعلیمی اصلاحات پر اطمنان کا اظہار کیا۔ کرزن کی تعلیمی اصلاحات پر محمد علی کا اطمنان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تعلیم کو قومی اہمیت دیتے تھے۔ لارڈ کرزن نے "تحفظ آثار قدیمہ" کا قانون بھی پاس کیا۔ جس کے تحت محکمہ آثار قدیمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس محکمہ نے نہ صرف پرانی یادگاروں کو منہدم ہونے سے بچایا۔ بلکہ بہت سی پرانی آبادیاں جو انقلابِ زمانہ سے زمین کے نیچے دب چکی تھیں انکو کھود کھود کر نکالا۔ موریا خاندان کے محلات کے کھنڈرات، ٹیکسلا میں بدھ کے زمانے کی تاریخی عمارتیں، ہڑپہ ضلع ساہیوال میں سندھ کی قدیم تہذیب کے نشانات اسی محکمہ کی کوششوں کا ثمر ہیں۔ لارڈ کرزن نے شمال مغربی سرحد پر چوکیاں بنائیں اور ان چوکیوں کی حفاظت کیلئے پٹھانوں کی ملیشیا فوج بھرتی کی۔ مشہور سرحدی مقامات کو ہندوستانی چھاؤنیوں سے بذریعہ ریل اور سڑکیں ملادیا۔ اسکے علاوہ دریائے سندھ کے پار علاقے کو 1901ء میں پنجاب سے الگ کر کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ بنادیا۔ جسکی نگرانی چیف کمشنر کے سپرد کر دی۔ لیکن عام طبقے نے اس سے یہ تاثر لیا کہ اس صوبے کا مقصد پنجاب اور سرحد کے باہمی اتحاد کو ختم کرنا ہے۔ اگر تنقید برائے تنقید کی جائے غیر جانبداری سے لارڈ کرزن کے ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے تو یہ اقدامات یقیناً انتظامی مسائل کے حل اور عوامی فلاح کیلئے تھے۔ برار کا علاقہ جو 1853ء میں نظام حیدرآباد نے انگریزوں کو امدادی فوج کے اخراجات پورے کرنے کیلئے عارضی طور پر دیا تھا۔ لارڈ کرزن نے اپنے عہد میں اس کو مستقلاً پٹہ پر حکومت برطانیہ کے قبضہ میں لے لیا۔[42]

لارڈ کرزن نے داخلہ پالیسی کے علاوہ خارجہ پالیسی کی طرف بھی توجہ دی۔ 1901ء میں عبدالرحمٰن خان والئی افغانستان کی وفات پر اسکا بڑا بیٹا حبیب اللہ خان امیر بنا تو انگریز حکومت نے اس کو امیر تسلیم کرتے ہوئے اسکے ساتھ معاہدہ کیا۔ جسکی رو سے والئی افغانستان کو امیر کی جائے شاہ کا خطاب دیا گیا۔ تبت حکومتِ چین کا ماتحت صوبہ تھا مگر اسکا حکمران خود مختار تھا۔ تبت میں روس بغرض تجارت آیا اور آہستہ آہستہ اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا۔ کرزن کی دوربین نگاہوں نے پاک و ہند کے مستقبل کے خطرے کو بھانپ کر حاکم تبت دلائی لامہ سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہی۔ مگر اس نے چنداں پرواہ نہ کی۔ لہذا لارڈ کرزن نے 1904ء میں ہندوستان سے ایک لشکر بھیجا جو تبت کے دارالحکومت لاسہ تک جا پہنچا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دلائی لامہ کو برطرف کر کے نیا لاسہ کو حکمران مقرر کر دیا۔ جس نے انگریز ریذیڈنٹ رکھنا منظور کیا اور چمپا وادی 75 سال تک کیلئے انگریزوں کے حوالے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تبت سے روسی اقتدار کا امکان تک ختم ہو گیا۔[43] لارڈ کرزن کی خارجہ پالیسی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اسکو بیرونی ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ واقعی صحیح ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے۔ اور پھر طاقت و اقتدار بھی پاس ہو تو دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا قدرتی امر ہے۔

لارڈ کرزن نے 1905ء میں انتظامی ضروریات کے تحت بنگال کے مشرقی حصے کو آسام کمشنری سے ملا کر ایک نیا صوبہ مشرقی بنگال و آسام بنادیا۔ جسکا پایۂ تخت ڈھاکہ بنا۔ لیکن بنگالی ہندوؤں نے لارڈ کرزن کے اس اقدام کو سیاسی چال قرار دیا۔ محمد علی جو لارڈ کرزن کی اصلاحات اور ملک کے اندر نئے نئے اقدامات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تقسیم

بنگال کے سلسلے میں انہوں نے لارڈ کرزن کی مخالفت کی۔ انکے نزدیک کرزن کا یہ اقدام ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ جس پر محمد علی نے کھل کر تنقید بھی کی۔ کرزن نے ملکی امن وامان کی بحالی کیلئے پولیس اصلاحات نافذ کیں۔ انکی سابق تنخواہوں میں اضافہ کر کے انکی شکایات کو دور کیا۔ انکی تربیت کیلئے پولیس کمیشن کا تقرر کیا۔ مالی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ انکم ٹیکس پانچ سو روپے سالانہ آمدنی کی بجائے ایک ہزار روپے سالانہ آمدنی پر لاگو کیا۔ نمک کے محصول میں نصف کے قریب کمی کر دی۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل کی زیر نگرانی صنعت و حرفت کی ترقی کیلئے محکمہ قائم کیا۔ ریلوں اور نہروں کی اصلاحات کیلئے کمیشن مقرر کیئے۔

یہ وہ دور تھا جب محمد علی ریاست بڑودہ میں ملازم تھے۔ وہ ترقی پسند تھے۔ لہذا ترقی پسندانہ اور ملکی استحکام وخوشحالی سے متعلق اقدامات کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس لیے وہ کرزن کی اصلاحات سے مطمئن تھے۔ اور انہیں ترقی و خوشحالی کے ضمن میں بہتر پیش رفت سمجھتے تھے۔ کرزن کے عہدہ کی معیاد 1904ء میں ختم ہونے والی تھی۔ مگر بہتر کارکردگی اور اصلاحات کی بنا پر انہیں مزید دو سال اسی عہدے پر مامور رہنے دیا گیا۔ اس زمانے میں کمانڈر انچیف مکمل با اختیار نہیں تھا اس کا فیصلہ بہ عمل وائسرائے اور اسکی انتظامی کونسل کے ماتحت تھا۔ دریں اثناء لارڈ کرزن اور لارڈ کچنر کمانڈر انچیف میں ٹھن گی۔ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ وزیر ہند کو مداخلت کرنا پڑی اور اس نے فوجی اصلاحات کا کلی اختیار کمانڈر انچیف کو دے دیا۔ جو کرزن کی ناراضگی میں اضافے کا باعث بنا۔ اور بالآخر انہوں نے 1905ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔[44]

جب محمد علی ہندوستان آئے تو حالات معمول کے مطابق تھے۔ کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ کرزن کے اقدامات واصلاحات کی وجہ سے صورتحال اطمینان بخش تھی۔ دوسری طرف کانگریس کی روش بھی اعتدال پسندانہ تھی۔ محمد علی میدان سیاست میں قدم رکھنے کی بجائے روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ کیونکہ خانگی و معاشی مسائل سے نمٹنے کیلئے بہتر ملازمت کا حصول از حد ضروری تھا۔ محمد علی علی گڑھ کالج میں پڑھانے کی شدید خواہش رکھتے تھے جس سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور ماریسن تھے۔ جو محمد علی کی انگریزی قابلیت ولیاقت اور صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لیکن وہ محمد علی جیسے جرأت مند، حق گو، بے باک اور ناقدانہ صلاحیتوں کے حامل شخص کو بطور استاد علی گڑھ کالج میں قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی محمد علی کی بے باکی کے بارے میں مسٹر ماریسن کی رائے کوئی اچھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو ہندوستانی سٹاف کے مقابلے میں یورپین سٹاف کو نوازنے اور انہیں لامحدود اختیارات دینے کی پالیسی پر گامزن تھے۔ مسٹر ماریسن جیسے سیاہ وسفید کے مالک شخص کو جو کہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں بھی اتنا ہی با اختیار تھا جتنا کہ تعلیمی امور میں۔ انہیں بھلا محمد علی جیسا شخص کیسے پسند آسکتا تھا جو لامحدود اختیارات اور غلط پالیسیوں پر کڑی تنقید کرنے والا ہو۔ حالانکہ علی گڑھ کالج کے آنریری سیکریڑی نواب محسن الملک (1837ء - 1907ء) جو محمد علی کی قابلیت وصلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، خواہش مند تھے کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ وہ محمد علی کی ملازمت کے لیے دی ہوئی درخواست کے حامی ہوئے۔ مگر نواب محسن الملک کی حمایت اور رضامندی کے باوجود مسٹر ماریسن نے محمد علی کی درخواست مسترد کر دی۔ بقول ایس۔ ایم۔ اکرام

"لیکن وہ ذہنیت جو انگلش سٹاف اس درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا محمد علی میں موجود نہ تھی۔ اسلیئے ماریسن صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوگئی۔"[45]

مسٹر تھیوڈور ماریسن جو علی گڑھ کالج میں سینئر پروفیسر تھے۔ ستمبر 1899ء میں مسٹر بیک کے انتقال کے بعد کالج کے پرنسپل بنے۔ سرسید انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ طلباء پر انکا خاص اثر تھا۔ باہمی نزاعات سے وہ اپنے آپکو یکسر الگ رکھتے تھے۔ لیکن اردو ہندی تنازعہ کے سلسلے میں سر انٹونی میکڈانل نے انہیں حکومت اور سیکرٹری کے درمیان ذریعہ بنا کر انکا درجہ سیکرٹری سے بالاتر کردیا۔ اور پھر لارڈ کرزن کی خاص عنائتوں نے امپریل لیجسلیٹیو کونسل کا عارضی ممبر نامزد کر کے متقدم جانشینوں کے مقابلے میں انکا وقار و اقتدار مزید مستحکم کردیا تھا۔[46] یہ اسی اقتدار و اثر کا نتیجہ تھا کہ مسٹر ماریسن کے ذہن میں یہ بات پختہ ہوگئی تھی کہ آنریری سیکرٹری نواب محسن الملک سٹاف پر اثرانداز نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی انکی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اسلیئے انکی خواہش کے باوجود مسٹر ماریسن نے محمد علی کی ملازمت کے سلسلے میں دی گئی درخواست کو مسترد کر دیا۔ مسٹر ماریسن علی گڑھ کالج اور ملکی سیاسی فضا پر مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے اور اپنی من مانی کاروائیوں سے مسلمانوں کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ کالج پرنسپل اور انگریز سٹاف کی مسلمانوں کے تعلیمی و سیاسی معاملات میں مداخلت اور اکھاڑ پچھاڑ سے محمد علی کے دل میں جو نفرت پیدا ہوگئی تھی، مسٹر ماریسن کے جانبدارانہ رویے سے مزید جاگزیں ہوگئی۔ اور کالج کے معاملات میں انکی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کالج کی ملازمت سے الگ رہ کر قدرت نے محمد علی کو آزادانہ اور بے باکانہ تعمیری تنقید کا موقع فراہم کردیا۔ شاید ملازمت کی حدود و قیود اور قواعد و ضوابط میں وہ ایسا نہ کر سکتے۔ جو انہوں نے آئندہ وقتوں میں کیا۔

محمد علی کا طبعی میلان درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے شعبوں میں زیادہ تھا۔ وہ قابلیت کے اس معیار پر پورا بھی اترتے تھے۔ جو ایک اچھے استاد کا گوہر سمجھی جاتی ہے۔ سوالئی رامپور نواب حامد علی خان نے انہیں ریاست میں چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر کردیا۔ ساتھ ہی رامپور ہائی اسکول کی پرنسپل شپ کے فرائض بھی سونپ دیئے۔[47] زمانہ طالب علمی ہی سے محمد علی کو اس چیز کا شدید احساس تھا کہ مدارس میں مذہبی تعلیم کا کوئی صحیح بندوبست نہیں ہے۔ وہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ خود بھی اس چیز کا اعتراف کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ و جدید تعلیم و تربیت کے باوجود مذہبی تعلیم سے محروم رہے۔ بقول محمد علی

"ہمیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اس ساری اخلاقی اور روحانی تربیت کے ہوتے ہوئے بھی، جو ہم نے اپنی والدہ سے حاصل کی خواہ عملی لحاظ سے اسکی اہمیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ ہم دین اسلام اور تاریخ اسلام کے تفصیلی علم سے بالکل کورے رہے۔ اور اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ہم ایک ایسے اسکول میں بھیجے گئے۔ جہاں ہمیں یورپ کی نئی خدا ناشناس تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ جہاں اللہ، اسکے رسول ﷺ اور قرانِ مجید کا ذکر تک نہ ہوتا تھا۔"[48]

آکسفورڈ میں بھی محمد علی مذہب سے بیگانہ نہ رہے۔ انہوں نے ہندوستان سے اپنے مطالعہ کیلئے قرانِ مجید منگوایا۔ جسکا باقاعدگی

کے ساتھ نہ سہی لیکن مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ قرآن فہمی سے ناواقفیت پر وہ اکثر بعد میں تاسف کا اظہار کرتے کہ :۔

" مجھے یہاں نہایت ندامت کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ وہ ایک کتاب جسکا مجھے سب سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہئے تھا۔ اسے میں اتنا نہ پڑھ سکا، جتنا مجھے اسکو پڑھنا چاہیے تھا۔ اور گو میں نے بظاہر اس وقت اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ لیکن جیسا کہ بعد میں مجھے اسکا احساس ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت تک میں نے اپنی تعلیم شروع بھی نہ کی تھی۔" [49]

ان نظریات وخیالات کے حامل محمد علی کو جب بحیثیت ایجوکیشن آفیسر رامپور میں ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر تعلیمی اصلاحات نافذ کیں۔ ہندو اور مسلم طلبہ کے الگ مذاہب کے پیشِ نظر انکے لئے مذہبی عبادات کی بجاآوری کا علیحدہ انتظام کیا۔ محمد علی چاہتے تھے کہ وہ تعلیمی میدان میں قدیم وجدید کا حسین امتزاج پیدا کردیں۔ جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ مذہبی وبنیادی تعلیم کے تمام پہلوؤں پر محیط ہو۔ لیکن یہاں محمد علی یہ بات بھول گئے کہ جاگیردارانہ نظام میں اپنی پسند و ناپسند کی بجائے ہر کام محدود دائرے میں رہتے ہوئے حکامِ وقت کی آشیرباد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نواب حامد علی خان جو روائتی حکمران تھے۔ اس قسم کی اصلاحات کے حق میں نہ تھے۔ کیونکہ وہ اپنی ریاست میں کوئی بھی ایسا اقدام نہیں چاہتے تھے جس سے انگریز حکومت کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔ نواب صاحب کا ریاستی اقتدار و حکمرانی انگریز کے اشارۂ ابرو کا مرہونِ منت تھا۔ محمد علی کی ان تعلیمی اصلاحات میں اسلامی اور بین الملی جذبہ کار فرما تھا، جسکے انگریز شاکی تھے۔ لہذا نواب صاحب نے محمد علی کی ان مخلصانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مخالفین نے جو محمد علی کی روز افزوں ترقی اور عروج سے نالاں تھے فائدہ اٹھایا۔ جوڑ توڑ اور ریشہ دوانیاں جو کہ ریاستی نظام کا خاصا ہیں، اسپر عمل کرتے ہوئے محمد علی پر سازش کا الزام لگایا، [50] کہ زمانہ آکسفورڈ میں محمد علی نے ناصر علی خان جو نواب حامد علی خان کے برادر خورد تھے، ان سے عہد و پیمان کیا تھا کہ وہ نواب (حامد علی خان صاحب) کو اقتدار سے ہٹا کر انہیں (ناصر علی خان) رامپور کا فرمانروا بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس الزام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ محمد علی کے پاس اس وقت ایسا کونسا اختیار، طاقت یا عہدہ تھا جسکو کام میں لاتے ہوئے وہ ایسا کرتے۔ اگرچہ دولت میں طاقت ہے انکے پاس تو وہ بھی نہیں تھی جس پر انہیں گھمنڈ ہوتا۔ لیکن سازش رنگ لائی۔ نواب صاحب محمد علی سے بدظن ہوگئے اور قصداً انہیں ہر سرکاری وغیر سرکاری تقریب سے الگ رکھا جانے لگا۔ حتیٰ کہ اختیارات کا دائرہ بھی محدود کر دیا گیا۔ یہ چیز محمد علی جیسے خوددار اور آزاد منش شخص کیلئے باعث اذیت تھی کہ انکی ایمانداری، قابلیت، بے غرض اور انتھک محنت کو منفی رنگ دیا جارہا ہے۔ اور پھر محمد علی جیسے نظریاتی اور متحرک شخص ریاستی پابندیوں میں جکڑ کر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک سال بعد ہی رامپور کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ [51]

محمد علی کے زمانہ آکسفورڈ سے کنور فتح سنگھ ولی عہد بڑودہ کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے والد مہاراجہ بڑودہ سیایاجی راؤ گیکوارڈ کو محمد علی کی صلاحیتوں اور قابلیت سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ کنور فتح سنگھ کی کوشش اور تحریک سے محمد علی کو ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون کے اعلیٰ آفیسر یعنی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ دے دیا گیا۔ رامپور کی

نسبت بڑودہ کے حالات حوصلہ افزاء تھے۔ جہاں محمد علی نے سات سال تک اپنے فرائض نہایت دیانت، مستعدی اور راست بازی سے سرانجام دیئے۔ ریاست کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ کروایا۔ مہاراجہ بڑودہ نے انکی کارپردازی سے خوش ہو کر انہیں ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا۔ بحیثیت کمشنر محمد علی نے متعدد اصلاحات نافذ کیں اور خصوصاً گراں قیمت پر زمین کی خریداری سے متعلق غریب طبقے پر ظلم کا خاتمہ کرادیا۔ کمشنری کے بعد ولی عہد کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ ہو گئے۔ آپکے اخلاقِ جمیلہ اور اوصاف حمیدہ نے ریاست کے تمام باشندوں کو آپکا گرویدہ بنادیا۔ آپکی دیانت کا یہ عالم تھا کہ رشوت تو درکنار نذرانہ بھی نہ لیتے تھے۔[52]

دوران ملازمت بڑودہ محمد علی، علی گڑھ کالج کی تعمیر و ترقی میں برابر دلچسپی لیتے رہے۔ انکی خواہش تھی کہ یہ ادارہ جلد از جلد ترقی کر کے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرے۔ 1904ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا تو محمد علی نے کانفرنس میں مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت اور قیام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔[53] انہوں نے حقیقی اور تعصب سے پاک تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے دلائل سے واضح کیا کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جارہی ہے وہ تعمیر کی بجائے تخریب کا سبب بن رہی ہے۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل نصف گریجوئیٹس تو فرقہ وارانہ مسئلے اور سوچ میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کر دیتے ہیں۔ بجائے اسکے کہ انہیں وطن سے محبت، رواداری اور دوسرے کے مذاہب کے احترام کا درس دیا جائے۔ انہیں عقائد کی بحث میں الجھا کر ہم وطنوں سے منافرت و عداوت کی تعلیم دی جاتی ہے جو ملک کیلئے سُم قاتل ہے۔[54]

تقسیمِ بنگال 1905ء

گیکوارڈ بڑودہ آزاد خیال اور ترقی پسند انسان تھے۔ اسی وجہ سے محمد علی کو بڑودہ سول سروس کے دوران آزادی اظہار کی اجازت تھی۔ لیکن رامپور میں وہ اس بنیادی حق سے محروم تھے۔ ابھی تک محمد علی ملازمت کی بندشوں کی وجہ سے عملی طور پر میدان سیاست میں نہیں آئے تھے۔ لیکن انکے اندر ملک و قوم کی خدمت اور حقوق کی طلبی کا جذبہ موجزن تھا۔ جسکا اظہار وہ وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں میں کرتے رہتے تھے۔[55] 1905ء میں حکومت نے جن بنیادوں پر بنگال کو تقسیم کیا، محمد علی اسکے خلاف تھے۔ اگرچہ تقسیم بنگال کی ظاہری اور اصولی وجہ تو انتظامی مسائل تھے۔ بنگال ایک وسیع و عریض صوبہ تھا۔ جس میں بہار، اڑیسہ اور آسام شامل تھے۔ تقریباً ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل رقبہ کا صوبہ جو سات کروڑ اسی لاکھ کی آبادی پر مشتمل تھا، جس کا بہتر طور پر نظام چلانا ایک لیفٹیننٹ گورنر کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن محمد علی کے نزدیک دوسری حقیقی اور سیاسی وجہ لارڈ کرزن کا بنگال کو تقسیم کر کے ہندوؤں سے انتقام لینا اور ہندو مسلم طبقات کو آپس میں مزید تقسیم کرنا تھا۔ جسکا اظہار لارڈ کرزن کے ان خطوط سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے اس وقت کے سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مسٹر ہملٹن کو لکھے تھے۔[56]

محمد علی شروع میں تقسیم بنگال کے مخالفین میں سے تھے۔ دراصل وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے جسکے حصول کے لیے انہوں نے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا حتیٰ کے اس کوشش میں دوستوں کو بھی دشمن بنالیا۔ محمد علی

کے لیے یہ چیز باعث اذیت تھی کے حکومت وقت نے بنگال کی من پسند تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع اور مظبوط کر دیا ہے۔ انہوں نے کرزن کے اس اقدام پر نکتہ چینی کی کہ انہوں نے ہندوؤں سے انتقام لینے کیلئے مسلمان کو آلہ کار بنایا۔[57] ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات ذات پات، مذہب، زمینداری اور کاشتکاری کے فرق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متحدہ بنگال کو اپنی منشا کے مطابق تقسیم کر دیا ہے۔ بقول محمد علی

"---- ایک تو ذات پات کا فرق، دوسرے مذاہب کا، تیسرے زمینداری کا اور کاشتکاری کا، یہ تین طرح کے فرق مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ہنودِ بنگال سے بیگانہ کرنے کیلئے کافی ہو سکتے تھے۔ اور لارڈ کرزن نے اس تفریق سے فائدہ اٹھا کر بنگال کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک مشرقی بنگال جسکو ایک خاصا بڑا صوبہ بنانے کیلئے آسام کے صوبے کو بھی اس میں شامل کر دیا تھا اور دوسرا مغربی بنگال جس میں بہار اور اڑیسہ کو شامل کر دیا تھا۔"[58]

محمد علی نے تقسیم بنگال کو اس vivisection سے مشابہ قرار دیا۔ جو یورپ کے ڈاکٹر جیتے جاگتے حیوانوں کو زخم لگا کر انکی تکلیف کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے عمل میں لاتے ہیں۔ کیونکہ تقسیم پر بنگال کے ہندو اور کانگریس تک چیخ پڑے۔ کانگریس میں اس وقت تک تقریباً ہندو ہی تھے۔ محمد علی کا استدلال تھا کہ تقسیم انتظامی نقطۂ نظر سے واقعی ناگزیر تھی۔ جسکا مسلمانوں کو یقیناً فائدہ بھی ہوا۔ اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوئے۔ لیکن انہیں طریقہ کار اور حقیقی غرض و غایت پر اعتراض تھا۔ جسکا اندازہ محمد علی کی درج ذیل تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔ بقول محمد علی

"---اگر لارڈ کرزن صوبہ بہار اور اڑیسہ کو صوبہ بنگال سے الگ کر دیتے اور صوبہ آسام کو اسی طرح ایک علیحدہ صوبہ رہنے دیتے تب بھی بنگال کے ہندو ضرور غوغا کرتے۔ لیکن اس کے باعث وہ ہندو مسلم مناقشات رونما نہ ہوتے۔ جو اکتوبر 1905ء کے بعد مشرقی بنگال میں رونما ہوئے۔ اور نہ کانگریسی سیاست میں وہ حرارت پیدا ہوتی۔ جو لارڈ کرزن کے اس فعل (تقسیم بنگال) سے پیدا ہوئی۔ مگر لارڈ کرزن کو تو بنگال کے ہنود سے کلکتے کے روزانہ کے اخبارات کے آئے دن کے اعتراضوں کا بدلہ لینا تھا۔"[59]

اگرچہ بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے مطالبے پر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سے انہیں ایک اکثریتی صوبہ مل گیا تھا۔ انہیں ہندوؤں کے سیاسی و اقتصادی شکنجوں سے نجات مل رہی تھی۔ تقسیم سے مسلمانوں کو تعلیم اور صوبے کے نظم و نسق میں پہلے سے کہیں زیادہ حصہ ملنے کی توقع تھی۔ خود مختار اداروں کی انتظامیہ پر وہ غالب رہ سکتے تھے۔ نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ (1884ء - 1915ء) نے اس تقسیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"اس تقسیم نے ہماری بے عملی رفع کر دی ہے۔ اور ہمیں مسلسل جدو جہد کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔"[60]

لیکن ہندوؤں کیلئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ اسلیئے

انہوں نے تمام جمہوری و اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تقسیم کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے تقسیم بنگال کو متحدہ قومیت کے حق میں ضرب کاری اور پہلے سے سوچی سمجھی ایک نا معقول سکیم قرار دیا۔ بقول سریندر ناتھ بینرجی

> "ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری توہین کی گئی ہے۔ ہمیں ذلیل کیا گیا ہے۔ اور فریب سے کام لیا گیا ہے۔ ہم نے یوں محسوس کیا ہے جیسے ہمارا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اور بنگالی زبان بولنے والوں کے پندار اور انکے بڑھتے ہوئے اتحاد کو ضرب لگائی ہے۔"[61]

حتیٰ کہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کرتے ہوئے اس کی تنسیخ کے لئے چھ نکاتی پروگرام مرتب کیا۔[62] ہندوؤں کی تقسیم بنگال کے بارے میں مخالفت کی وجوہات اچھوت لیڈر ڈاکٹر امید کر نے ان الفاظ میں بیان کی ہیں :-

> "بنگالی ہندوؤں نے پورے بنگال، آڑیسہ اور آسام حتیٰ کہ یوپی تک کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا۔ بنگال کی تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ انکی چراگاہ کا رقبہ گھٹ جائے گا۔ بنگال کے ہندوؤں کی طرف سے تقسیم کی مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو انکا حقیقی مقام ملے۔"[63]

1911ء میں مسٹر فریزر Mr. Fraser نے اپنی کتاب "India Undar Curzan and After" میں ہندوؤں کی کم و بیش انہی وجوہات کا ذکر کیا ہے جو تقسیم کے بارے میں مخالفت کا باعث بنیں۔[64]

محمد علی نے تقسیم بنگال کے بارے میں لارڈ کرزن پر جو اعتراض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آیا وہ انتظامی مسائل جنکی بنیاد پر بنگال کو تقسیم کیا گیا تھا، 1911ء میں حل ہو گئے تھے کہ تقسیم کو منسوخ کر دیا گیا؟ اور انگریز حکومت تقسیم کو "طے شدہ حقیقت" قرار دینے کے باجود اپنے وعدے سے پھر گئی۔ دراصل انکا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک طرف انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت و اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ دوسرا انگریز حکومت نہیں چاہتی تھی کہ مسلمان من حیث القوم خود مختاری و ترقی حاصل کریں۔

محمد علی اور شملہ وفد 1906ء

تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے پروپیگنڈہ نے مسلمانوں کو بھی سیاسی بنیادوں پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ نواب سلیم اللہ خان اور انکے رفقاء کار نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سربلندی، ہنود کی سازشوں سے باخبری، مخالفانہ حملوں کے دفاع اور دشمن پروپیگنڈہ کا جواب دینے کے ملیے علیحدہ مسلم تنظیم کی اشد ضرورت ہے۔ لہذا مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی اور معاشی امور میں ترجمانی کیلئے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ جسکا نام "محمڈن پراونیشنل یونین" (1905ء) رکھا گیا۔[65] سید امیر علی (1849ء - 1928ء) جو سرسید احمد خان کی غیر سیاسی روش کے خلاف تھے، انکی قائم کردہ سیاسی تنظیم "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" نے بھی مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کی۔[66]

ابتداً سید احمد خان مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے حق میں نہ تھے۔ انکا خیال تھا کہ پہلے مسلمان تعلیم حاصل کریں پھر میدان سیاست میں آئیں۔ خود انہوں نے "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" (1886ء) کے پلیٹ فارم سے تمام قومی معاملات میں اظہار خیال کیا۔[67] مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ، ہندی کے خلاف اردو کے دفاع کی کوششیں کیں اور کانگریس کے متعصبانہ وہندوانہ کردار پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے طریق انتخاب کے ذریعے قائم ہونے والی برطانوی طرز کی پارلیمنٹ کے مسلمانوں پر اثرات، انکاسدباب، طریقۂ انتخاب کامسئلہ، غرضیکہ ہر قومی وسیاسی معاملے میں قوم کی رہنمائی کی۔ بوقت ضرورت "اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن" جیسی تنظیمیں بھی قائم کیں۔[68] محسن الملک نے بمقام کلکتہ 1901ء میں "محمڈن پولیٹکل آرگنائزیشن" قائم کی تھی۔[69] لیکن ملکی حالات اب اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ یہ تنظیمیں ناکافی تھیں۔ مسلمانوں کو سیاسی میدان میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے ایک موثر سیاسی جماعت کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بقول سید حسن ریاض

> "مسلمان دیکھ رہے تھے کہ وہ لاکھ سیاست سے الگ رہے۔ مگر سیاست نے انکا پیچھا نہ چھوڑا۔ ملک کی ہر تحریک اور حکومت کا ہر اقدام ان پر اسی طرح اثرانداز ہوتا ہے۔ جسطرح زمین کی چیزوں پر بارش، دھوپ اور ہوا، مگر مسلمانوں کے حق میں ضرر کے ساتھ۔"[70]

تقسیم بنگال کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ انگلستان کی قدامت پسند پارٹی کو انتخابات میں شکست ہوئی اور لبرل پارٹی برسراقتدار آگئی۔ لارڈ مارلے (1838ء - 1923ء) جو ایک آزاد خیال اور فراخ دل سیاستدان تھے، وزیر ہند مقرر ہوئے۔ لبرل پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد انہوں تقسیم بنگال سے پیدا شدہ شورش کو شدت سے محسوس کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ ہندوستان کو کچھ مراعات دے دی جائیں تاکہ ملکی حالات بہتر ہوں۔ تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کا بے جا احتجاج اور حکومت کا یہ اعلان کہ وہ ہندوستان میں نئی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت پر غور کر رہی ہے، سنکر نواب محسن الملک سمیت دیگر رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔ آخر غور وخوض کے بعد مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد تشکیل دیا گیا۔ جو تقریباً 35 ارکان پر مشتمل تھا۔ جسکے تمام ارکین غیر سرکاری تھے محمد علی اس وفد میں شامل نہیں تھے کیوں کہ وہ ریاستی اور سرکاری ملازم تھے۔ یہ وفد سر آغا خان (1877ء - 1973ء) کی سربراہی میں یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ کے مقام پر وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا اور اپنے مطالبات پیش کئے۔[71] جن میں متناسب نمائندگی کے اصول پر طریقہ انتخاب، مسلمانوں کی تاریخی و سیاسی اہمیت، سرکاری گزیٹڈ و نان گزیٹڈ ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کا تقرر، ملک کی اعلیٰ وکلیدی آسامیوں میں مسلمانوں کا حصہ، ہائی کورٹ وچیف کورٹ کے جج اور ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی حیثیت سے مسلمانوں کا تقرر، مسلم یونیورسٹی کے قیام کیلئے امداد کا مطالبہ، اور مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی تشخص کی بقاء و تحفظ کے مطالبات شامل تھے۔[72]

اگرچہ وائسرائے نے کوئی حتمی جواب تو نہ دیا لیکن وفد کے مطالبات اور مؤقف سے اصولی اتفاق ضرور کیا۔ وائسرائے نے میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے انتخاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ آپکے سپاس نامے کا ماحصل ہے کہ الیکشن کے ہر طرز عمل میں خواہ اسکا اثر میونسپل بورڈ پر ہو، ڈسٹرکٹ بورڈ ہو یا مجلس قانون ساز پر، جس میں بھی انتخابی نظام داخل کرنے کی تجویز ہو، یا اس میں کسی اضافے کی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت ایک الیکشن پارٹی کی حیثیت سے ہونی چاہیے۔ میں اس میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔"[73]

لارڈ منٹو کے یہ الفاظ کہ انتخابی کاروائیوں میں مسلمانوں کی شرکت محض انفرادی نوعیت کی نہیں بلکہ جماعتی نوعیت کی ہونی چاہئے، ایک معنی خیز بات تھی۔ انکی اس بات سے بھی مسلمانوں کو فوری ایک سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

محمد علی ریاستی ملازمت د مصروفیات کے باوجود نا صرف ملکی امور سیاست اور حالات وواقعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر سیاسی قائدین کے ساتھ انکا رابطہ رہتا تھا۔ شملہ وفد کی ترتیب و تیاری اور وائسرائے سے ملاقات کیلئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا محمد علی اس سے ناخوش تھے۔ انہوں نے اسے "تعمیل حکم" قرار دیا تھا۔ لیکن وفد نے جو مطالبات پیش کئے ان سے متفق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی متحرک ہوں اور حقوق کی طلبی و تحفظ کیلئے میدان عمل میں آئیں۔ گو اس وقت تو محمد علی نے شملہ وفد کے بارے میں کوئی تحریری بیان وغیرہ نہ دیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنی تحریروں میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"چنانچہ اکتوبر 1906ء میں مسلمانوں کا مشہور وفد شملہ کی چوٹیوں پر بلایا گیا۔ گو القاء حکومت کی طرف سے ہوا تھا۔ لیکن اب مسلمان خود بھی اتنی تعلیم پا چکے تھے کہ حقوق طلب کر سکیں۔ اور انہوں نے جن حقوق کا مطالبہ کیا وہ یقیناً انکا حق تھا۔"[74]

محمد علی نے واضح کیا کہ مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ، مسلمانوں اور ہندوؤں کے اندر پیدا شدہ تفریق کو دیکھنے کے بعد کیا۔ جس سے مسلمانوں میں سیاسی احساس اور حقوق کے تحفظ کا شعور پیدا ہوا۔ محمد علی جو مخلوط انتخاب اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست موید تھے۔ آخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :۔

"--- خیر الہام یا القاء جہاں سے بھی ہوا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ مسلمانوں کا دعویٰ حق طلبی خوب زور سے پیش ہوا۔ مشترکہ حلقہ جات انتخاب میں بلاشبہ مسلمانوں کو کافی اور حقیقی نمائندگی حاصل نہ ہو سکتی تھی اور ان حضرات کو جنہوں نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے قیام پر، جسکے مسلمان خواہش مند تھے، افسوس اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ حق انتخاب جداگانہ مسلمانوں اور انکے کثیر التعداد ہندو بھائیوں میں جدائی کا سبب نہیں، بلکہ پہلے سے جو جدائی موجود تھی، اور آج بھی موجود ہے اور ملک کے ہر گوشے میں نمایاں ہے اسکا لازمی نتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے مفاد ملی کے خیال سے غیر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا شملہ جا کر مطالبہ کیا۔ اور سیاسی احساس کے پیدا ہو جانے کے بعد اپنے تحفظ کیلئے مسلم لیگ کی دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں بنیاد ڈالی۔"[75]

جہاں تک محمد علی کا شملہ وفد کی ترتیب و تیاری کے بارے میں اعتراض کا تعلق ہے وہ ہندو پروپیگنڈہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔[76] کیونکہ تقسیم بنگال کے بعد مسلمانوں کا علیحدہ قومیت کے طور پر تسلیم کیا جانا اور پھر انکے حقوق کے تحفظ کا وعدہ، کانگریس، ہندوؤں اور خصوصاً ہندو پریس کیلئے سخت پریشان کن تھا۔ اسلئے جہاں انہوں نے مسلمانوں کو نفرت و مخالفت کا نشانہ بنایا وہاں ہندو اخبارات نے وفد کی ترتیب و تیاری کو انگریز حکام کا کارنامہ قرار دیا کہ شملہ وفد انکی ہدایت اور خواہش کا ضامن ہے۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہندوؤں نے اپنے ان الزامات و اعتراضات کی بنیاد علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچبولڈ کے اس خط پر رکھی جو اس نے 10 اگست 1906ء کو نواب محسن الملک کو لکھا تھا کہ وائسرائے لارڈ منٹو ایک مسلم وفد کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ اس میں ارچبولڈ نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنی طرف سے چند تجاویز ضرور پیش کی تھیں اور ساتھ ہی یادداشت ڈرافٹ کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ حالانکہ وفد کی ترتیب کا منصوبہ نیا نہ تھا۔ 1903ء میں دربار دہلی کے موقع پر بھی نواب محسن الملک نے اسطرح کا ایک وفد ترتیب دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی تحریک نواب محمد اسمٰعیل کی طرف سے ہوئی۔ جنھوں نے ایک خط کے ذریعے نئی اصلاحات کے حوالے سے نواب محسن الملک کو بروقت اقدام کرنے کی ترغیب دی تھی۔ ترتیبِ وفد کی تجویز 4 اگست 1906ء کو ایک خط کے ذریعے محسن الملک نے پیش کی نہ کہ 10 اگست 1906ء کو آرچ بولڈ نے۔ آرچ بولڈ نے جو خط 9 اگست 1906ء کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری ڈینلپ سمتھ کو لکھا۔ وہ نواب محسن الملک کے خط کے حوالے ہی سے لکھا تھا۔[77] حالانکہ مختلف واقعات کی رفتار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ہندی تنازعہ کے بعد جو حالت پیش آئے اور جس طرح قوم میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔ اس سے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو قومی ترقی کا احساس اور سیاسی جمود توڑنے کا خیال آیا۔ شملہ وفد اسی کا نتیجہ تھا۔

لیفٹیننٹ گورنر مشرقی بنگال مسٹر فلر کے استعفیٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے غم و غصہ پر قابو پانے کیلئے مسلم وفد کا استقبال کرنا حکومتِ وقت کی مجبوری تھی۔ اسی وجہ سے وزیر امور ہند مسٹر مارلے نے اسے برصغیر میں پائی جانے والی مختلف نسلوں اور مذاہب کے درمیان حکومت کی غیر جانبداری کے اظہار کا بہترین موقع قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر رضی واسطی نے لکھا ہے کہ اس وقت مسٹر منٹو تو کانگریس کے وفد سے ملاقات کے خواہشمند تھے۔ لیکن کانگریس نے اپنے منفی طرز عمل کی وجہ سے ایسا نہ کیا۔[78] اس سے ہندوؤں کے پروپیگنڈے کی قلعی مزید کھل جاتی ہے۔ مسٹر ارچبولڈ کی تو کوشش تھی کہ مسلمان انتخاب کی بجائے نامزدگی کا مطالبہ کریں اور آئندہ کیلئے سیاست سے کنارہ کشی کی یقین دہانی کرائیں۔ لیکن محسن الملک اور دوسرے مسلم قائدین نے انکی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ان کے ڈرافٹ تیار کرنے کی پیش کش کو بھی قبول نہ کیا۔[79]

شملہ وفد کو جن شرائط پر ملاقات کی اجازت ملی تھی۔ ان میں ایک شرط یہ تھی کہ مسلمانوں کا وفد جو یادداشت پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسکی ایک نقل پیشگی وائسرائے کو بھجوائی جائے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا خصوصی اجلاس ستمبر 1906ء میں ہوا۔ آخر یادداشت تیار کرنے کی ذمہ داری محسن الملک کو قبول کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں انہوں نے دیگر رہنماؤں مثلاً پٹنہ کے سر علی امام (1869ء - 1932ء) رامپور کے جسٹس شاہ دین اور حیدر آباد کے نواب عماد الملک سے

تعاون حاصل کیا۔ متفقہ فیصلے کے بعد نواب عماد الملک نے وفد کی یادداشت کا مسودہ تیار کیا۔ نواب محسن الملک ہمہ وقت انکے ساتھ رہے۔ وہ ایک ایک نکتے اور جملے پر غور و فکر کرتے رہے۔ جب بر عظیم کے دو کہنہ مشق اور بالغ نظر رہنماؤں نے یہ یادداشت تیار کر لی۔ تو 16 ستمبر 1906ء کے اجلاس لکھنو میں ایک بار پھر اس کی جانچ پرکھ کی گئی۔ ان حالات میں یہ پروپیگنڈہ بے بنیاد ہے کہ شملہ وفد حکومت وقت کے اشارے پر تیار کیا گیا۔[80]

مسٹر بٹلر (Butler) نے جو اس زمانے میں لکھنو کے ڈپٹی کمشنر تھے، انہوں نے بھی مسلمانوں کی یادداشت میں آرچبولڈ کی طرح اپنی بات منوانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے انگریزی ہدایات پر عمل کی بجائے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر اپنے حقیقی جذبات کو حکومتِ وقت تک پہنچایا۔ ہندو پریس نے نواب محسن الملک اور شملہ وفد کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بلکہ مسلمانوں نے شملہ وفد کو صحیح ترجمانی اور واضح کامیابی کا ذریعہ قرار دیا۔ آخر کار حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد محمد علی نے بھی شملہ وفد کی اہمیت اور کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ :۔

> "اس ڈپوٹیشن کو باریابی ہی نہیں، بلکہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اور اسکے بعد مسلمانوں نے اسکی ضرورت محسوس کی کہ اسی صوبے میں جا کر جس میں انکی اکثریت تقسیم بنگال کے باعث ہو گئی تھی اور جہاں مسلمان ہنود کے ساتھ جنگ کی کشمکش کے باعث پریشان تھے۔ ایک سیاسی جمعیت ملیہ قائم کریں۔ تاکہ آئندہ اصلاحات میں انکے حقوق کا پاس رکھا جائے اور جو حقوق انکو ملیں، انکا وہ صحیح استعمال کر سکیں۔ اس سیاسی جمعیت ملیہ کا نام ڈھاکہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد مسلم لیگ رکھا گیا اور اسکی بناء پر اسکے قانون اساسی کی تیاری میں نواب وقار الملک مرحوم، مسٹر مظہر الحق، سید وزیر حسین اور سید ظہور احمد لکھنوی کے ساتھ میرا بھی متعد بہ حصہ تھا۔"[81]

محمد علی اور علی گڑھ کالج

مسلمانوں کے حقوق و مفادات اور مطالبات خواہ سیاسی ہوں یا تعلیمی، معاشی ہوں یا سماجی، محمد علی کسی طور ان سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ بڑودہ کی ملازمت کے دوران محمد علی مسلمانوں کے اہم قومی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن انکی توجہ اور سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز و محور انکا اپنا کالج علی گڑھ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی دو مستقل گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروپ کی قیادت صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور دوسرے کی قیادت شوکت علی اور محمد علی کر رہے تھے۔ نواب محسن الملک ان دونوں گروہوں کے درمیان حد فاصل بنے ہوئے تھے۔ جس سے بعض اوقات دونوں کو شکایت ہوتی تھی۔ نئی پود (جن کے قائد شوکت علی و محمد علی تھے) شاکی تھی کہ مقامی ٹرسٹیانِ علی گڑھ دوسروں کو آگے آنے کا موقع نہیں دیتے اور صرف اپنے دوست و احباب کو نوازتے ہیں۔ اس اندرونی کشمکش نے جذبات کی رو مخالف

سمت کی طرف موڑ دی۔ اور رفتہ رفتہ نئی پود بنگالیوں کی انقلابی تحریک سے بھی متاثر ہوتی گئی[82] جسکا رخ انگریز اساتذہ اور پرنسپل کے خلاف موڑ گیا۔ کیونکہ اس وقت تک طلباء میں یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ انگریز اساتذہ اپنی حیثیت کے درست استعمال کی جائے حکومتی ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور طلبہ کی آزادی فکر و خیال پر بے جا قیود عائد کرتے ہیں۔ محمد علی بھی ان کے ہم خیال تھے۔

مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن کی طرح نئے پرنسپل مسٹر ارچبولڈ بھی کالج کے علاوہ ملکی سیاسی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور من پسند پالیسیاں بناتے تھے۔ جو جی میں آتا کرتے تھے۔ محمد علی کو بھی جب موقع ملتا انہیں نشانہ تنقید بنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ نواب محسن الملک انگریز پرنسپل اور پروفیسروں کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے۔ وہ قابو میں رکھ بھی کیسے سکتے تھے اصل اختیارات کا منبع و سرچشمہ تو انگریز خود تھے۔ بلکہ کبھی کبھار انگریز پرنسپل کا رویہ نواب محسن الملک کے ساتھ ناشائستہ اور زیادتی پر مبنی بھی ہوتا تھا۔ محمد علی کو یہ چیز شاق گزرتی تھی کہ محسن الملک ان چیزوں کے خلاف رد عمل ظاہر کیوں نہیں کرتے۔ محسن الملک کی خاموشی کے بارے میں اخبار "البشیر" لکھتا ہے کہ :۔

> "----وہ (ٹرسٹی) اس پرنسپل کی خود مختار کاروائیوں کو نواب محسن الملک کی بزدلی پر محمول کرتے تھے۔ نواب محسن الملک ایک طرف ٹرسٹیوں کی دھمکیاں سنتے تھے اور دوسری طرف پرنسپل کی نامناسب کاروائیوں سے دلبرداشتہ رہتے تھے۔ انہیں جو فکر تھی وہ یہ تھی کہ کالج کی شہرت اور نیک نامی روزافزوں ترقی پکڑے اور اس کی مالی حالات کسی نہ کسی طرح اچھی ہو جائے۔ اور کسی نہ کسی طرح کالج کی تعداد طلباء میں اضافہ ہو، اور کالج مسلمانوں میں مرکزی حیثیت حاصل کرے۔"[83]

وہ کالج کی بہتری کے لیے مصلحتاً خاموش رہتے لیکن محمد علی اور ان کے ساتھی اس خاموشی کو کمزوری سے تعبیر کرتے تھے۔ کیونکہ محمد علی خود کمزوری اور مصلحت پسندی کے خلاف تھے۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رورعایت کے قائل نہ تھے۔ خواہ مدمقابل بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ جسکا برملا اظہار انہوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ 26 نومبر 1906ء کو نواب محسن الملک کے نام خط میں علی گڑھ کالج سے متعلق تمام حالات وواقعات کا ذکر کرتے ہوئے انکے منفی نتائج سے آگاہ کیا۔[84]

علی گڑھ کالج کے پرنسپل اور انگریز سٹاف نے لامحدود اختیارات اور بے جا مراعات کی وجہ سے جو بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ محمد علی اس سے سخت نالاں تھے۔ ایک حد تک وہ خود بھی انکے زخم خوردہ تھے۔ مسٹر ارچبولڈ اپنی حاکمیت کے جلال اور اقتدار کے نشے میں نواب محسن الملک کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ارچبولڈ کی فرعونیت کا منہ بولتا ثبوت 1905ء کا دلخراش واقعہ ہے۔ جب طلباء نے بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات سے متعلق چند شکائیتوں کا میموریل سینئر طالب علم سید مصطفیٰ حسین رضوی کے ذریعے پرنسپل کے سامنے پیش کیا۔ جسکا براہ راست اثر (مسٹر گاڈزبرون) پر دو دست پر پڑتا تھا۔ دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ مسٹر ارچبولڈ ممبران سٹاف کے زیر اثر آ چکے تھے۔ مسٹر گاڈزبرون کے حامیوں نے

پرنسپل کو اپنے حق میں رام کر لیا۔ لہٰذا ارچبولڈ نے طلباء کے اس میموریل کو ڈسپلن کے خلاف قرار دے کر بلا تحقیق سید مصطفیٰ حسین زیدی کو بورڈنگ چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ محسن الملک قومی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے طلباء پر خصوصیت سے شفیق تھے۔ انکی یک گونہ تربیت کرتے تھے اور ان سے زیادہ تر کانفرنس کے کام لیتے تھے۔ سید مصطفیٰ حسین بھی اسکی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس جبری اخراج کے بعد کمیٹی کے ایک جلسہ منعقدہ 29 اکتوبر 1905ء میں وہ حسب ضابطہ شریک ہوئے۔[85] لیکن مسٹر ارچبولڈ ان سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے کہا۔

"میں یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے کسی ایک کو میٹنگ سے چلے جانا چاہیے۔"[86]

ناچار مصطفیٰ حسین رضوی کو میٹنگ سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معاملہ قومی توہین کا ایک سوال بن گیا۔ محمد علی جو تمام صورتحال سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کے حوالے سے محسن الملک کو انکی خاموشی اور مصلحت پسندی پر سخت خطوط لکھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر حفظِ مراتب کو بھی فراموش کر دیا۔ محمد علی کا کہنا تھا کہ قانون و قاعدہ کی رو سے سب برابر ہیں سب پر اس کا اطلاق یکساں ہونا چاہیے۔ اگر ایک ہندوستانی کو اس کی غلطی پر (خواہ وہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو) سزا دی جاسکتی ہے۔ تو انگریز کو کیوں نہیں؟ یہ بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں امتیاز و تقسیم چہ معنی دارد۔ محمد علی کا استدلال تھا کہ مسٹر ارچبولڈ کے رویہ سے نہ صرف سید مصطفیٰ حسین بلکہ بحیثیت سکریڑی نواب محسن الملک کی بھی سخت توہین ہوئی ہے۔ لہٰذا ارچبولڈ ان سے علی الاعلان معافی مانگیں۔ نواب صاحب اس بات سے بخوبی اگاہ تھے کہ ارچبولڈ کیلئے ایسا کرنا ناممکنات میں سے ہے اسلئے مصلحتاً خاموش رہے۔ محمد علی جو جھکنے اور خاموش رہنے والے نہ تھے، انکا طرز عمل اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے نواب محسن الملک کے نام خط میں اس ناز یبا واقعہ کے بارے میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے :۔

"ایک شریف مسلمان، فدائے قوم اور اس قوم کی ذلت ہوئی ہے۔ اس شرمناک غلطی پر مسٹر ارچبولڈ کو معافی مانگنی چاہیے اور اگر وہ معافی مانگنے پر رضامند نہیں تو صرف یہ ممکن ہے کہ ٹرسٹیانِ کالج انکو خیر باد کہیں۔"[87]

اس واقعہ نے قومی درد رکھنے والے محمد علی کے اندر اضطرابی کیفیت پیدا کر دی۔ لہٰذا اسی سلسلے میں دوبار محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"اگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ مسلمانوں کے لیڈر نہ ہونگے۔ بلکہ ہر بے ریشا یورپین پروفیسر اپنے آپکو اس قوم کا فرعون سمجھے گا۔ نہ یہ مصلحتیں ہونگیں۔ نہ آپ میں وہ طاقت ہوگی۔ ہمیشہ کیلئے کالج آپکے اور ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"[88]

محمد علی جو اس واقعہ پر شدید کرب کا شکار تھے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے 10 دسمبر 1906ء کو دوبارہ نواب محسن کو ایک طویل خط تحریر کیا کہ :۔

"----اگر میں دیکھوں کہ میرا بھائی شوکت کوئی ایسا کام کرتا ہے جو میری قوم کیلئے مضر ہے۔ میرے ملک کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ یا میرے ہم وطنوں کیلئے تباہ کن ہے۔ تو واللہ باللہ مجھے اس میں دریغ نہ ہوگا کہ دو چھریاں تیز کر دوں اور

ایک ایک کے گلے پر دن کو یا رات کو چھپے، چوری یا اعلانیہ، زبردستی یا دھوکے سے پھیر دوں اور پھر بہ تقاضائے محبت دوسری اپنے گلے پر پھیر دوں۔ جو حرکت نابینا سمسن (Samoson) نے فلسطنیوں (Phillistins) کے ساتھ کی تھی۔ اپنے اوپر اور ساری قوم پر ایک عظیم الشان عمارت کو ڈھادیا تھا۔ اور جس آفت میں آوروں کو پھنسادیا تھا۔ اسی میں خود پھنس کر مر گیا تھا۔ وہ ہی کام کرنا غیرت قومی کا تقاضہ ہے۔ اور وہی موت مرنا میری محبت ذاتی کیلئے موزوں ہے۔"[89]

دراصل یہ وہ دور تھا جب محمد علی کا عالم شباب تھا۔ وہ ہوش کی جائے جوش سے کام لیتے تھے۔ لیکن محسن الملک عمر رسیدہ اور متحمل مزاج بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلے کا اختیار اور قوت کا سرچشمہ انگریز ہیں، ان حالات میں جوش دکھانے کا مطلب اپنا ہی نقصان کرنا ہے۔ اسلئے وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے اور مصالحانہ روش اختیار کرتے تھے۔ جو محمد علی کو قطعی ناپسند تھی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں میں ایسے واقعات پیش آئے۔ جنکا رخ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ آریہ سماج جو ہندو مذہب کے احیاء کے نام پر شروع کی گئی تھی۔ اس نے ہندوؤں کو اسلام کے خلاف برسرپیکار کر دیا۔ اور ہندوستان صرف ہندوستانیوں (ہندوؤں) کیلئے India for Indians ہے، کا نعرہ لگایا۔ مسلمان غیر ملکی ہیں انہیں ملک سے باہر نکال دیا جائے یا زبردستی ہندو بنالیا جائے۔[90] دکن کے سیاستدان بال گنگادھر تلک نے محرم کے جلوس کے مشابہ مسلمانوں کے خلاف "گنپتی" کے میلے کا آغاز کر دیا جس میں مسلمانوں کے خلاف شدید اشتعال پھیلایا جاتا۔ تلک اور اسکا بنگالی ساتھی سریندر ناتھ بنرجی جو ظلم و فریب کی کالی دیوی کے پجاری تھے، کانگریس پر چھا چکے تھے۔[91] انہوں نے ہندو قوم کی سیاست کا رخ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف موڑ دیا تھا۔ متعصب اور انتہاپسند ہندوؤں نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کیلئے "شدھی" تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے "بھارت مہامنڈل" نام کی تنظیم قائم کی گئی۔ جسکا سربراہ مہاراجہ ڈربھنگہ کو بنایا۔[92] ان حالات میں مسلمانوں کیلئے اپنا دفاع ضروری تھا جسکے لیے سیاسی طور پر منظم ہونے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں دار لعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک، اہل حدیث تحریک، اور تحریک مجاہدین وغیرہ نے اپنا مذہبی و قومی فریضہ ادا کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھی۔ متحدہ قومیت کے تصور کو مسلم عوام کے اندر جڑ نہ پکڑنے دیا۔ اور مسلمانوں کیلئے الگ سیاسی جماعت کے قیام کی راہیں ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔[93] مسلمان اقتصادی لحاظ سے تو پہلے ہی پس ماندگی کا شکار تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان قوم سماجی طور پر بھی ایسے مقام پر آن پہنچی تھی کہ انکو قومی تشخص کے تحفظ وبقا کیلئے اپنے آپکو منظم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کو ملیامیٹ کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی تھیں۔ ان کی تاریخ کو حقیر گردانا جارہا تھا۔ ادب کی تضحیک ہو رہی تھی۔[94] مسلمانوں کی زبان اردو کی مخالفت میں اردو ہندی تنازعے نے جنم لیا۔ جس نے مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جسکی سرگرمیوں نے واضح کر دیا کہ ہندوؤں کی اصل دشمنی اردو زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں

سے ہے۔ اردو ہندی تنازعے نے مسلمانوں کو بھی مدافعت کیلئے تیار کر دیا۔ تقسیم بنگال 1905ء کے خلاف ہندوؤں کے شدید رد عمل نے یہ ظاہر کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کو انکے جائز حقوق دینے کیلئے بھی تیار نہیں۔ ہندوؤں نے من حیث القوم مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کی جدو جہد تیز کر دی۔[95] مقام افسوس کہ اس منظم جدو جہد کا آغاز کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا گیا۔ جو تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ مسلمانوں کیلئے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ ان میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے الگ سیاسی پلیٹ فارم کی تشکیل کا احساس روز بروز شدت اختیار کرتا گیا۔[96]

دوسری طرف انگریز حکومت میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کیلئے ایسے افراد کی ضرورت تھی۔ جو مغربی تعلیم سے آراستہ اور یورپین انداز سیاست سے آگاہ ہوں۔ خوش قسمتی سے تحریک علی گڑھ اور اسکے زیر اثر قائم ہونے والے تعلیمی اداروں نے ایسے نوجوان پیدا کر دیے تھے۔ جو اچھے سیاسی کارکن ثابت ہو سکتے تھے، جن میں محمد علی بھی نمایاں تھے۔[97] مزید براں بیسویں صدی کے آغاز میں بین الاقوامی سطح پر چند ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے استعمار پسند قوموں کا رعب و دبدبہ کم ہو گیا۔ اور مغلوب قوموں میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ روس کی جاپان کے ہاتھوں شکست اور مشرق وسطیٰ میں ایران و ترکی کے واقعات بھی مسلمانان ہند کو سیاسی طور پر بیدار کرنے کا موجب بنے۔[98] 1905ء کے انتخابات میں انگلستان کی لبرل پارٹی برسر اقتدار آگئی۔ جان مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے مقرر ہوئے۔ مسٹر مارلے نے بجٹ پر بحث کے دوران ہندوستان کیلئے نئی دستوری اصلاحات کا وعدہ کیا۔ جس میں انتخاب کے عنصر کو اہمیت دی جانے والی تھی۔ اس اعلان نے مسلمان راہنماؤں کو سیاسی طور متحرک کر دیا۔ نواب محسن الملک نے فوراً مسلمانوں کو دستوری اصلاحات میں انکا حق دلوانے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے شملہ وفد ترتیب دیا اور وائسرائے لارڈ منٹو سے کامیاب ملاقات کی۔[99] وفد کی کامیابی کے ساتھ ہی مسلم قائدین نے مستقل سیاسی جماعت بنا کر اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان حالات و واقعات نے محمد علی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ آزادانہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ انہوں نے حاکم بڑودہ سے اجازت چاہی کہ انہیں سیاسی سرگرمیوں اور صحافت میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اگرچہ حاکم بڑودہ نے اجازت دے دی۔ لیکن دیسی ریاست کے ملازم کی حیثیت سے یہ سب کچھ آزادانہ طور پر ممکن نہ تھا۔ تاہم آغاز کار محمد علی نے ملازمت کے ساتھ ساتھ سیاسی امور میں شرکت کی۔ جسکی واضح مثال دسمبر 1906ء ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں منعقدہ اجلاس میں شرکت اور خدمات کی انجام دہی ہے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ماتحت کی حیثیت سے صحیح معنوں میں سیاسی امور کی بجاآوری کافی مشکل ہے۔ چنانچہ 1907ء میں انہوں نے پہلے چند ماہ کی رخصت لی اور اسکے بعد طویل رخصت لیکر خود کو غلامی کی اس علامت (ملازمت) سے آزاد کر لیا۔[100]

انڈین نیشنل کانگریس، تقسیم بنگال، شملہ وفد اور دیگر سیاسی و نیم سیاسی تنظیموں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ خصوصاً یہ احساس اس جماعت کی طرف سے پیدا ہوا جو سید احمد خان کی جانشین تھی اور سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس سے ہر وقت بے تعلقی کا اظہار کرتے رہنا ملکی خدمت و قومی وفاداری گردانتی تھی۔ دراصل ایسا کرنا اس وقت کی ضرورت اور مسلمانوں کی مجبوری تھی 1906ء بمقام ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تو وہیں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے طور پر ایک سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں

آئی۔[101] محمد علی جو سیاست میں بھرپور انداز میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہوں نے بھی اس کے ابتدائی تشکیلی اجلاس میں نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ محمد علی نے ال انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ :۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپکی مسلم لیگ کی شروعات جون 1906ء میں ہوئیں۔
ہمیں یہ نام پسند آیا اور ہم نے اسکو اپنا لیا۔"[102]

محمد علی نے اگرچہ اس وقت تک عملی طور پر سیاسی میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ ہی بطور سیاسی قائد ان سے کسی قسم کی توقعات وابستہ تھیں۔ پھر بھی محمد علی نے مسلم لیگ کی تاسیس اور استحکام میں نمایاں حصہ لیا۔ لیگ کے قواعد و ضوابط کی ترتیب و درستگی کا کام کیا۔ بعد ازاں 1907ء میں تمام کاروائی کو "The Green Book" نامی کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔ بقول سر محمد یعقوب علی (1879ء-1942)

"---- مسلم لیگ کی ساخت اور اسکے قواعد کی ترتیب میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا۔ اور
اس وقت سے محمد علی کی زندگی سراپا سیاست بن گئی۔"[103]

حوالہ جات

1 - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص ص.85-484

II - محمد صادق قصوری : تحریک پاکستان اور علماء کرام۔ (لاہور-1999ء) ص.54

نوٹ :۔ محمد علی کے آباؤ اجداد اور خاندان سے متعلق مکمل تفصیل درج ذیل کتب میں موجود ہے۔

I - آل حسن مودودی : نخبتہ التواریخ ۔ (امروہہ-1297ھ) ص ص.13-112

II - محمود احمد عباسی : تحقیق الانساب۔ (دہلی-1932ء) ص ص.55-351

III - محمود احمد عباسی : تاریخ امروہہ۔ جلد اول۔ (دہلی-1932ء) ص ص.69-65

IV - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص.459

V - محمود احمد عباسی : تذکرۃ الکرام۔ (دہلی-1930ء) ص ص.85-70

2 - ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ حصہ اول۔ (مترجم : صادق حسین) (لاہور-1955ء) ص ص.18-216

II - P. Hardy : *The Muslims of British India.* (Cambridge-1972) P-59

III - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (مترجم : ہلال احمد زبیری) (کراچی-1967ء) ص.347

IV - حمیدہ ریاض : محمدعلی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص.39

3 - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص ص.32-31

(حوالہ ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ (لاہور-1955ء)

4 - ایضاً ص.59

5 - ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : بحوالہ سابقہ۔ ص.172

6 - الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید۔ (لاہور-1966ء) ص.145

II - محمد امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.5

III - Safder Mahmood/ Javeed Zafar : *Founders of Pakistan.* (Lahore-1968) P-9

IV - Keth Kalnád : *A Pakistan Political Study.* (London -1957) P-12

7 - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.60

8 - ایضاً . . . .

9 - فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء) ص.8

Richard Temple : ***India in 1880.*** (London-1980) P.115 - II

W.W Hunter : ***Our Indian Muslims.*** (London-1971) PP104-10 - III

10 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص.38

11 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.ی

12 - سید مصطفیٰ علی بریلوی : انگریزوں کی لسانی پالیسی۔ (کراچی-1970ء) ص ص.81-79

C.H.Philips : ***The Evolution of India and Pakistan, 1858-1947.*** - II

(London-1962) PP.178-80

P. Hardy : ***Op. cit.,*** P-75-77 - III

13 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.57

(حوالہ : کرسٹائن ڈوبن : بیسک ڈاکو منٹس۔ (لندن-1970ء) ص.18)

14 - خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931ء) ص.12

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی۔ 18 دسمبر 1978ء (مولانا عبدالقدوس ہاشمی۔ مولانا محمد علی بے مثل رہنما۔ ص.7)

15 - احمد علی خان شوق : تاریخ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص.460

II - محمود احمد عباسی : تاریخ امروہہ۔ جلد اوّل (دہلی-1932ء) ص ص.71-69

16 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.28

II- روزنامہ : مشرق۔ لاہور۔ 27 دسمبر 1978ء (ہدایت اللہ خان۔ محمد علی جوہر کانفرنس ص.9)

17 - آل حسن مودودی : نخبتہ التواریخ۔ (امروہہ-1297ھ) ص ص.17-115

II - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص ص.38-537

III - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمدعلی جوہر، سیاسی۔ (کراچی-1978ء) ص.201

IV - حمیدہ ریاض : محمدعلی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص.39

18 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص ص.28-27

Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment.*** (Lahore-1942) P-5 - II

Afzal Iqbal : ***Life and times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) P-22 - 19

Ibid., ... P-35 - 20

II - رامپور اسٹیٹ گزٹ۔ 22 ستمبر 1890ء

21 - ایضاً . . . .

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی 16 دسمبر 1978ء (خالد لطیف۔ تحریک آزادی کے عظیم رہنما ص.3)

22 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.9

II- ہفت روزہ : مشرق میگزین۔ لاہور۔ 9جنوری1987ء (علامہ شبیر بخاری۔ مولانا محمد علی ص ص.21-27)

III- ۔ ۔ : ۔ ۔ کراچی 8جنوری1988ء (عشرت رحمانی ۔ مولانا محمد علی جوہر ص ص.42-45)

23 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.41

II - نسیم سوہدروی : علی گڑھ کے تین نامور فرزند۔ (لاہور-1976ء) ص.9

24 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.42

II - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.12

III - عبدالوحید خان : مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی۔ (لکھنو-1938ء) ص ص.90-92

25 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.14

II - رئیس احمد جعفری : کاروان گم گشتہ۔ (کراچی-1971ء) ص ص.20-21

26 - راجہ موہن داس : مسلم افکار ۔ (مترجم: محمد فاروق قریشی) (لاہور-1996ء) ص.143

II - ولی مظہر : عظمتوں کے چراغ۔ جلددوم (ملتان-1988ء) ص.383

III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.13-14

IV - G-Allana: ***Our freedom Fighters 1562-1947.*** (Lahore-1985) P.271

27 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.42

II - عبداللطیف اعظمی : مولانا محمد علی، ایک مطالعہ۔ (دہلی-1980ء) ص.18

28 - Francis Robinson : ***Separatism Among Indian Muslims, the Politics of the United Provinces.*** (London-1974) P-361

II - مفتی انتظام اللہ شہابی : مشاہیر جنگ آزادی۔ (کراچی-1957ء) ص.285

III - عزیزالرحمٰن جامعی : جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین۔ حصہ سوم۔ (دہلی-1975ء) ص ص.169-70

29 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.16

30 - سید مسعود حسن لکھیم پوری : عندلیب تواریخ۔ (الہ آباد-1963ء) ص.53

II - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) P-37

31 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.21

II - محمد سرور : محمد علی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941) ص.17

III - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.29

32 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (دہلی-1963ء) ص.82

II - ثنا الحق صدیقی : محمد علی جوہر ،حیات اور تعلیمی نظریات۔ (کراچی-1998ء) ص.48

III - Afzal Iqbal : *Life and Times of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-31

33 - Ibid., ...PP-31.33

میاں فضل حسین کی "غیر مطبوعہ ڈائری" جو جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں محمد علی کی قیام لندن کے دوران ادبی و سماجی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

II - Afzal Iqbal : (Ed) *My Life : A Fragment* (Lahore-1942) P-15

34 - محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.86-88

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی۔ 4جنوری1980ء (فرحت شاہجہانپوری۔ مولانا محمد علی ص.5)

35 - راجہ موہن داس : بحوالہ سابقہ۔ ص.144

II- روزنامہ : حریت۔ کراچی 6جنوری1975ء (اعجازالحق قدوسی۔ مولانا محمد علی جوہر ص.3)

36 - Afzal Iqbal : *Life and Times of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-33

II - ماہنامہ : الجامعہ۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر۔ جلداول۔ دہلی۔ اپریل-1979ء

III - مجلّہ : برگ گل۔ جوہر نمبر۔ گورنمنٹ اردو کالج کراچی۔ 1401ھ

IV- روزنامہ : حریت۔ کراچی۔ 4جنوری1975ء (ڈاکٹر محمد شمس الدین۔ مولانا محمد علی جوہر ص.5)

37 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.19

II - منشی عبدالرحمٰن : معماران پاکستان۔ (لاہور-1976ء) ص.237

III - عبدالماجد دریابادی : خطوط مشاہیر۔ (لاہور-1944) ص.253

IV- روزنامہ : حریت۔ کراچی۔ 15دسمبر1978ء (خالد لطیف۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.3)

38 - خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931ء) ص.15

II - Afzal Iqbal : (Ed) *My Life : A Fragment.* (Lahore-1942) P-15

III - Afzal Iqbal : *Life and Time of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-34

IV- روزنامہ : نوائے وقت۔ لاہور 14 مئی1977ء (ڈاکٹر زاہد علی واسطی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.5)

39 - عاشق حسین بٹالوی : ہماری قومی جدوجہد۔ (لاہور-1966ء) ص ص.52-248

II - F.K.Durani : *The Meaning of Pakistan.* (Lahore-1966) P-56

III - Peter Hardy : *Op. cit.,* P-131

برہمو سماج : برہمو سماج کا آغاز 1828ء میں ایک ہندو راجہ موہن رائے نے کیا۔ راجہ رام 1772ء میں رادھا نگر میں پیدا ہوا۔ عربی و فارسی زبان پر مہارت کی وجہ سے "مولوی رام موہن رائے" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

پرارتھنا سماج: یہ تحریک انیسویں صدی کے وسط میں بمبئی مہاراشٹر میں شروع ہوئی۔ اسکا بانی ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ ہندو تھا۔

دیوسماج: دیو سماج کی بنیاد 1887ء میں ستیانند اگنی ہوتری نے لاہور کے مقام پر رکھی۔ یہ تحریک مادی ترقی پر زور دیتی تھی۔

آریہ سماج: دیانند سرسوتی نے 1875ء میں بمبئی کے مقام پر اسکی بنیاد رکھی۔ دیانند سرسوتی گجرات کاٹھیاوار کے برہمن خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "ستھیارتھ پرکاش" 1874ء میں مکمل کی۔ اس کتاب کا چودھواں باب اسلام کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔

گئو رکھشا سبھا: آریہ سماج نے گئو رکھشا سبھا بھی قائم کی۔

40 - سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.31

William Wedden Burn : *Allan Actavan Hume.* (London-1913) PP-59-60 - II

Seeta Ramia Pteabhi : *History of the Indian National Congress.* Vol.1 (Mudras-1935) P-8 (Vol.2 Bombay 1947) - 41

G.Chesney : *India : The Political out look, Nineteenth Century .* (London-1994) P-901 - II

William Wedden Burn : *Allan Actavan Hume.* (London-1913) PP-62-65 - III

D.Dilks : *Curzon in India.* (New Yark-1970) PP-78-79 - 42

II - رئیس احمد جعفری : سرسید سے قائداعظم تک۔ (لاہور-1970ء) ص.21

Ronaldshay (Lord Zetland) : *Life of Curzon* (London-1928) PP-79-83 - 43

II - طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.75-270

D.Dliks : *Courzon in India.* (New Yark-1970) PP-89-99 - III

44 - مقصود ایاز۔ محمد ناصر : شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا۔ (لاہور-1987ء) ص.573

II- روزنامہ : نوائے وقت۔ لاہور۔ 10 دسمبر 1978ء (وقار انبالوی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.3)

45 - ایس۔ایم۔اکرام : موجِ کوثر۔ (لاہور-1984ء) ص.281

Safdar Muhmood / Javaid Zafar : *Founders of Pakistan.* (Lahore-1968) PP-134-35 - II

A.H.Albirani : *Makers of Pakistan and Modern India.* (Lahore-1950) P-152 - III

IV- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ اکتوبر1991ء ص ص.43-41
46. محمد امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.202
47 - سید محمد ہادی : علی برادران اور انکا زمانہ۔ (دہلی-1978ء) ص ص.45-130
II - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی ۔ (دہلی-1932ء) ص.188
III- ماہنامہ : الحق۔ اکوڑہ خٹک۔ پشاور نومبر1975ء ص ص.59-54
48 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.86

49 - ایضاً . . . .
II- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ 7جنوری1931ء ص ص.73-70
50 - ماہنامہ : نگارِ پاکستان ۔ نومبر، دسمبر1978ء ص ص.88-81
II- ماہنامہ : ماہ نو۔ کراچی۔ مارچ1968ء ص ص.75-70
51 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (دہلی-1963ء) ص.179
II - سہ ماہی : العلم۔ جوہر نمبر۔ کراچی۔ اکتوبر تا دسمبر1978ء ص ص.70-63
III - اردو انسائیکلو پیڈیا: (فیروز سنز لاہور۔ 1987ء) ص.391
II- ماہنامہ : علی گڑھ میگزین۔ جنوری1936ء ص ص.62-59
52 - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاك وہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.348
II - اردو دائرہ معارف اسلامیہ : (لاہور-1986ء) ص.492
III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص.16

Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment*** (Lahore-1942) PP-32-35 - IV

M.Hasan : ***Mohammed Ali Ideology and Politics*** (Delhi-1981) P-981-85 - 53

D.Lelyveld : ***Three Aligarh Students : Aftab Ahmad Khan, Ziauddin Ahmad andMohammed Ali.*** Modern Asian Studies -1974. PP-205-18 - II

III- ماہنامہ : صدق۔ 20فروری1946ء ص ص07-103
IV- ہفت روزہ : نصرت۔ کراچی۔ آزادی نمبر۔ 14اگست1959ء ص ص.37-33
54 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.54
II - شریف الدین پیرزادہ : پاکستان منزل بہ منزل۔ (کراچی-1965ء) ص.96
III - چودھری خلیق الزماں : شاہراہ پاکستان۔ (کراچی-1967ء) ص.185
IV- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ جوہر نمبر۔ مئی1977ء ص ص.19-15

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) PP- 36-37 - 55

II - ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ جوہر نمبر۔ فروری، مارچ1979ء ص ص.37-33

III- ماہنامہ : جامعہ۔ دہلی۔ 1979ء ص ص.20-23

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) P- 38 - 56

II - ماہنامہ : انجمن اسلامیہ۔ جوہر نمبر۔ 1974ء ص ص.69-72

57 - اشتیاق حسین قریشی : جدوجہد پاکستان۔ (مترجم: ہلال احمد زبیری) (کراچی-1990ء) ص.38

II- ماہنامہ : انجمن اسلامیہ۔ جوہر نمبر۔ فروری1966ء ص ص.80-83

58 - سید شاہ محمد قادری : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1998ء) ص.277

59 - ایضاً ص.276

II - روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 12جنوری1927ء۔

Mohammad Ali : ***Thoughts on Present Discontent.*** (Bombay-1907) - III

S.Sardar Ali Khan : ***India of Today.*** (Bombay- 1908) PP-71-73 - IV

60 - شریف الدین پیرزادہ : بحوالہ سابقہ۔ ص.98

Surrendar Nath Banerji : ***A Nation in the Making.*** (Oxford-1925) - 61
PP-187-88

II- ماہنامہ : الحق۔ جنوری1975ء ص ص.60-62

Safeeq Allah Khan : ***Two Nation theory.*** (Hadra Abad Dakun -1973) - 62
PP-442-45

Sufia Ahmad : ***Muslim Community in Bengal 1884-1912.*** (Dacca-1974) - II
P-239

Manchester Guardian. 3 June 1907 - III

Henry Craik : ***Impressions of India.*** (London-1908) P-225 - IV

F.M. Demello : ***The Indian National Congress : A Historical Sketch.*** - V
(London-1938) PP-41-49

B.R.Ambedkar : ***Pakistan on the partition of India.*** (Bombay-1945)P-205 - 63

II- ماہنامہ : الحق۔ نومبر،دسمبر1975ء ص ص.51-52

III- ماہنامہ : انجمن۔ اکتوبر1976ء ص ص.91-94

Shereef-ud-Din Pirzada : ***Evolution of Pakistan.*** (Lahore-1963) PP-73.76 - 64

Jamil-ud-Din Ahmad : ***Historic Documents of Muslims freedom.*** - 65
(Lahore-1965) PP-5-6

P.Hardy : ***Op. cit.,*** PP-142-45 - II

III- ماہنامہ : قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل1966ء ص ص.39-41

S.Razi Wasti : ***Memoirs and other writings of Syed Ameer Ali.*** (Lahore-1968) P-34 - 66

K.K.Aziz : ***Syed Ameer Ali , His life and works.*** (Lahore-1968) P-25 - II

Jamil-ud-Din Ahmed : ***Op. cit.,*** PP-7-8 - 67

68 - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.322

I.H.Qurashi : ***The Muslim community of the Indo-Pakistan-Subcontinent.*** (Hage-1962) PP-32-37 - II

69 - اشتیاق حسین قریشی : جدوجہد پاکستان۔ (کراچی-1990ء) ص.42

P.Hardy : ***Op. cit.,*** PP-149-51 - II

70 - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.51

Hery.J.Greenwel : ***His Highness : The Aga Khan, Imam of Ismailies.*** (London-1952) PP-41-59 - 71

Stanley Jackson : ***The Aga Khan : Prince, Prophet and Sportsman.*** (London-1952) P-36 - II

III - محمد علی چراغ : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1979ء) ص ص.504-16

IV - منشی عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.317-27

V - مقصود ایاز۔ محمد ناصر : بحوالہ سابقہ۔ ص.40

VI - محمد امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.169

شملہ وفد کے مطالبات:۔

1. انتخابی اداروں میں جو طریقہ انتخاب رائج کیا جائے اس میں مسلمانوں کو مخصوص حلقہ ہائے انتخاب سے خود اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق ہو۔
2. قائم مقامی میں مسلمانوں کی اہمیت اور سیاسی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔
3. مندرجہ گزٹ اور ذیلی ملازمتوں میں ایک مناسبت کے ساتھ مسلمانوں کا تقرر ہوا کرے۔ ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج اور ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان ممبر مقرر کئے جائیں۔
4. یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ اور سینٹ میں مسلمانوں کی تعداد مقرر ہو۔
5. محمڈن یونیورسٹی کے قیام میں امداد کی جائے۔

72 - امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.107

II - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.52-53

B.R.Ambedkar : ***Pakistan on the partition of India.*** (Bombay-1945) P-225 - III

IV - Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-62-63

V - ***India : Minto and Moraeley*** (Countess of Minto 1905-1910). (London-1934) PP-46-47

73 - ***History of Freedom Movement.*** Part.1. Vol.3 (Karachi-1957-1963) P-111

II - سید حسن ریاض : **بحوالہ سابقہ۔** ص ص.55-57

III - D.Lelyveld : ***Aligarh's First Generation : Muslim Solidarity in British India.*** (Princeton-1978) PP-144-51

74 - سید شاہ محمد قادری : **بحوالہ سابقہ۔** ص ص.280-81

II - روزنامہ : **ہمدرد۔** دہلی۔ محمد علی جوہر۔ 12 جنوری 1927ء

III - ماہنامہ : **تہذیب۔** کراچی۔ جنوری 1992ء ص ص.92-97

75 - سید شاہ محمد قادری : **بحوالہ سابقہ۔** ص ص.285-86

II - ماہنامہ : **تہذیب الاخلاق۔** لاہور۔ اپریل 1991ء ص ص.32-41

76 - Francis Robinson : ***Op. cit.,*** PP-365-67

II - P.Hardy : ***Op. cit.,*** P-156

III - Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-73-75

IV - سید طفیل احمد منگلوری : **بحوالہ سابقہ۔** ص.349

77 - ایضاً . . . . ص ص 349-50

II - محمد علی چراغ : **اکابرین تحریک پاکستان۔** (لاہور-1997ء) ص.215

78 - S.Razi Wasti : ***Memoirs and other writings of Syed Ameer Ali.*** (Lahore-1968) P-66

79 - D.Lelyveld : ***Aligarh's First Generation : Muslim Solidarity in British India.*** (Princeton-1978) PP-152-55

II - Lal Bahadur : ***The Muslim League.*** (Agra-1954) PP-35-36

80 - محمد علی چراغ : **اکابرین تحریک پاکستان۔** (لاہور-1997ء) ص ص.210-18

81 - سید شاہ محمد قادری : **بحوالہ سابقہ۔** ص ص.281-82

II - ماہنامہ : **تہذیب الاخلاق۔** لاہور۔ جنوری 1990ء ص ص.102-10

82 - امین زبیری : **تذکرہ محسن۔** (لاہور-1987ء) ص.230

83 - ایضاً ص.233

II - روزنامہ : البشیر۔ (دسمبر1934ء)

84 - محمد سرور : خطوط محمدعلی۔ (دہلی-1940ء) ص ص.22-13

II - محمد سرور : مولانا محمدعلی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.25-23

III- ماہنامہ : ماہ نو۔ کراچی۔ تحریک پاکستان نمبر۔ ص ص.39-38

IV- ماہنامہ : بدایوں۔ کراچی۔ جولائی1995ء ص ص.20-9

85 - امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.218

II - چوہدری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.32-230

86 - ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص.234

87 - محمد سرور : مولانا محمدعلی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.31

II - محمد سرور : خطوط محمدعلی۔ (دہلی-1940ء) ص.18

88 - ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص20

89 - امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.220

90 - P.Hardy : *Op. cit.,* P-72

II - W.W Hunter : ***Our Indian Muslims.*** (London-1971) PP120-25

III- ماہنامہ : حریت۔ اسلام آباد۔ یوم آزادی نمبر۔ اگست1982ء ص ص.73-70

91 - Seeta Ramia Pteabhi : ***Op. cit.,*** Vol.1 PP-35-37

II - C.H.Philips : ***The Evolution of India and Pakistan, 1858-1947.*** (London-1962) PP-185-87

III- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ جنوری1978ء ص ص.72-71

92 - Richard Symards : ***The Making of Pakistan.*** (London-1950) PP-39-40

II - F.K. Durani : ***The Making of Pakistan.*** (Lahore-1949) PP-81-87

93 - طفیل احمد منگلوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.397

II- روزنامہ : نوائے وقت۔ کراچی۔ 12جنوری1985ء (جسٹس(ر) سجاد احمد خان۔ کر کے جو ہر آپ کے جوہر کھلے۔ ص.7)

94 - Mohammed Noman : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1942) P-49

95 - Abdul Hamid : ***Muslim Separatism in India 1858-1947.*** (Oxford-1967) PP-51-55

II - Sufia Ah mad : ***Op. cit.,*** PP-250-51

Shereef-ud-Din Pirzada : ***Evolution of Pakistan.*** (Lahore-1963) PP-41-45 - 96

Khalid Bin Syeed : ***Pakistan : The Formative Phase.*** (Karachi-1960) P-174 - II

III - محمد امین زبیری : سیاستِ ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص ص.89-91

I.H.Qurashi : ***The Muslim community of the Indo-Pakitan-Subcontinent.*** (Hage-1962) P-95 - 97

II - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاك و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.105

III - ثروت صولت : ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ جلد دوئم۔ (لاہور-1983ء) ص ص.81-89

William.H, Me Neilt and Marilyn Robinson Waldman (Ed) : ***The Islamic World.*** (Oxford-1977) PP-121-28 - 98

II - عطش درانی : پاکستان : ایك نظریہ ، ایك تحریك۔ (لاہور-1983) ص ص.35-40

S.Qalb. I. Abid : ***Muslim Struggle for Indenpence.*** (Lahore-1997) PP-23-24 - 99

I.H.Qurashi : ***A Short History of Pakistan.*** (Karachi-1984-1992) PP-30-32 - II

D.Lelyveld : ***Three Aligarh Students : Aftab Ahmad Khan, Ziauddin Ahmad and Mohammed Ali.*** Modern Asian Studies-1974. PP-156-57 - 100

Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indinan Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-94-96 - II

A.B.Rajput : ***Muslim League Yesterday and today.*** (Lahore-1948) P-19 -101

Jamil-ud-Din Ahmed : ***Early phase of Muslim Political Movement.*** (Lahore-1965) P-83 - II

Mohammed Numan : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1942) P-67 - III

IV - مرزا اختر حسین : تاریخ مسلم لیگ ۔ (بمبئی-1940ء) ص.66

102- محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.100

103- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.224

باب دوم

محمد علی : میدانِ سیاست میں

1906ء - 1919ء

آل انڈیا مسلم لیگ اور محمد علی

بڑودہ میں ملازمت کے دوران محمد علی کی روح بتدریج مگر یقینی طور پر سیاست کیلئے بیدار ہوتی رہی۔ جہاں تک مسلمانوں کا برصغیر کی سیاست میں قدم رکھنے کا سوال ہے۔ محمد علی تعلیمی اور سیاسی طرزِ فکر میں سید احمد خاں کے ہم خیال تھے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میدانِ سیاست میں آنے سے قبل مسلمان خود کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں تاکہ مکمل شعوری طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے حقوق کی بات اسطرح کریں جسے سننا اصحابِ اقتدار کی مجبوری ہو جائے۔ محمد علی، سید احمد خاں کے قائم کردہ کالج علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہاں قیام کے دوران حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ سید احمد خاں کے سیاسی نظریات بھی انکے ذہن میں راسخ ہوتے گئے اور محمد علی اس نتیجے پر پہنچے کہ تعلیمی درسگاہیں بہترین تربیت گاہیں ہوتی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ :۔

> "جسطرح کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں سے 1857ء قیام کے تمیں سال بعد ہندوؤں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل 1885ء میں تیار ہو کر کانگریس کی بانی ہوئی۔ اس طرح 1875ء میں علی گڑھ اسکول اور 1877ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد کے تمیں سال بعد مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل 1906ء میں تیار ہو کر مسلم لیگ کی بانی ہوئی۔" [1]

مسلم لیگ کی تشکیل سے مسلمانوں نے بحیثیت قوم ہندوستان کے سیاسی افق پر باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ (جس کی بنیاد 30 دسمبر 1906ء بمقام ڈھاکہ رکھی گئی۔) کے قیام میں بہت سے سیاسی و ثقافتی عوامل شامل تھے۔[2] دراصل ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی بنیادیں 1857ء کے انقلاب کے سنگ ہی رکھ دی گئی تھیں۔ کیونکہ انگریز حکومت کو احساس ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو مقامی خود اختیاری کے اداروں میں نمائندگی اور سیاسی و معاشی حقوق و مراعات نہ دی گئیں۔ تو یہ لوگ حکومت کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بات کا اولین احساس مسلمان رہنما سید احمد خاں نے حکومت کو دلایا۔ انہوں نے انقلاب 1857ء کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھا۔[3] جس میں حکومت کو مشورہ دیا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ملک کے باشندوں کو قانون سازی کے عمل میں ضرور شریک کریں۔ تاکہ وہ ملک میں نافذ العمل قوانین کو خود سمجھ کر اپنے ہم وطنوں کو اسکے اچھے پہلوؤں سے

آگاہ کر سکیں۔ ایکٹ 1861 کے نفاذ کا مقصد ہندوستانیوں کو کسی حد تک ایسی نمائندگی دینا مقصود تھا۔ لیکن اس سے فیضیاب ہونیوالے ہندو تھے۔ احساس برتری کے نشے میں 1857ء کے صرف دس سال بعد ہی 1867ء میں ہندوؤں نے زبان کے مسئلے پر ایک منظم تحریک شروع کی۔ جسکا مقصد سرکاری سطح پر اردو کا خاتمہ اور ہندی کی ترویج تھا۔[4] انہوں نے ہندی کی حمایت میں ہندی سبھائیں بھی تشکیل دیں۔ جنکا صدر دفتر الہ آباد میں قائم کیا گیا۔[5] ان سبھاؤں کے علمبرداروں نے اردو کے خلاف خوب پروپیگنڈہ اور تقاریر کیں۔[6]

مسلمانوں اور خصوصاً سید احمد خاں کو ہندوؤں کے اس رویئے سے شدید رنج ہوا۔ اور وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہوگئے۔[7] اردو کے خلاف ہندوؤں کی تحریک نے ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے علیحدہ تشخص کی بحث کو فروغ دیا۔ اور آنے والے وقت میں اردو زبان کی بنیاد پر مسلم قومیت کا نظریہ دیکر اسے مستحکم کردیا۔ یہ خالصتاً ہندوؤں کی مسلمانوں سے علیحدگی اختیار کرنے کی پالیسی تھی۔ حالانکہ مسلمانوں کی سوچ ابتداً میں علیحدگی پسند نہ تھی۔ بلکہ وہ تصور وطنیت سے سرشار تھے۔ خود محمد علی بھی اس وقت تک ہندوستانی قومیت اور متحدہ ہندوستان کے حامی رہے جب تک انہیں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے نے صرف مسلمانوں کیلئے بحیثیت قوم سوچ وعمل پر مجبور نہ کردیا۔

1882ء میں حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں کو حکومت کے کاموں اور مقامی خوداختیاری کے اداروں میں نمائندگی کا موقع ملا۔ تو ہندو جو تعلیمی، سیاسی اور معاشی طور پر مسلمانوں سے ترقی یافتہ تھے۔ انہوں نے ایکٹ 1882ء سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے 1885ء میں حکومتی تائید ورضا کے ساتھ ایک سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔[8] (البرٹ بل کی مخالفت نے بھی ہندوؤں کو سیاسی طور پر مستحکم کردیا تھا۔) لفظ "نیشنل" کا مقصد ہندوؤں کے نزدیک یہ تھا کہ مسلم قومیت کو کسی نہ کسی طرح ہندو قومیت میں جذب بلکہ ختم کردیا جائے۔ سید احمد خاں اپنی غیر معمولی فراست اور تجربے کی بناء پر کانگریس کی چالوں کو بھانپ گئے تھے۔ اور یہ بھی جان گئے تھے کہ کانگریس کے مطالبات صرف اور صرف ہندوؤں کے مفاد کیلئے ہیں۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اور مختلف موقعوں پر واشگاف الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں۔[9] (اسطرح وہ دو قومی نظریے کے خالق بنے۔)

سید احمد خاں نے 1886ء میں مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کیلئے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ جب انہوں نے کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے دعوؤں کا علی الاعلان بطلان کیا اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکا۔ تو کانگرنس کے ایک مسلمان حامی بدرالدین طیب جی نے سید احمد خاں سے کانگریس کی مخالفت کی وجوہ دریافت کیں۔ اس پر سید احمد خاں نے لکھا کہ :۔

> " مجھے نہیں معلوم کے نیشنل کانگریس کے کیا معنی ہیں؟ آپ غلط نام رکھنے والی اس کانگریس کے کاموں کو ہند کیلئے فائدہ مند سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑھ رہا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کیلئے نہیں بلکہ عمومی طور پر سارے ہندوستان کیلئے نقصان دہ ہے۔"[10]

سید احمد خاں نے کانگریس کی مخالفت کی، یا مسلمانوں کی اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ اسکا ہرگز یہ مطلب

نہیں کہ وہ مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ انکی خواہش تھی کہ مسلمان پہلے اپنے آپکو تعلیمی، معاشی، اور سماجی لحاظ سے مضبوط کریں اور اسکے بعد میدان سیاست میں آئیں۔ بعد ازاں اس روش پر محمد علی نے بھی انکی پیروی کی۔ سید احمد خاں کی قائم کردہ "آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس" سے پہلی بار مسلمانوں کو موقع ملا کہ وہ باہم تبادلہ خیال کے ذریعے اپنے قومی و سیاسی مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ اس یکجائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی میں انقلاب اور سیاسی شعور میں تحریک پیدا ہوئی۔ بقول الطاف علی بریلوی

> "ایجوکیشنل کانفرنس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں قومی یکجہتی و ہم آہنگی کا وہ صور پھونکا کہ تمام ملک خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا---اور اس بیداری کے نتیجے میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔"[11]

یہ سید احمد خاں کی متعین کردہ راہیں تھیں۔ جن پر چل کر محمد علی اور مسلمانوں نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور اپنے تحفظ و بقا کیلئے نمائندہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی۔ سید احمد خاں کو یقین ہو گیا تھا کہ اردو پر وار دراصل مسلم قومیت اور مسلم تہذیب پر وار ہے۔ اگر اردو مٹ گئی تو مسلمان بھی ایک منفرد قوم کی حیثیت سے نہ رہ سکیں گے۔ لہذا وہ اردو کی حفاظت و مدافعت کو قومی فریضہ جان کر آخری دم تک لڑتے رہے۔[12]

1892ء میں انڈین کونسل ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ یہ ایکٹ دراصل انگریز کی خشتی ہوئی مخصوص جمہوریت کی طرف پہلا قدم تھا۔ جس سے تمام تر فائدہ ہندوؤں کو پہنچتا تھا۔ بقول اقبال

> دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
> تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ہندوؤں کے ساتھ حکومت کی جانبداری نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریز حکومت کی جانبداری کا بہترین مظاہر لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈانلڈ کا اردو کے خلاف اقدام تھا۔ جنہوں نے 18 اپریل 1900ء کو ہندوؤں کے دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے ہندی کو صوبہ یوپی کی عدالتوں میں نافذ کر دیا۔[13] اگرچہ یہ اقدام صوبہ یوپی میں ہوا تھا۔ لیکن اسکے اثرات پورے ہندوستان میں محسوس کئے گئے۔ میکڈانلڈ کے جانبدارانہ فیصلے سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم رہنما اردو کے دفاع اور مسلمانوں کے سیاسی و قومی مفادات کے تحفظ کیلئے میدان میں آگئے۔ 13 مئی 1900ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خان کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک نے سر انتھونی میکڈانلڈ کے اقدام پر تنقید کرتے ہوئے اردو کی حمایت میں پر زور تقریر کی۔ جو میکڈانلڈ کے قہر و غضب کا باعث بنی۔[14] ان واقعات نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کانگریس کی طرز پر انکی بھی اپنی نمائندہ سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ جو انکے حقوق و مفادات خواہ سیاسی ہوں یا ثقافتی، کا تحفظ کر سکے۔ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام اردو بولنے والے مسلمانوں کی طرف سے سیاسی عمل میں شمولیت کی پہلی کوشش ثابت ہوئی۔[15] سرکاری رویے نے مسلمانوں میں اس احساس کو جنم دیا کہ اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کی خاطر انہیں خود پر انحصار کرنا ہوگا۔ حکمرانوں پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا

جا سکتا۔ سر انتھونی میکڈانلڈ کے حکم نامے اور اردو ڈیفنس ایسوی ایشن کی کوششوں کے چند ماہ بعد ہی علی گڑھ کی ابھرتی ہوئی شخصیت موسیٰ خاں نے ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جو مسلم مفادات کا تحفظ کر سکے۔[16]

در حقیقت اردو ہندی کشمکش نے "طبقۂ اشراف" کے احساسِ زیاں میں بُری طرح اضافہ کر دیا تھا۔ جس میں ملازمتوں کے مواقع اور کونسلوں میں نمائندگی بھی شامل تھی۔ اس سے قبل انگریزی تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ محرومی کا شکار تھے۔ لیکن اس میں دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہندوؤں نے اُردو کے خلاف تحریک چلا کر پھر انکی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی مذموم کوشش کی۔ سید احمد خاں کی قائم کردہ ایم۔اے۔او۔ ڈیفنس ایسوسی ایشن 1893ء جسکا مقصد حکومت کے سامنے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو پیش کر کے انکے سیاسی مفادات کا دفاع کرنا تھا، اب غیر مؤثر ہو چکی تھی۔[17]
1905ء میں تقسیم بنگال کے موقع پر ہندوؤں کی مخالفت سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ صرف زبان کے مسئلہ پر ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کا طرز عمل اور نقطہ نظر مسلمانوں کے بارے میں سراسر غیر جمہوری، غیر منصفانہ اور انتہائی متعصبانہ ہے۔ جس سے مسلمانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کا نیا احساس پیدا ہوا۔ ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد سلیم احمد رقمطراز ہیں کہ :۔

> " 1900ء سے 1906ء کے درمیان ہونے والے کچھ دوسرے واقعات بھی کل ہند سطح پر مسلم سیاسی اتحاد کے مقصد کو حاصل کرنے میں معاون ہوئے۔ ان میں سے ایک سید حسن بلگرامی (1844ء-1926ء) کو یونیورسٹی کمیشن میں نامزدگی کے خلاف ہندوؤں کا واویلا تھا۔ انہیں 1902ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے نامزد کیا تھا۔ ہندو مخالفت کو خاموش کرنے کی غرض سے کرزن نے گرو داس بینر جی (1844ء-1918ء) کو بھی نامزد کر دیا۔"[18]

باایں ہمہ ہندوؤں نے مخالفت ترک نہ کی۔ دراصل انکا مقصد مسلمانوں کے ساتھ برابر حصہ کی وصولی نہ تھا۔ بلکہ منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں پس پشت ڈال کر ہندوؤں کو ترجیحی حیثیت ملے۔ جس نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ گذشتہ ربع صدی کے تجربات جن میں محدود پیمانے پر انتخابی نظام کو متعارف کرایا گیا۔ وہ مسلمانوں کے لئے اطمینان بخش نہ تھا۔ مزید براں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے رویے نے جن میں اردو ہندی تنازعہ اور تقسیم بنگال سرِ فہرست تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے مایوس و بدظن کر دیا۔ اور مختلف صوبوں کے مسلمانوں کو متحدہ لائحہ عمل طے کرنے کے قریب تر لا کھڑا کیا۔ تاکہ مسلم مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ جسطرح 1883ء میں البرٹ بل کی مخالفت میں ہندو متحد ہو کر کانگریس کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی مخالفت کے نتیجے میں مسلمان الگ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شملہ وفد یکم اکتوبر 1906ء نے اسکی بنیاد کیلئے مہمیز کا کام کیا۔[19] مسلم لیگ کا قیام دراصل سید احمد خاں کی "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا توسیعی عمل تھا جو لوگ اس کانفرنس کے تخیل کے بانی اور محرک تھے، انہی کی کوششوں سے مسلم لیگ معرض وجود میں آئی۔ ان میں نوجوان محمد علی سرفہرست تھے۔ مسلم لیگ کا قیام انکی سیاسی زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔

قیام مسلم لیگ کا دوسرا اہم سبب ثقافتی تھا کہ مسلمانوں کے مذہب ، تعلیم و تاریخ ، ملی ڈھانچے، تہذیبی زندگی ، رسومات ورواجات اور زبان وآدب کے تحفظ وترقی کی آزادانہ کوشش کی جا سکے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقمطراز ہیں کہ :۔

"----ثقافتی مقصد دراصل سیاسی مقاصد ہی کے تابع تھا۔ اس لیے کہ سیاسی مقصد کے حصول کے بغیر ثقافتی مقصد کی حفاظت وترقی کا خیال عملاً ایک بے معنی سی بات تھی۔"[20]

مسلم رہنماؤں کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان کی اپنی ایک نمائندہ سیاسی جماعت ہونی چاہیے جو مسلمانوں کے سیاسی وثقافتی مفادات کا تحفظ کرے اور تمام اہم مواقع پر قوم کی جانب سے اظہارِ خیال کرتی رہے۔ شملہ وفد نے متحدہ عمل کی قوت کا مظاہرہ کر کے اس عقیدے کو مستحکم کر دیا۔ اس عزم پر عمل کرتے ہوئے مسلم رہنما ڈھاکہ میں جمع ہوئے۔ وہاں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ محمد علی جو میدان سیاست میں قدم رکھ چکے تھے انہوں نے بھی مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس 30 دسمبر 1906ء منعقدہ ڈھاکہ میں شرکت کر کے یقیناً اطمینان حاصل کیا۔[21] مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس میں نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ (1884ء -1915ء) نے جو خطبہ پیش کیا وہ محمد علی نے تیار کیا تھا۔[22] جو انکی سیاسی صلاحیتوں اور انگریزی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بلا شبہ جس میں محمد علی کے ذاتی سیاسی نظریات اور جذبات کا پرتو بھی موجود تھا۔ نواب سلیم اللہ خاں نے قیام مسلم لیگ کی جو قراداد پیش کی ،اسکی تائید میں محمد علی پیش پیش تھے۔ مسلم لیگ کے دستور کی تیاری میں بھی آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد محمد علی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی سیاسی تحریک کے اہم ستون بن گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے بعد محمد علی نے گیکوار ڈآف بڑودہ سے تین ماہ (جنوری تا مارچ 1907ء) کی رخصت لے لی۔ تاکہ بحیثیت نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ کو خاص و عام میں متعارف کرائیں اور اسکے مقاصد ونصب العین سے اگاہ کریں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے صوبہ جات متحدہ کا مختصر دورہ کیا۔ انہوں نے آلہ آباد میں دو لیکچرز بعنوان :.

(1) "The Muhammadan Programme" (2) "The Present political Situation" دیئے۔[23] ان لیکچرز کا مقصد مسلم لیگ کی فعالیت اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے علاوہ اس وقت کی سیاسی صورتحال سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا تھا۔ تاکہ بحیثیت قوم وہ ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو اتحاد کیلئے کام کرنے کی نصیحت بھی کی۔

ملازمتی مصروفیات کے ساتھ محمد علی کی مسلم لیگ کے ساتھ وابستگی بھی بدستور برقرار رہی اسکے ہر سالانہ اجلاس میں ایک فعال ممبر کی حیثیت سے باقاعدہ شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کے پہلے سالانہ اجلاس 1907ء منعقدہ کراچی میں محمد علی کو مقامی ریاستوں کے گروپ کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔[24] دورانِ اجلاس مختلف امور اور مسائل پر بحث میں بھی آپ نے حصہ لیا۔ اس اجلاس کی صدارت سر آدم جی پیر بھائی نے کی تھی۔ مارچ 1908 میں علی گڑھ میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں دیگر امور کے علاوہ مسلم لیگ کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ محمد علی کو مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عامہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ آپ مسلم لیگ کے ہر سالانہ اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ دوسرے سالانہ

اجلاس 1908ء منعقدہ امرتسر میں محمد علی شریک ہوئے۔ جس میں انہوں نے ایک قرارداد کی تجویز پیش کی۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ ایک کمیشن کا تقرر کیا جائے، جو مسلم لیگ کی رکنیت، عام مقاصد اور مسلمانوں کی جبلی صلاحیتوں جو کہ نظم ونسق سے متعلق ہوں، کا جائزہ لے۔[25] مسٹر علی امام (بعد میں سر علی امام (1888ء - 1958ء) کہلائے) اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے محمد علی کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اسے سراہا۔ مسلم لیگ کا تیسرا اجلاس جنوری 1910ء بمقام دہلی غلام محمد خان شہزادہ ارکاٹ (1863ء - 1927ء) کی صدارت میں ہوا۔ اس میں محمد علی نے ایک قرارداد کی تحریک پیش کی، جسکا تعلق جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کے تحفظ و مفادات اور حقوق سے تھا۔[26] مسلم لیگ کا چوتھا سالانہ اجلاس دسمبر 1910ء ہی میں ناگپور میں منعقد ہوا۔ جسکی صدارت سید نبی اللہ نے کی۔ جس میں محمد علی نے بھرپور حصہ لیتے ہوئے اردو زبان کی حمایت میں تقریر کی۔[27] محمد علی نے اردو زبان کے بارے میں ہندوؤں کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"---یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کوئی ساہوکار سونے چاندی کے قیمتی سکے، صرف اسی خیال سے کہ ان پر عرب اور ایران کی مہر لگی ہوئی ہے، گندے نالے میں ڈال دے۔ خاص طور پر اس قوم (ہندو) کا جو کہ کفایت شعاری میں شہرت رکھتی ہو ایسا کرنا بعید ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو رہا ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے کانگریس کے حالیہ سیشن میں جو تقریر کی تھی، اس میں سنسکرت الفاظ کی ایسی بھرمار تھی کہ سامعین میں مسلمان کیا خود ہندو بھی نہ سمجھ سکے کہ مالویہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ اس وقت اردو پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور ان سے دونوں طبقوں میں نفرت کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے۔"[28]

محمد علی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ کانگریس کے ہندو لیڈروں سے بھی انکے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے اجلاس میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تقریر کے دوران کہا کہ :۔

"اس وقت جبکہ ہندو مسلم اتحاد کی راہیں نکلی ہیں۔ ہمارا کسی مسئلے پر الجھنا نقصان دہ ہوگا۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ ہندوؤں کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ مسلمان زبان کے سلسلے میں کسی طرح کا تعصب نہیں رکھتے ہیں۔"[29]

یکم مارچ 1910ء کو مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ اس کا فیصلہ مسلم لیگ کے پہلے سالانہ اجلاس میں کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس فیصلے سے پہلے محمد علی نے نواب وقار الملک کو خط لکھا تھا کہ مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڑھ سے کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ علی گڑھ کالج کے یورپین سٹاف کی وجہ سے مسلم لیگ پر سرکاری اثر و نفوذ کا خدشہ ہے۔

محمد علی نا صرف مسلمانوں کے تعلیمی و سیاسی حقوق و مفادات کے لئے کوشاں تھے۔ بلکہ انکی ثقافت و زبان، تہذیب و تمدن اور تاریخ و معاشرت کے استحکام و بقا کیلئے بھی مصروفِ عمل تھے۔ محمد علی ملی مفادات کیلئے سرگرداں تھے۔ چنانچہ جوں جوں مسلمانوں کے سماجی و معاشی اور سیاسی حالات میں ابتری آتی گئی۔ محمد علی کا رجحان سیاست کی طرف بڑھتا گیا۔ کیونکہ یہ دور جنوبی ایشیا کی تاریخ کا وہ دور تھا جب مسلمان تعلیمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ سیاسی پسماندگی کا بھی شکار تھے۔ ان

حالات میں ایسے رہنما اخبار کی ضرورت تھی جو انکے حقوق کی نگہداشت کیلئے مؤثر تشہیر کرے۔ اور مقتدر سماعتوں اور بصارتوں تک پہنچائے۔ انہیں حالات وواقعات سے آگاہ کر کے اس قابل بنائے کہ وہ اپنی شعوری طاقتوں کو کام میں لاتے ہوئے میدانِ عمل وسیاست میں آئیں۔ خصوصاً حکومتِ وقت کو مسلمانوں کے مسائل ومشکلات سے آگاہ کرنا تھا۔ تاکہ وہ سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے انکاازالہ کرے۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے محمد علی نے سیاست وصحافت کا میدان منتخب کیا۔[30]
جن حالات وواقعات نے محمد علی کے منصوبوں کا رخ بدلا۔ انہیں صحافت میں قدم رکھنے اور "کامریڈ" جاری کرنے پر مجبور کیا۔ ان کاذکر اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اس طرح کرتے ہیں کہ :۔

"منٹو مارلے اصلاحات کے سلسلے میں کونسلوں اور مقامی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں ملک بھر میں جو بحث زوروں پر تھی میں بھی اس میں برابر کا شریک تھا۔ دستوری اصلاحات عملی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اور ان اصلاحات میں مسلمانوں کے مطالبات کو کافی پذیرائی ملی تھی۔ ایسے میں میری خواہش تھی کہ مسلمانوں تک یہ بات پہنچاؤں کہ اگرچہ قومی حقوق کی خاطر ملک کی دوسری جماعتوں سے ہماری کشمکش ناگزیر ہے۔ لیکن فرقہ ورانہ مفادات اور پورے ملک کے وسیع تر مفادات آپس میں ہم آہنگ ہونے چاہیں۔"[31]

1905ء میں لارڈ کرزن کی جگہ سابق لارڈ منٹو اول (عہدہ معیاد 1807ء - 1813ء) کا پوتا منٹو ثانی (عہدہ معیاد 1905ء - 1910ء) وائسرائے ہند بنے۔ اس وقت جان مارلے وزیر ہند تھے۔ یہ دونوں آزاد خیال پارٹی کے ممبر تھے اور اسپر طرہ یہ کہ پارلیمنٹ کی باگ ڈور بھی آزاد خیال پارٹی کے ہاتھوں میں تھی۔ اسلئے انہوں نے ہندوستان میں اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا۔ وہ ملک کے انتظامی معاملات میں پختگی اور اصلاح کے لیے جمہوری اقتدار کی پرورش کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ہندوستانیوں کو حکومت کے معاملات میں زیادہ حصہ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے پیش نظر انڈین ایکٹ "منٹو مارلے اصلاحات" کے نام سے 1908ء میں پاس کیا۔ جو باقاعدہ طور پر 1909ء میں عمل میں آیا۔[32]

یہ وہ دور تھا جب محمد علی ملازمت وسیاست کو ساتھ لیکر چل رہے تھے۔ ہر حکومتی پالیسی پر انکی نظر تھی۔ لیکن ملازمتی حدود کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی سرکاری وغیر سرکاری حلقوں سے انکا برابر رابطہ تھا۔ اعلیٰ حکام سے خط وکتابت اسکاواضح ثبوت ہے۔ محمد علی نے 7 جنوری 1909ء کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکریٹری ڈینلپ سمتھ کو خط لکھا جس میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا کہ :۔

"we wished to be more generous and emphatic in the resolution of thanks----but our Punjab friends could not curb their antipathies in their relations with their Hindu fellow-countryman to approve of a more generous recognition of the wise and great reforms and the politic provisos which save them

from being abused." [33]

قیام مسلم لیگ کے چند ہی سالوں میں محمد علی نے میدانِ سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ جس کا اندازہ محمد علی کے نام ان خطوط سے ہوتا ہے۔ جو مختلف سرکاری حلقوں سے انہیں موصول ہوئے۔ مثلاً 26 فروری 1909ء کو ملک کی سیاسی حالت سے متعلق کامن روم لنکز ان ڈبلیو سی سے محمد علی کو ایک خط موصول ہوا۔ جس میں جداگانہ انتخابات اور مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی دینے سے متعلق تحریر تھا۔

" lord Minto has openly and clearly ackowledged the principle of sprateand subtantial representation to muslims." [34]

اسکے علاوہ 16 مئی 1909ء کو گورنر بمبئی نے ایک خط کے ذریعے محمد علی کو مندرجہ ذیل اطلاع دی۔

"Six seats for Muslims whereas five was asked by provincial Muslim league of Bomboy." [35]

ان خطوط میں لندن سے آئے ہوئے اور بھی خطوط ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی حالات و واقعات اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے حصول و تحفظ کے سلسلے میں محمد علی کا لندن میں مقیم لیڈروں اور سیاسی حلقوں سے مسلسل رابطہ تھا۔

محمد علی بڑودہ میں ملازم تھے کہ انگریزی گورنمنٹ کے ایک سابق اعلیٰ عہدہ دار، ملک کے مشہور و معروف مصنف، ادیب اور سیاسی مورخ مسٹر دت رکن حکومت مقرر ہو کر یورپ سے بڑودہ آئے۔ ایک دفعہ دورانِ گفتگو محمد علی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کے بارے میں تذکرہ چھڑ گیا۔ تو مسٹر دت نے کوتاہ نظری، تعصب و جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اورنگ زیب کے ظلم و ستم اور تعصب کے افسانے گنوانے شروع کر دیئے۔ محمد علی (علامہ شبلی کے "مضامین عالمگیر" کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے) کو یارائے ضبط نہ رہا اور مسٹر دت سے الجھ پڑے۔ بحث کی تلخی کے بعد مسٹر دت کی کدورت اور محمد علی کی ملازمت سے بددلی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جسکا اظہار انہوں نے 14 جنوری 1910ء کو میر محفوظ علی (1870ء - 1943ء) کے نام ایک خط میں اسطرح کیا ہے کہ :۔

" تمہارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے باتفاقِ رائے فیصلہ کیا کہ افیون کی کاشت میں کمی کے مسٹر محمد علی کسی طرح جوابدہ نہیں ہیں۔ اسکے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی۔ ٹالم ٹالا ہوتی رہی۔ اس عرصے میں مسٹر---- (رکن حکومت مسٹر دت) کا نزول ہوا۔ او نگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ، انکی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی۔ اسلئے مجھے کوئی جواب نہ ملا---- کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ سوائے اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں جس کی وجہ سے مختلف مذاہب و اقوام میں مخالفت پیدا ہو---- ریاست سے سخت بیزار ہوں---- نوکری سے بیزار ہوں۔" [36]

ان حالات کی وجہ سے محمد علی ملازمت سے اسقدر بیزار ہو چکے تھے کہ انہوں نے دو سال کی رخصت لے لی اور اسکے بعد استعفیٰ دے دیا۔ محمد علی کے ملازمت ترک کرنے کی ایک وجہ تو یقیناً یہ تھی۔ کہ درخواستیں دینے کے باوجود انکو منصب میں جائز ترقی نہیں دی گئی تھی۔ حالانکہ یہ انکا حق تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر استعفیٰ دینے کا سبب محمد علی کے وہ مضامین تھے جو انہوں نے "ٹائمز آف انڈیا" میں لکھے۔ جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پرداخت کی گئی تھی۔ لیکن ان سے گوکھلے کی مسلم دشمنی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جہاں تک مسٹر گوکھلے کا تعلق ہے وہ ایک اعتدال پسند لیڈر تھے۔ محمد علی تعلیمی سرگرمیوں اور دیگر سماجی کاموں کے سلسلے میں انکے مداح تھے۔ انہوں نے 1907ء میں مسٹر گوکھلے کو "ہندوستانی تعلیم کی اہمیت وضرورت" پر لیکچر دینے کیلئے علی گڑھ میں خصوصی دعوت دی تھی۔[37] لیکن مسٹر گوکھلے بنیادی طور پر ہندو تھے اور سیاسی مقاصد و مفادات میں ہندوؤں کی وکالت کرتے تھے۔ اس نقطہ پر محمد علی کا مسٹر گوکھلے سے اختلاف تھا۔ یہ چیز افسرانِ بالا کو ناگوار محسوس ہوئی۔ انہوں نے محمد علی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ ان حالات سے بددل ہو کر محمد علی نے اپنی توجہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف مبذول کر دی اور سرکاری ملازمت سے مستقلاً الگ ہو گئے۔ بڑودہ میں ملازمت کے دوران انہیں ریاست بھوپال میں چیف سیکریٹری اور ریاست جاورہ میں وزارت کی پرکشش پیشکش ہوئی۔ لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[38] انکا بیقرار دل تو ملک و قوم کی خدمت کیلئے تڑپ رہا تھا۔ محمد علی پابندیوں میں مزید جکڑے رہنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے آزاد پیشہ صحافت کو پسند کیا۔ صحافت میں یہ پہلا قدم تجربات کا ایک میدان تھا، جو کٹھن بھی تھا اور دشوار بھی۔ اگرچہ محمد علی ایک مردِ آہن تھے۔ لیکن پھر بھی انکے لئے یہ دشوار مرحلہ تھا۔ جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ :۔

> "کلکتہ سے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار نکال کر میں صحافت میں آ گیا۔ یہ نئی راہ ایک حد تک کافی سنگین تھی۔"[39]

Mr. Francis Robinson نے محمد علی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مفاد پرست، لالچی اور پیشہ ور سیاستدان تھے۔ انہوں نے والئی ریاست بڑودہ سے اپنی اعلیٰ ترقی اور کثیر تنخواہ کا تقاضا کیا۔ جب محمد علی کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوا تو انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔[40] لیکن ان الزامات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی کی خواہش و کوشش محمد علی کا بنیادی حق تھا۔ ہر انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ اسلئے شب و روز محنت کرتا ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کما کر خوشحالی و آسودگی کی زندگی بسر کرے۔ محمد علی جو نہایت محنت، خلوص اور دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ یقیناً اس وجہ سے کہ اپنے خاندان کو معاشی پریشانیوں سے چھٹکارا دلا کر خوشحالی سے ہمکنار کر سکیں۔ اگر انہوں نے گیکوارڈ آف بڑودہ سے ترقی کا تقاضا کیا تو یہ غلط نہ تھا۔ محمد علی کی اعلیٰ کارکردگی کے پیشِ نظر انکا جائز مطالبہ ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے تھا۔ اسکے باوجود حاکم بڑودہ کا محمد علی کو ملازمت میں ترقی نہ دینا زیادتی تھی۔ انہی دنوں محمد علی کو ریاست جاورہ اور ریاست بھوپال کی طرف سے پرکشش ملازمتوں کی پیشکش کی گئی۔ لیکن انہوں نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔ بقول محمد علی :۔

> "میں ریاست بڑودہ ہی کی ملازمت میں تھا کہ مجھے دو اور ریاستوں کی پیش کش کو جو

بڑودہ کے عہدہ سے زیادہ ذمہ داریوں کی حامل تھی مسترد کرنا پڑا--- میں نے اس
آخری ریاست (جاورہ) کی پیش کش کے لمبے چوڑے تار کو جس میں مجھے وزارت
کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس وقت تک نہ کھولا جب تک "کامریڈ" کا پہلا پرچہ چھپ
کر بکنے کیلئے کلکتہ کے بازاروں میں نہیں پہنچ گیا۔ کیونکہ مجھے یہ شک تھا کہ یہ اُن کھلا
تار اس نوجوان والئی ریاست کا ہوگا۔ جسکی بااصرار پیش کش کی سر مائیکل اڈوائر
جیسا آدمی بڑے زوروں سے تائید کر رہا تھا۔ اور میں اس آخری لمحے میں اس قسم
کی ترغیبات سے بچنا چاہتا تھا۔"[41]

اگر محمد علی کا مقصد حیات صرف اور صرف روپیہ کمانا ہوتا تو وہ ان میں سے کسی ایک ریاست کی پیشکش کو قبول کر کے روپیہ کمانے کی خواہش پوری کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ محمد علی کا یہ طرز عمل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ نمود و نمائش کے خواہش مند، ابن الوقت، مفاد پرست یا لالچی آدمی ہرگز نہیں تھے۔ انہوں نے تو اپنے دل میں موجزن جذبہ حب القوم کی تسکین کیلئے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ بقول محمد علی

"صحافت کی نئی راہ اختیار کر کے مجھے یقینی گو بہت زیادہ نہ سہی، آمدنی اور مستقبل
ترقی کے تمام مواقع سے دست بردار ہونا پڑا اور میں نے ایک جواری کی طرح وہ
تمام روپیہ جو میں کہیں سے بھی اکٹھا کر سکا داؤ پر لگا دیا۔"[42]

محمد علی نے تو اپنا طبعی شوق و میلان درس و تدریس بھی ملک و قوم کی نذر کر دیا۔ جسکا اندازہ محمد علی کے درج ذیل الفاظ سے ہوتا ہے کہ :۔

"اگر میں اپنے شوقِ طبعی کے مطابق ہی چلتا رہتا تو میں ریاست رامپور کے
محکمہ تعلیم کے عام انتظام و انصرام اور اسکے ہائی اسکول میں درس دینے کو کبھی نہ
چھوڑتا۔ لیکن کیا کروں ملک و ملت کی حالت دیکھتا ہوں تو متعدد ایسے کام نظر آتے
ہیں کہ ان میں مشغول و مصروف ہونا ہی پڑتا ہے--- زفرق تابقدم ہر کجا کہ می
نگرم-- کرشمہ دامن دل می کنند کہ جا ایں جاست اس کشش نے مجھے 1910ء
میں مجبور کیا کہ ریاست بڑودہ کی ملازمت ترک کروں۔ ریاست بھوپال اور جاورہ
میں جو عہدے ملتے تھے انکو بھی قبول نہ کروں۔ بلکہ دارالحکومت کلکتہ جا کر کامریڈ
نکالوں۔"[43]

یہ وہ وقت تھا جب مسلمانانِ ہند مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود اپنی غلامانہ زندگی سے تنگ آکر سیاسی ارتقاء کی جانب رخ کر چکے تھے۔ اور ہندوستان اقتصادی اور سیاسی کشمکش کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ اسلئے محمد علی نے اپنی توجہ اس جانب مبذول کی۔ انکی نگاہ حکومت کے طرز عمل پر ناقدانہ پڑتی تھی۔ انکا خیال تھا کہ آبائی اور ذاتی وفاداری کے زیر اثر حکومت سے قریب رہ کر اس کے موجودہ طرز عمل میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ اسلئے فیصلہ کیا کہ "کامریڈ" کے نام سے کلکتہ سے جو اس وقت حکومتِ ہند کا مرکز تھا، ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار جاری کیا جائے۔ جس میں آئینی طور پر مطالبات پیش کئے

جائیں۔ چنانچہ بڑودہ سے دوسال کی رخصت لیکر کلکتہ چلے گئے۔ اور 14 جنوری 1911ء کو کلکتہ سے "کامریڈ" جاری کیا۔[44]
یہ ایک صلح کل، اتحاد بین الاقوام کا داعی، وطنی اختلاف کا دشمن، حکومت کا مؤید، مگر سیاسی وانتظامی کمزوریوں پر آزادانہ نکتہ چینی کرنے والا اخبار تھا۔ "کامریڈ" کا ایک مقصد تو مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا برملا اظہار اور انکے جذبات واحساسات کی ترجمانی تھا۔ دوسرا مقصد مسلم دنیا کے حالات سے برصغیر کے مسلمانوں کو آگاہ کرنا تھا۔[45] تاکہ انہیں ایک دوسرے کا احساس ہو۔ اس مقصد کی تہہ میں محمد علی کا جذبہ پان اسلام ازم پوشیدہ تھا۔ کیونکہ مختلف مغربی طاقتیں جن میں انگریز سرفہرست تھے، مسلم ممالک کو شطرنج کی بساط بنائے ہوئے تھے۔ سرزمینِ عرب، ترکی، اردن، افغانستان اور ایران وغیرہ سبھی زد میں تھے۔ ان ریشہ دوانیوں میں روس اور بلغاریہ بھی اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔[46]

محمد علی مکمل توانائیوں کے ساتھ میدان سیاست و صحافت میں آچکے تھے۔ مسلم لیگ کا پانچواں سالانہ اجلاس 3مارچ 1912ء کو نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ کی صدارت میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا۔ اس میں محمد علی نے تنسیخ بنگال پر مسلمانوں کی مایوسی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک قرارداد کی تجویز پیش کی۔ جس میں حکومت سے امید کی گئی تھی کہ وہ بنگال کے مسلمانوں کے تحفظ و مفادات کے بارے میں جلد از جلد کوئی قدم اٹھائے۔[47] مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں کی روئیدادیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ محمد علی نے ان اجلاسوں میں نہ صرف قراردادوں کی حمایت کی تھی۔ بلکہ بعض قراردادیں انکی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔ محمد علی مختلف محاذوں پر مسلمانوں کے حقوق کے حصول کیلئے کوشاں تھے۔ ہندوؤں نے اردو کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی تھی۔ وہ اس سے بھی لاتعلق نہ تھے۔ محمد علی نے 27 جولائی 1912 کے "کامریڈ" میں اردو ہندی کے مسئلے پر ایک طویل مقالہ لکھا کہ :۔

> "اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ہندو بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا ایثار یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں ترکی، فارسی، اور اپنی مذہبی زبان عربی کو چھوڑ کر ہندوؤں کی خاطر مقامی زبان اردو کو اپنالیا۔ اردو برصغیر کی مشترکہ زبان ہے۔ اور ہندوؤں کا اسکے خلاف احتجاج ملک کیلئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف باتیں نہیں بلکہ اردو کی ترقی اور ترویج کیلئے عملاً کچھ کیا جائے۔ اس کی علمی و ادبی حیثیت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ ناگری اور ہندی کا طوفان اٹھانے والے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔"[48]

مسلم لیگ جو ابھی تک صحیح معنوں میں عوامی حیثیت اختیار نہ کر سکی تھی۔ یہ امراؤ شرفاء کی جماعت خیال کی جاتی تھی اور زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ اس سے متاثر تھے۔ عوام میں اسکی جڑیں گہری نہ تھیں۔ لیکن طرابلس وبلقان کی جنگوں، ترکی پر روز افزوں دباؤ اور دھمکیوں کو مسلم لیگی محمد علی نے جس جرأتمندی سے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے عوام کے سامنے عیاں کیا اور مستقبل کے منفی نتائج سے اگاہ کیا۔ اس سے عوام کا اعتماد مسلم لیگ کے لیے بڑھا اور انہوں نے محسوس کیا کہ انکے لیڈروں کا مؤقف صحیح ہے۔ جس سے مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ ابتدائی زمانے میں مسلم لیگ صرف عام انتظامی امور اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام سرانجام دیتی تھی۔ جب بنگال کی تقسیم منسوخ

ہوئی اور نواب وقار الملک (1841ء - 1917ء) خلدِ آشیاں میدان سیاست میں نکل آئے تو محمد علی انکے دست راست تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ سر میاں محمد شفیع (1869ء-1932ء) تک یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ مسلم لیگ کا نصب العین "کامل خود اختیاری" ہونا چاہیے۔ 31 دسمبر 1912ء کو کونسل مسلم لیگ کا اجلاس سر آغا خان کی صدارت میں بمقام لکھنؤ ہوا۔ جہاں مسلم لیگ کے دستور میں ترمیم کا فیصلہ کیا گیا۔ کہ اب مسلم لیگ کا مقصد برصغیر کے لیے حسبِ حال حکومتِ خود اختیاری کا حصول ہے۔ دستور میں ترمیم کے سلسلے میں محمد علی نے ایک طویل مضمون بعنوان "The Creed of the Muslim League" لکھا۔ جو 7 جنوری 1913ء کو "کامریڈ" میں شائع ہوا۔ جس میں مسلم لیگ کے مقاصد میں اس نمایاں تبدیلی کو سراہا گیا۔ جب مارچ 1913ء مسلم لیگ کے چھٹے سالانہ اجلاس میں ترمیم کی توثیق کی گئی۔ تو محمد علی نے اس میں بھر پور کردار ادا کیا۔[49] بہر حال مسلم لیگ کے دستور میں اس ترمیم کیلئے محمد علی جناح (1876ء - 1948ء) کے ساتھ محمد علی جوہر کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلم لیگ کو نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مقبول کرانے، مضبوط بنانے، اظہارِ وفاداری کی بجائے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کرنے اور جدو جہد کی راہ پر گامزن کرنے میں محمد علی کا قابل قدر حصہ ہے تو بے جانہ ہوگا۔

23 مارچ 1913 کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس میاں محمد شفیع کی صدارت میں ہوا۔[50] جس میں محمد علی نے ہندوستان سے باہر بسنے والے مسلمانوں کی صورتحال اور ترکوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ترکوں نے طرابلس و بلقان میں نام نہاد مہذب قوموں کے خلاف جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ اگر ترکوں میں پھوٹ نہ پڑی ہوتی تو طرابلس و بلقان کی جنگوں کے نتائج کچھ اور ہوتے۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں میں اتحاد برقرار رکھنے پر زور دیا۔ انہوں نے سماجی امن کی بھی اپیل کی۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ کیونکہ صرف اسی حالت میں ہندوستان کو Self Rule حاصل ہو سکتا تھا۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی اس دعوت کا مثبت جواب دیا۔ کٹر اور فرقہ پرست ہندو لیڈر جو اسلامی تحریک کے شدید مخالف تھے۔ اس مفاہمانہ فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے ترکوں کی حمایت میں ہونے والے اجلاسوں میں بھی شرکت کی۔ بقول ہندو لیڈر بپن چندرپال

> " یہ ایک انسانی مسئلہ ہے اور ترکوں کی شکست کا مطلب تہذیب و تمدن کی ناکامی و نامرادی ہے۔ دولتِ عثمانیہ کی بنیاد مذہبی اور نسلی رواداری پر رکھی گئی تھی۔ اور اسکے زیر اثر ممالک اور علاقوں میں مختلف قومیں امن و آشتی کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ایک ایسی سلطنت اور نظام حکومت کے خاتمے سے محبت و رواداری کی ایک درخشاں مثال بھی ختم ہو جائے گی۔"[51]

1914ء میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ 1915ء میں محمد علی "کامریڈ" کے مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کی وجہ سے نظر بند کر دیئے گئے۔ اسلئے مسلم لیگ کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر 1915ء بمقام بمبئی شریک نہ ہو سکے۔ غیر حاضری کے باوجود آپکو اس اجلاس میں مسلم لیگ کی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔[52] مسلم لیگ کے نویں سالانہ اجلاس 1916ء منعقدہ لکھنؤ (بصدارت محمد علی جناح) میں بھی محمد علی نظر بند ہونے کی وجہ شریک نہ ہو سکے۔

1917ء میں مسلم لیگ کے دسویں سالانہ اجلاس کی صدارت کیلئے محمد علی کا نام تجویز کیا گیا۔ لیکن آپ رہا نہ ہوئے تھے۔ اسلئے عدم موجودگی میں آپکی تصویر کرسیِ صدارت پر رکھی گئی اور راجہ صاحب محمود آباد نے صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ راجہ صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں محمد علی کی خدمات کو سراہا اور حکومت سے انکی رہائی کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ کا گیارہواں سالانہ اجلاس دسمبر 1918ء کو دہلی میں اے۔ کے۔ فضل الحق (1873ء-1962ء) کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں بھی محمد علی نظربند ہونے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اس اجلاس میں بھی بذریعہ قرارداد حکومت سے آپکی رہائی کا مطالبہ کیا۔[53] دسمبر 1919ء میں مسلم لیگ کا بارہواں سالانہ اجلاس امرتسر میں حکیم اجمل خان (1863ء-1927ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محمد علی بیتول جیل سے رہائی کے بعد عوام و خواص کی دعوت پر سیدھے امرتسر میں پہنچے اور مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی۔ آپ کی اجلاس میں آمد سے پہلے مختلف امور اور مسائل سے متعلق قرادادیں زیرِ بحث تھیں۔ ان پر بحث ملتوی کر دی گئی اور محمد علی سے خطاب کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے دورانِ تقریر حقِ خطابت ادا کر دیا۔[54]

جنگِ طرابلس 1911ء

افریقہ کی ساحلی ریاستیں جو کسی زمانے میں سلطنت ترکی کے قبضے میں تھیں۔ آہستہ آہستہ خود مختار ہوتی گئیں۔ یہ ریاستیں نوآبادیات اور تجارتی منڈیوں کی حیثیت سے مغربی ممالک کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ انکی گرسنہ نگاہیں مسلمان ملکوں کی شہ رگ پر جمی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ نے مصر پر اور فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ 1904ء کے معاہدہ کی رو سے انگلستان کا مصر پر قبضہ بلا شرکتِ غیر تسلیم کر لیا گیا اور مراکش کی آزاد حکومت پر قبضہ کرنے کیلئے برطانیہ نے فرانس کی مدد و تعاون منظور کر لیا۔[55] یہ آزاد اور خود مختار ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بڑی طاقتیں کر رہی تھیں اسلئے جائز اور صحیح تھا۔ مزید ستم یہ کہ 1910ء میں اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں پوری دنیا کی عیسائی مشنریوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسمیں خصوصاً یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں اسلام نے جو رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ انکا سدباب کسطرح کیا جائے۔[56] سوچ بچار کے بعد کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ پادریوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اسلامی تاریخ، عربی زبان اور اسلامی روایات سے واقفیت حاصل کرے اور پھر مسلمانوں میں گھل مل کر انہیں گمراہ کیا جائے۔

دوسری طرف جب برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈورڈ گرے کو علم ہوا کہ ترکی کے سابق وزیر سعید پاشا طرابلس کی بندرگاہ طبروق بحری اڈے کے طور پر جرمنی کو ٹھیکے پر دینا چاہتے ہیں تو وہ اس خبر سے سخت پریشان ہوئے۔ اور منصوبہ بنایا کہ جرمنی کے حلقہ اثر میں جانے سے بہتر ہے کہ اٹلی اس پر دھاوا بول دے۔ لہذا برطانیہ نے اٹلی کو طرابلس پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ اسکے بعد لارڈ کچنر کو مصر بھیجا تاکہ وہ مصر کو وعدہ کے مطابق غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کرے۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برطانیہ کے اس عمل سے افریقہ میں ترکوں کو خشکی کی جانب سے کوئی مدد نہ مل سکے۔

دولِ یورپ اور عیسائیوں کی یہ تمام سازشیں اور تدابیر اسلام کے پرستاروں کو کمزور کرنے بلکہ نیست و نابود کرنے کی مذموم کوشش تھی۔ انہی عزائم کے پیش نظر اٹلی کئی سالوں سے اس کوشش میں مصروف تھا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ اس نے 1911ء میں طرابلس پر حملہ کردیا۔ طرابلس سلطنتِ ترکیہ کا دور افتادہ علاقہ تھا۔ اسی وجہ سے اسکی حفاظت اور مدافعت ترکی کیلئے خاصی دشوار تھی۔ طرابلس کے مسلمانوں پر جب اٹلی نے مظالم کی انتہا کردی[57] تو احتجاجاً "کامریڈ" میں محمد علی نے اس حادثے پر مضامین لکھ کر حقیقت حال سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ جس سے ان میں شدید جوش پیدا ہوا۔

محمد علی نے اپنے اخبار "کامریڈ" میں 7 اکتوبر 1911ء کو ایک زوردار اداریہ لکھا جسکا موضوع "لیبیا کے شہر طرابلس پر اٹلی کا سفاکانہ حملہ" تھا۔ لیبیا اس وقت سلطنت ترکی کا ایک حصہ تھا۔[58] محمد علی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ یورپ، مسلمان ممالک کی ترقی پسند تحریکوں کو ختم کرنے کیلئے ان پر انتہاپسندی اور خود مختاری کی تحریک کا الزام عائد کرتا ہے۔ یہ انکا طریقۂ واردات ہے۔ بڑی طاقتیں کسی بھی مسلم ملک کو اپنے زیر تسلط لانے سے پہلے اس قسم کا پروپیگنڈہ شروع کردیتی ہیں۔ کہ اس ملک میں مذہبی رجعت پسندوں کا زور بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ ایک عیسائی ملک اٹلی نے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے سلسلے میں اپنی ہوس پوری کرنے کیلئے ایک مسلمان ملک پر حملہ کردیا ہے۔ اور یورپ جسے انصاف پسند اور حریت و آزادی کا محافظ ہونے کا بڑا دعویٰ ہے، ٹس سے مس نہیں ہوا۔ درحقیقت یہ اسی کی لگائی ہوئی آگ ہے جسے وہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ یہ دو عملی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہی تہذیب و تمدن ارتقاء ہے؟ اصل میں اتحادیوں نے ترکی کے خلاف ایک جدید صلیبی جنگ کا آغاز کردیا ہے۔ جب 1897ء کی ترک، یونان جنگ میں ترک فوجیں ایتھنز کے نواح میں پہنچیں تو ایک طوفان برپا ہوگیا اور سارا یورپ ترکی کے خلاف صف آراء ہوگیا۔ لیکن جب آسٹریا نے سلطنت ترکی کے علاقوں بوسنیا (Bosnia) اور ہرسک (Herzegvina) پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تو یورپ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ مزید یہ کہ اتحادیوں کا مقصد اسلام کی عظمت و وقار کو ملیامیٹ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ محمد علی نے "کامریڈ" میں اعلان کیا کہ :۔

> "ترکی کی سیاسی طاقت میں کمی ہوتی ہو تو ہو۔ لیکن اسکے وقار کو ذرا برابر نقصان نہیں پہنچا۔ ایک ایسی قوم جس نے سلطان محمد فاتح اور سلطان سلمان اول جیسے حکمران پیدا کئے اور جنھوں نے دنیا کی عظیم سلطنتوں میں سے ایک کو قائم کیا۔ یقیناً وہ عزت کے ساتھ مرنا بھی جانتی ہے۔"[59]

محمد علی کے مجاہدانہ قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کی بازگشت مسلمانانِ ہند کے دیگر اخبارات، رسائل اور جرائد میں بھی سنائی دینے لگی۔ اسلامی جذبات بھڑکنے لگے اور مغرب کے خلاف ایک طاقتور فضا قائم ہونے لگی۔ برطانیہ کے مسلم ممالک کے خلاف رویے سے محمد علی کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ انہیں مجبوراً حکومت کے بارے میں اپنا رویہ شدید کرنا پڑا۔ انہوں نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ نے مسلم ممالک بالخصوص سلطنت ترکی کی حمایت کی پالیسی ترک کردی ہے۔ اور عیسائی ملکوں کے خفیہ اتحاد میں شریک ہوگیا ہے۔ جس کا مقصد اسلام کی بیخ کنی، مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا، ترکی کی

آزادی و خود مختاری کو سلب کرنا اور مسلم ممالک کو غلام بنانا ہے۔[60] محمد علی کی تحریروں نے مسلمانانِ ہند کو بیدار کر دیا۔ اس سلسلے میں دیگر اخبارات نے بھی محمد علی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ محمد علی نے "کامریڈ" میں مزید لکھا کہ مسلمانانِ ہند ترکی کے دفاع کیلئے فوج تو نہیں بھیج سکتے۔ لیکن کم از کم جنگ میں اسکو پہنچنے والے نقصانات کا ازالہ کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ لہذا بلا تاخیر ایک امدادی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس نے ترکی کیلئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ محمد علی نے "کامریڈ" میں چندے کی اسقدر پر اثر اپیلیں کیں کہ کامریڈ کے دفتر میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔[61] چندے کے ذریعے جمع کی جانے والی رقوم کا زیادہ تر حصہ طرابلس کے شہیدوں کے اہل خانہ کیلئے مختص تھا۔ اس سلسلے میں ہلال احمر کی تنظیم نے بھی انتہائی مؤثر کردار ادا کیا۔ جمع شدہ رقوم ترکی کی ہلال احمر تنظیم کے حوالے کر دی گئیں۔ محمد علی نے امدادی مہم آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بھی شروع کر دی۔ مسلم لیگ کی مرکزی تنظیم کے علاوہ ساری صوبائی اور ضلعی تنظیموں نے برطانوی وزارت داخلہ کو مراسلے بھیج کر اٹلی کی جارحانہ کاروائی کی مذمت کی۔ اور اٹلی کو اس سے باز رکھنے کی درخواستیں کیں۔[62] لیکن برطانیہ نے اٹلی کے اس جارحانہ اقدام سے چشم پوشی کی اور اپنی نام نہاد غیر جانبداری کو برقرار رکھا۔ جس سے مسلمانوں کے غم و غصہ میں اضافہ ہوا۔ برطانیہ کے اس طرزِ عمل نے محمد علی کو میدانِ سیاست اور پان اسلامزم کے سلسلے میں مزید متحرک کر دیا۔ انہوں نے انگریزوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا اور مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکنے کے لیئے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے افسران حتی کہ وائسرائے تک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔[63]

جنگِ بلقان 1912ء

طرابلس پر اٹلی کے حملے کے بعد بلقانی ریاستوں نے بھی اپنے ناپاک اور ہوس پرستانہ عزائم کی تکمیل کیلئے متحد ہو کر ترکی پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔[64] روس کا سابق وزیر خارجہ اور اس وقت کا روسی سفیر مقیم فرانس اسوولسکی باسفورس پر قبضے کی تجویز پر غور کر رہا تھا کہ اسکی "عقلِ شیطانی" میں ایک تجویز آئی۔ بقول خالدہ ادیب خانم :-

> "(اس نے) مارچ 1912ء میں سرویا اور بلغاریہ میں ترکی کے خلاف ایک خفیہ معاہدہ پر دستخط کرا دیئے۔"[65]

اس کے فوراً بعد روس ہی کی وساطت سے مئی 1912ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان معاہدہ ہوا۔ ستمبر 1912ء میں ایک تیسرا معاہدہ سرویا اور مونٹی نیگرو کے مابین ہوا۔ اسطرح اسوولسکی نے ابنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کی راہ ہموار کرنے کیلئے بلقانی ریاستوں کا اتحاد کرا دیا۔[66]

برطانیہ اور دیگر بڑی طاقتوں کی ان ریشہ دوانیوں، من مانی کاروائیوں اور چیرہ دستیوں نے مسلمانانِ ہند میں اضطرابی کیفیت پیدا کر دی۔ بڑی طاقتیں یہ سب کچھ اسلام دشمنی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے کر رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسلامی ممالک متحد و منضبط ہوں اور مستحکم اسلامی مرکز قائم ہو۔ پہلے انہوں نے فرداً فرداً ان ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے انہیں بالکل کمزور کر دیا اور پھر ان پر اپنا غاصبانہ تسلط قائم کر لیا۔ اس زمانے میں محمد علی ہندوستان کی داخلی سیاست اور مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کے سلسلے میں کوشاں تھے۔ ان حالات نے محمد علی کی توجہ خارجی

معاملات پر بھی مرکوز کردی۔ بڑی طاقتوں کی زیادتیوں نے انہیں سرگرم عمل کر دیا کہ وہ اسلامی ممالک کے اتحاد کیلئے کام کریں۔ محمد علی نے مسلمانانِ عالم کو ایک مخصوص اور متعین مقصد یعنی اپنی سیاسی قوت کو یکجا کرنے پر زور دیا۔ انکی رائے تھی کہ جہاں تک مراکش، طرابلس، ایران اور مقدونیہ وغیرہ کیساتھ جارحیت کا تعلق ہے "پان اسلام ازم" اس سلسلے میں مفید اور کارآمد خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔[67]

محمد علی کی کوششوں اور جدوجہد کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مسلمانانِ ہند نے اپنے مسلمان بھائیوں خصوصاً ترکوں کی مالی اور اخلاقی امداد کی۔ نیز عوام اور اخبارات کی آواز نے بھی اس سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انگریز حکومت عالم اسلام کی اس ہم آہنگی، احساس اور روابط کو کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ انہوں نے بیداری کی اس تحریک کا ذمہ دار محمد علی کو ٹھہرایا اور انکے کے کام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ محمد علی ہراساں ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا۔ جس وجہ سے حکومت کی نظروں میں معتوب و مغضوب ہوئے۔[68] محمد علی نے مسلمانوں کے مسائل کو علاقائی بنیادوں پر پیش نہیں کیا۔ بلکہ "کامریڈ" کے ذریعے اسے عالم اسلام کے مسائل و مقاصد بنا کر پیش کرنا چاہا۔ تاکہ استحصالی طاقتوں کو اندازہ ہو سکے کہ وہ جہاں کہیں مسلم مفاد کو متاثر کر رہے ہیں۔ وہاں "تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" کے مصداق اس سے عالمی بنیادوں پر اثر قبول کر رہے ہیں۔

محمد علی مسلمانوں کو انکے جائز حقوق دلوانے کیلئے "کامریڈ" کے ساتھ میدان عمل میں آئے تھے۔ انکے سامنے حقوق کی طلبی کا مقصد مقدم تھا۔ اسلئے حکومتِ وقت سے الجھنا منظور نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں "کامریڈ" اعلیٰ سرکاری حلقوں میں بڑا مقبول رہا۔ لیکن "کامریڈ" کا یہ "تقرب سلطانی" بڑا عارضی ثابت ہوا۔ اسکے اسباب خارجی و داخلی دونوں تھے۔ خارجی اسباب میں طرابلس و بلقان کی جنگیں سرفہرست ہیں۔ جن میں برطانیہ نے نا صرف مسلم ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ بلکہ طرابلس کے مقابلے میں بالواسطہ اٹلی کی مدد کی۔[69] محمد علی انگریزوں کی یہ جانبدارانہ پالیسی برداشت نہ کر سکے۔ اور "کامریڈ" میں انہیں نشانۂ تنقید بنایا۔ بلقان کی جنگ میں بھی برطانیہ نے جو کسی زمانے میں ترکوں کا حلیف اور دوست تھا اب روس اور بلقانی ریاستوں کے ساتھ ملکر یورپ کے اس مردِ بیمار کی لاش نوچنا شروع کر دی۔ اسی زمانے میں ایران اور مراکش پر بھی مصائب کی یلغار ہوئی۔[70] ان ہولناک واقعات سے ہندوستانی مسلمانوں میں شدید اشتعال پیدا ہوا، اور انکی عالمِ اسلام سے مذہبی ہمدردی ملک کے اندر انگریز دشمنی میں تبدیل ہونے لگی۔ ان واقعات کا "کامریڈ" کے ایڈیٹر محمد علی پر جو اثر ہوا اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

> "1911ء کے موسم خزاں میں طرابلس پر اٹلی کی شرمناک رہزنی نے بین الاقوامی اخلاق کا جسطرح جنازہ نکالا۔ اس غم انگیز انکشاف نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ لیکن تقدیر نے 1912ء میں اس سے بھی زیادہ اندوہناک واقعہ کا ہونا لکھا تھا۔ یہ وہ سال تھا جس میں میں حکومت ہند کے ساتھ کلکتہ سے منتقل ہو کر دہلی آگیا۔ بلقان کی پُر مصائب جنگ کے دوران ایک وقت میں شدت جذبات سے اتنا بے قابو ہو گیا تھا کہ آج میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا

> سوچا۔ جب خبر رساں ایجنسی کا آخری پیغام جو مجھ تک پہنچا تھا کہ بلغاریہ کی افواج قسطنطنیہ سے فقط پچیس (25) میل دور رہ گئی تھیں۔ اس شہر کا نام چار صدیوں سے ہر مسلمان کیلئے مقدس اور امیدوں کا مرکز رہا تھا---"[71]

درج بالا اقتباس سے محمد علی کے جذبۂ اخوت اسلامی کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ عالم اسلام کیلئے گہری تڑپ رکھتے تھے۔ اس سے انکی شدت و محبت اور جذباتیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے انتہائی قدم خودکشی کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ سقوطِ قسطنطنیہ کا جانکاہ حادثہ انکے لئے ناقابل برداشت تھا۔ انسان جب شدید مایوس اور دل برداشتہ ہو جاتا ہے تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ ہٹلر (1869ء-1932ء) کی مثال لے لیں جب تک مسلسل کامیابیوں نے اس کے قدم چومے تو اس کا ہمت وحوصلہ بلند رہا۔ لیکن جب قدرت نے ناکامیوں کی طرف دھکیلا تو اس قدر مایوس اور دل برداشتہ ہوا کہ اس نے 1945ء میں جنگ برلن کے موقعہ پر خودکشی کرلی۔ اگرچہ محمد علی کا خودکشی کا فیصلہ انتہائی جذباتی اور غیر اسلامی تھا۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ انہیں عالم اسلام کے ساتھ وارفتگی کی حد تک محبت تھی۔ اور اسکے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جاہ پرستی، نمود و نمائش اور پیشہ وارانہ سیاست کے لیے میدانِ عمل میں آئے، انتہائی زیادتی ہے۔

تنسیخِ تقسیمِ بنگال 1911ء

عالم اسلام پر قیامت برپا تھی کہ ہندوستان میں بنگالی ہندوؤں کی وحشت پسندانہ جدوجہد نے انگریز حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ بنگال کی تقسیم کو منسوخ کر دے۔ حکومت تقسیم بنگال کو طے شدہ حقیقت (Settled Fact) قرار دے چکی تھی۔[72] لیکن ہندوؤں کی ایجی ٹیشن کے سامنے جھک گئی۔ اور 1911ء میں دربارِ دہلی کے موقعہ پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ ہندو اپنی متعصبانہ پالیسی میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں کو محرومی کی طرف دھکیلنے پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے قرآن پاک نے فرمایا ہے کہ :-

اِنْ تَمسسکم حَسَنَہ تسؤھم وان تصبکم سیۃ یفرحوا بھا وان تصبروا و تتقوا لایضر کم کیدھم شیا ان اللہ بما تعملون محیط ٥

ترجمہ : جب تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو انکے لئے موجبِ رنج والم ہوتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم استقلال و تقویٰ اختیار کئے رکھو تو انکی تدبیریں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ انکے اعمال پر احاطہ رکھتے ہیں۔ (8-120)

تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمانوں کی جو تذلیل اور دل شکنی ہوئی اور حکومت سے مسلسل وفاداری کا انہیں جو صلہ ملا۔ اس نے مسلمانوں کو خود اختیاری کی ڈگر پر ڈال دیا۔ محمد علی نے "کامریڈ" کے ذریعے ہندوستان کی اسلامی سیاست میں واقعی انقلاب پیدا کر دیا۔[73] انہوں نے تنسیخ بنگال پر شدید نکتہ چینی کی جس سے وہ حکومت برطانیہ اور ہندو دونوں میں

غیر مقبول ہو گئے۔ لیکن انہیں اسکی پرواہ نہ تھی۔ سرکاری حلقوں اور ہندوؤں میں اپنے آپ کو ہردلعزیز رکھنے کیلئے وہ بھی مصلحت پسندی کو شعار بناتے ہوئے مفادات و مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اصولوں کی قربانی نہیں دی۔[74]

اگرچہ محمد علی 1905ء میں تقسیم بنگال کے مخالفین میں سے تھے۔ لیکن جلد ہی انہیں اس کے دوسرے پہلو یعنی مسلمانوں کے حق میں اسکی افادیت واہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کی ہر شعبہ حیات میں ترقی و خوشحالی کی راہیں ہموار ہوئیں تھیں۔ اس لیے جب انگریز حکومت نے بے وقت اور بلا ضرورت تقسیم بنگال کو کالعدم قرار دیکر مسلمانوں کو مایوس اور بدظن کر دیا تو محمد علی نے اس سلسلے میں نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"تاریخ میں بے وفائی اور غداری کی اس سے ذلیل تر مثال ملنا مشکل ہے۔ جس میں وفاداری کا بدلہ نئے حاصل شدہ حقوق کی محرومی سے ملا ہو اور قناعت کی سزا ایک بدترین جرم سمجھ کر دی گئی ہو۔"[75]

محمد علی نے اعلانِ تنسیخ بنگال کے فوراً بعد لوکل گورنمنٹ کے سربراہ Sir Charles Bayle y (یہ مارچ 1907 سے اکتوبر 1909ء تک پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کے پرائیویٹ سیکریڑی بھی رہے تھے۔) سے ملاقات کی۔ وہ لارڈ سنہا Lord Sinha اور Sir Benode Mitter سے بھی ملے اور تنسیخ بنگال سے متعلق گفتگو کر کے انہیں مسلمانوں کے جذبات واحساسات سے آگاہ کیا۔ اور انہیں باور کرایا کہ یہ اقدام مسلمانوں کے ساتھ سراسر زیادتی اور حقوق کی پامالی کے مترادف ہے۔ اس زیادتی نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے کہ وہ حکومت وقت پر اعتماد کرنے کی بجائے بھرپور انداز میں میدان عمل و سیاست میں اکر اپنے حقوق کے حصول اور تحفظ کیلئے جدوجہد کریں۔[76]

1912ء میں دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو محمد علی بھی اپنے اخبار "کامریڈ" کے ساتھ دہلی آگئے۔ یہاں آکر محمد علی نے محسوس کیا کہ حکومت کو جو مطالبات پیش کئے جاتے ہیں انکے لئے تو انگریزی زبان لازمی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو ملکی حالات سے روشناس کرنے، انکے فرائض سے آگاہ کرنے اور بین الاقوامی سطح پر اہلِ ہند کی بنیاد استوار کرنے کیلئے ملک کی مشترکہ زبان اردو میں بھی کوئی رابطہ کی صورت ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے آپ نے 1913ء میں دہلی سے اردو اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ جس نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب بے گناہ ترکوں کا خون بہانے کیلئے بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں متحد ہو کر ترکی مقبوضات کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور انکو ہڑپ کرنے میں مصروف تھیں۔ محمد علی کی بے چین طبیعت اسلامی سلطنت کے حصے بخرے ہوتے نہ دیکھ سکی۔ انہوں نے "ہمدرد" کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کیا اور احساس دلایا کہ خلافتِ اسلامیہ کن مصائب و مشکلات کا شکار ہے۔ وہاں کے مسلمان بھائی کن مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انکی مضطرب آواز نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کی مالی امداد پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری (1880ء-1936ء) نے ہلالِ احمر مشن کی تنظیم کی۔ جس نے ترکی جاکر قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔[77]

محمد علی کا حکومتِ وقت سے ٹکراو

1913ء میں محمد علی کا اس وقت حکومت کے ساتھ کھلا تصادم ہو گیا۔ جب حکومت نے ایک پمفلٹ

"Come to Mecedonia and help us" "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" ضبط کر لیا، جو محمد علی کے نام آیا تھا۔[78] حالانکہ ایسے ہی پمفلٹ دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی موصول ہو چکے تھے۔ لیکن حکومت نے انکے بارے میں کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ بقول محمد علی

> "میرا 1913ء میں اس وقت حکام سے کھلم کھلا تصادم ہو گیا جب انہوں نے ایک پمفلٹ جو مجھے کئی دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کی طرح موصول ہوا تھا ضبط کر لیا۔ جس میں بلقانی اتحادیوں کے مقدونیہ پر مظالم کا ذکر تھا۔ اور برطانیہ سے بلقانی اتحادیوں کے خلاف مسیحت کے نام پر مدد کی اپیل کی گئی تھی، میں دب کر اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ 1910ء کے انڈین پریس ایکٹ کے اس قابلِ نفرت اور جلد بازی میں بنے ہوئے قانون کے خلاف پہلی دفعہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی شکایت لیکر کلکتہ ہائی کورٹ گیا اور اس سے فیصلہ چاہا۔"[79]

درجہ بالا اقتباس سے حکومتِ وقت کی محمد علی کے ساتھ زیادتی اور جانبداری واضح ہوتی ہے۔ کہ دوسروں کیلئے جو چیز جائز تھی وہ محمد علی کیلئے شجرِ ممنوعہ کیوں؟ دراصل انگریز حکومت محمد علی جیسے بے باک، جرأت مند اور حق گو شخص سے خائف تھی۔ کہ اگر یہ پمفلٹ محمد علی کے پاس آجاتا ہے تو وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مقدونیہ پر کیئے گئے مظالم سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیں گے۔ اور انگریز حکومت کی بے حسی بھی آشکارا ہو جائے گی کہ ان سے مسیحت کے نام پر مدد کی اپیل کی، مگر انہوں نے پھر بھی اس پر کان نہ دھرے۔ مسلسل بلقانی اتحادیوں کا ساتھ دیتے رہے، اور مسلم ممالک پر بے جا پابندیاں اور ناروا سلوک روا رکھا۔ حکومت کا یہ اقدام محمد علی کے ساتھ صریحاً زیادتی اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی تھا۔ محمد علی نے اسکے خلاف آواز بلند کی اور انصاف کیلئے کلکتہ ہائی کورٹ میں مقدمہ درج کرایا۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر لارنس جنکن Sir Lawrence Jenkens نے پریس ایکٹ 1910ء کے تحت محمد علی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لیکن حکومت نے جو اقتدار و اختیارات کی حامل تھی آخر کار اعلیٰ عدالت سے محمد علی کے خلاف فیصلہ صادر کروا دیا۔ ان اقدامات سے حکومت کے خلاف محمد علی کا منفی رد عمل یقینی امر تھا۔[80]

سانحہ کانپور 1913ء

محمد علی کا حکومت کے ساتھ یہ مقدمہ چل رہا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایک اور سانحۂ عظیم یعنی 1913ء میں مسجدِ کانپور کا واقعہ پیش آگیا۔ جس میں مسجد کے ایک حصے کو سڑک چوڑی کرنے کی غرض سے میونسپلٹی کی طرف سے شہید کر دیا گیا۔[81] جس نے مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔ وہ مشتعل کیوں نہ ہوتے، انکے مذہبی معاملات میں مداخلت کر کے انتظامیہ نے انکے جذبات کو شدید مجروح کیا تھا۔ مسجد شعائر اللہ میں آتی ہے وہ اسکی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ :-

يايها الذين آمنو لا تحلوا شعائر الله ٥

ترجمہ: مومنو! اللہ کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔ (5-2)

محمد علی اس حادثہ کی سنگینی سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اس موقعہ پر نہایت سوچ بچار کے بعد دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ پہلے یہ معاملہ مقامی سطح پر ہی حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن ضلع کی انتظامیہ، کلکٹر اور مجسٹریٹ وغیرہ کے رویے سے مایوس ہو کر محمد علی نے براہ راست لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ سے رابطہ قائم کیا تاکہ انہیں حالات کی نزاکت اور معاملے کی سنگینی سے آگاہ کر سکیں۔ 15 مئی 1913ء کو سر جیمس مسٹن (1863ء-1945ء) گورنر صوبہ متحدہ کو بمقام نینی تال خط لکھا۔[82] محمد علی نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ حکام مسجد کے کسی حصے کو بھی شہید نہ کریں۔ کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ یہ حساس مذہبی معاملہ ہے۔ اور مسلمانوں کیلئے مذہب میں مداخلت ناقابل برداشت چیز ہے۔ وہ مذہب کے تحفظ و بقا کیلئے جانی و مالی کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ اسی خطرے کے پیش نظر انہوں نے سر جیمس مسٹن کو خط لکھا۔ لیکن گورنر کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکے نزدیک یہ صرف مسلمانوں کا پروپیگنڈہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ سر جیمس مسٹن نے محمد علی کو جواب میں تحریر کیا کہ :-

> "میموریل میں جو اعتراضات کئے ہیں۔ ان پر احکامات جاری ہو گئے۔ میں نے اس معاملہ پر خاص طور سے ذاتی توجہ کی ہے کہ مسجد کا حصۂ انہدام طلب غسل خانہ ہے اور متبرک عمارت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان جوتا پہن کر اس احاطہ میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ بہر حال ہر طرح سے کوشش کی جائے گی کہ غسلخانہ ایک مناسب موقعۂ زمین پر بنوا دیا جائے۔ لیکن سڑک کی لائن بدلی نہیں جاسکتی۔ مسجد کا ادب ہر طرح سے ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔"[83]

محمد علی کے نزدیک یہ ایک سنجیدہ اور حل طلب مسئلہ تھا۔ لہذا انہوں نے سر جیمس مسٹن کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے دوبارہ 16 مئی 1913ء کو انہیں خط لکھا کہ :-

> "--- میرا منشاء ہر گز یہ نہیں ہے کہ محض خیالی شکایات کی بنا پر گورنمنٹ کو پریشان کروں اور خصوصاً اس نازک موقع پر، مگر میں یور آنر سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سڑک کی لائن کا ایسا معاملہ نہیں ہے جسکی وجہ سے ایسی شکایات پر سربرآوردہ اور معقول اشخاص کو پیدا ہو گئی ہیں باقی رہنے دی جائے، جس سے ناانصافی کا خیال قائم ہو سکے۔ میں نہایت آدب کے ساتھ یور آنر کو مشورہ دیتا ہوں کہ کسی قسم کی کاروائی کرنے سے پیشتر آپ اس معاملہ کے متعلق مسلمان علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔"[84]

لیکن سر جیمس مسٹن نے محمد علی کی معقول اور توجہ طلب تجویز کا[85] 23 مئی 1913ء کو انتہائی سخت جواب تحریر کیا۔ گورنر کے مایوس کن اور حوصلہ شکن تار کے باوجود محمد علی نے ہمت نہ ہاری اور اس سلسلے میں جدوجہد جاری رکھتے ہوئے 3 جون 1913 کو پھر مسٹر مسٹن کو خط لکھا کہ :-

"--- لیکن مسلمانانِ کانپور زور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے یہ ثابت کرنے کیلئے تیار ہیں کہ جس حصے کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسپر کبھی بھی جوتیاں نہیں گئیں۔ اور نہ کبھی زینے کے قدموں سے آگے جوتیاں رکھی جاتی ہیں۔ بلکہ جب نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو اس حصہ پر نماز ادا کی جاتی ہے--- بیان کیا جاتا ہے کہ جب نومبر گذشتہ میں یورآنز کانپور میں رونق افروز ہوئے تھے تو میونسپل بورڈ کے مسلمان ممبروں نے یورآنز کی خدمت میں التجا کی تھی کہ انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے، کہ مسجد منہدم نہ کی جائے گی۔ اور میں نے "ہیرالڈ آف انڈیا" میں دیکھا کہ یورآنز نے ممبروں کو یقین دلایا تھا کہ امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی مسجد اور مندر دونوں کو ہاتھ نہ لگائے گی۔"[86]

لیکن مقام افسوس کہ گورنر پر محمد علی کی سچی باتوں، معقول رویے اور یاد دہانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور عظیم سانحہ پیش آہی گیا۔ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ستم یہ کہ ایک طرف تو حکام نے مسلمانوں کی گذارشات کے باوجود من مانی کرتے ہوئے مسجد کو شہید کر دیا اور دوسری طرف ہندوؤں کو نوازتے ہوئے مندر کو محفوظ رکھنے کیلئے سڑک کے نقشے میں ہی تبدیلی کر دی۔

جب محمد علی کی تمام کوششیں جو انہوں نے مسجد کو بچانے کیلئے سرکاری سطح پر کیں، مایوسی ہوئی۔ تو "ہمدرد"، "کامریڈ"، "الہلال" اور "زمیندار" نے عوام و خواص کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ نتیجتاً محمد علی کے داخلۂ کانپور پر پابندی لگا دی گئی۔ محمد علی کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ معاملے کو سلجھانے کی بجائے انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے الجھا دیتے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مجیب بھی محمد علی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انکی جذباتیت اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے زیاں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔[87] لیکن یہ الزام حقائق سے لاعلمی یا مخالفت برائے مخالفت کی بنا پر عائد کیا جاتا ہے۔ صرف قضیہ کانپور کے سلسلے میں محمد علی کی کوششیں اس پروپیگنڈے کی نفی کرنے کیلئے کافی ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو پریس کا سہارا لیکر، معاملے کو اچھال کر اپنا سیاسی قد بڑھا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے منفی راستہ اختیار کرنے کی بجائے اصولی اور مثبت راستہ اختیار کیا۔ انگریزی حکام کو جھنجھوڑا۔ جب شنوائی نہ ہوئی تو انگریز بیوروکریسی سے مایوس ہو کر 1913ء میں خاموشی سے سید وزیر حسن (1874ء - 1947ء) سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی معیت میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ روانگی کو خفیہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر ہندوستانی حکام کو پتہ چل گیا تو انہیں انگلستان جانے سے روک دیں گے۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مخلص ہوتے تو انکے مذہبی جذبات و احساسات کا احترام کرتے ہوئے معاملے کو بگڑنے سے بچا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے انتہائی بے حسی، تعصب اور جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ ایسے میں وہ کہاں برداشت کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کا وفد برطانیہ جا کر اپنے مطالبات پیش کرے۔

انگریز کی شاطرانہ سیاست ملاحظہ کیجئے کہ جب محمد علی سید وزیر حسن کے ساتھ انگلستان پہنچے۔ تو انہوں نے اس وقت کے مشہور آزاد خیال وزیر ہند مسٹر مارلے (1838ء - 1923ء) سے شرف باریابی کی درخواست کی لیکن انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا۔[88] وفد نے یہاں سے مایوس ہونے کے بعد دوسرا دروازہ کھٹکھٹایا اور لارڈ کریو سیکرٹری آف اسٹیٹ

برائے امورِ ہند سے ملاقات کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے بھی مصروفیات کا جواز پیش کر کے وقت دینے سے انکار کر دیا۔[89]
در حقیقت اندرونِ خانہ برطانوی حکام کے اس سرد اور مایوس کن رویے کی وجہ یہ تھی کہ جب محمد علی وزیر حسن کو لیکر لندن چلے گئے تو سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ لارڈ ہارڈنگ (1858ء-1944ء) وائسرائے ہندوستان نے لارڈ کریو کو فوراً ایک طویل تار ارسال کیا کہ یہ وفد جو انگلستان پہنچا ہے ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہے۔ اسلئے سرکاری طور پر اسکی ہمت افزائی نہ کی جائے۔ وائسرائے نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کیلئے راجہ صاحب محمودآباد (1881ء- 1931ء) کی رائے بھی نقل کر دی، جو انہوں نے محمد علی کے بارے میں لی تھی کہ :۔

"محمد علی انتہائی بد ذات اور شریر شخص ہے اور وہ مسلمانوں کے مسئلے کو نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"[90]

حالانکہ چودھری خلیق الزماں کے مطابق :۔

"محمد علی پوری قوم کے نزدیک ایک مضبوط، دیانتدار، بے غرض اور قابل رہنما کی شہرت وحیثیت رکھتے تھے۔"[91]

یہ ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ وفد تھا۔ جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی طرف سے گیا تھا۔ اسکے علاوہ محمد علی "کامریڈ" و "ہمدرد" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ایک مقام رکھتے تھے۔ اسلئے کوئی وجہ نہ تھی کہ انہیں اہمیت نہ دی جاتی۔ مگر برطانوی حکام نے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف ملاقات سے انکار کر دیا۔ بلکہ وفد کے خلاف اخبارات میں مضامین و مراسلات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔[92]

قیامِ انگلستان کے دوران ریمزے میکڈانلڈ (1866ء- 1935ء) لیبر لیڈر کے ساتھ محمد علی کے اچھے مراسم تھے۔ ہندوستان میں ان دونوں کی پہلی خوشگوار ملاقات 1912ء میں ہو چکی تھی جب وہ Inlington Commission کے ممبر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس ملاقات میں ریمزے نے اپنے آپکو "کامریڈ" کے باقاعدہ ریڈر کی حیثیت سے متعارف کرایا اور محمد علی کو بطور صحافی سراہا تھا۔ لیکن 1913ء سانحہ مسجد کانپور کے سلسلے میں جب محمد علی نے ریمزے سے رابطہ کرنے کے لئے خط لکھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر لندن میں محمد علی نے ریمزے سے ملاقات کی تو انہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ جب محمد علی نے اپنے سابقہ خط کا حوالہ دیا تو ریمزے نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا کہ مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کس محمد علی کا مراسلہ ہے۔ حالانکہ محمد علی نے اپنے نام کیساتھ ایڈیٹر "کامریڈ" لکھا تھا۔[93]

محمد علی نے برطانوی حکام کی سرد مہری اور عدم تعاون کے باوجود ہمت نہ ہاری، جدوجہد جاری رکھی۔ انہوں نے لندن کے ایکسیس ہال میں ایک میٹنگ کی جس میں ترپولی، طرابلس وبلقان وغیرہ سے متعلق حالات و واقعات بیان کئے اور سر ایڈورڈ گرے کی خارجہ پالیسی پر شدید تنقید کی۔ وہ سید امیر علی، سر آغا خان اور مسٹر جناح وغیرہ سے بھی ملے اور تمام حقائق سے آگاہ کیا۔[94] بالآخر 5 دسمبر 1913ء کو محمد علی اور سید وزیر حسن مایوس ہو کر لندن سے رخصت ہوئے۔ محمد علی کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ وفد کی ناکامی میں راجہ صاحب محمودآباد کے علاوہ نواب رامپور کا بھی بڑا کردار تھا۔ جسکا اندازہ محمد علی کے خط بنام مکتوب الیہ نامعلوم 1915ء بمقام لینسڈاؤن سے ہوتا ہے۔[95] اسکے علاوہ محمد علی نے اپنی ڈائری میں جو انہوں

نے جولائی 1919ء کو بیتول جیل میں لکھی، ذکر کیا ہے کہ جب وہ 1913ء میں لندن گئے تو بحیثیت جرنلسٹ اور سیاستدان انکی سرگرمیوں سے مسٹر کلیولینڈ واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے محمد علی کو لارڈ کرزن کی پارٹی میں شرکت کیلئے کہا تھا۔ کیونکہ مسٹر ہیوٹ (Hewitt)، کریڈوک (Craddoch) اور سول سروس عام طور پر لارڈ ہارڈنگ کے خلاف تھی۔ اور میں نے کلیولینڈ کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور میرا یہ انکار بیورو کریسی کے منفی رویے کا حتمی نتیجہ ثابت ہوا۔[96]

سانحہ کانپور کے سلسلے میں حکومت کی جانبداری اور بے حسی نے محمد علی کو انگریز حکومت سے مزید متنفر و بدظن کر دیا۔ کہ وہ اقتدار کے نشے اور اختیارات کے گھمنڈ میں مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کو پامال کرنے سے دریغ نہیں کر رہے ہیں۔ انکے نزدیک مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آخر انہوں نے سوچا کہ اگر مشرق وسطیٰ کے ممالک متحد و مضبوط ہو جائیں تو ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط تادیر ممکن نہ ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے مسلم ممالک کے اتحاد کی تحریک شروع کی۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین تعلقات کو بہتر بنانے اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کیلئے کوشاں ہوگئے۔ انہوں نے 1913ء مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں خود مختار اداروں اور فرقہ وارانہ بیانات کی شدید مخالفت کی۔[97] محمد علی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان کے مسائل کا حل اور انگریز حکومت سے نجات کا واحد راستہ ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے۔

قدامت پسند اور جدت پسند طبقوں میں مفاہمت پیدا کرنا

جہاں محمد علی نے ہندو مسلم اتحاد کیلئے جدوجہد کی۔ وہاں انہوں نے اپنے ہم مذہب قدامت پسند اور جدت پسند طبقوں کو قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اصطلاح عام میں جدت پسند مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کو "نئی روشنی والے" اور "قدامت پسند طبقہ" کو "راسخ العقیدہ مذہبی افراد" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی جو دن بدن وسیع ہوتی جارہی تھی۔ جسے محمد علی نے بڑی شدت سے محسوس کیا، کہ مسلمانانِ ہند کے مفادات کے تحفظ اور حقوق کی طلبی کیلئے لازمی ہے کہ نظریاتی و فروعی اختلافات کی اس خلیج کو دور کر کے انہیں ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ اور ان میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کر کے انہیں ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ محمد علی نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ انہوں نے "نئی روشنی والوں" اور "راسخ العقیدہ مذہبی طبقوں" کے درمیان عرصہ دراز سے پیدا شدہ خلیج کو ختم کر دیا۔ محمد علی نے جنگِ طرابلس و بلقان کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے تمام طبقوں میں عالم اسلام اور اسکے ساتھ مذہب اسلام سے جو غیر معمولی جذباتی وابستگی اور شیفتگی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس میں بڑی کام آئی۔ بقول محمد علی

> "الغرض اسلام کے دینوی مصائب نے مسلمانوں کو ناگزیر طور پر اپنے مذہب کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور وہ خلیج جو مغربی تعلیم نے بظاہر دیکھنے میں "مذہبی طبقوں" اور "نئی روشنی والوں" میں پیدا کر دی تھی۔ وہ گویا سطرح جادو سے آناً فاناً ناپید ہو گئی۔ اور راسخ العقیدہ اور یورپ زدہ طبقے ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے۔"[98]

مذہبی طبقے کے لوگ اپنی بے چارگی کو نیکی قرار دیتے ہوئے عوامی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے تارک الدنیا ہوگئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ "نئی روشنی والے" جنھیں وہ اسلام سے بے بہرہ سمجھتے ہوئے کافر و ملحد قرار دیتے تھے۔ وہ ہندوستان کے اخبارات اور عام جلسوں میں مسلم ممالک کی برملا حمایت کر رہے ہیں تو یہ نیم تارک الدنیا حضرات اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بقول محمد علی

> "اسطرح جلد ہی طرفین کے درمیان بے ضابط اور تجربے کے طور پر سلسلہ جنبانی شروع ہوگئی، لیکن اس ضمن میں حضرات علماء کی تعریف میں یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ انہوں نے اس موقع پر اپنے فخر و پندار سے دستبردار ہونے میں مطلق تامل نہیں کیا۔ اور ایک لحاظ سے ان لوگوں کی قیادت قبول کر لی جنھیں وہ ایک نسل سے پہلے عذابِ جہنم کا قطعاً مستوجب قرار دے چکے تھے۔"[99]

محمد علی کی اتحاد و تعاون کے سلسلے میں یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور معاشرے کے دونوں طبقے بڑی سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ محمد علی کا نصب العین مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ، حقوق کا حصول اور عالم اسلام کی بقا و استحکام تھا۔ اسی جذبے نے انہیں میدان سیاست میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ جسکا بھر پور عملی مظاہرہ تحریک خلافت کے دوران دیکھنے میں آیا۔

جنگِ عظیم اول (1914ء-1918ء)

مسلمانوں کے جذبات ابھی تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ جنگِ عظیم اول کا اغاز ہوگیا۔ جسکی مختصراً تفصیل کچھ یوں ہے کہ 28 جون 1914ء کو اسٹریا کے ولی عہد ارچ ڈیوک فرینک فرڈینڈ کو سرجیو کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ سرجیو اسٹریا کے صوبہ بوسنیا کا دار لحکومت تھا۔ اس سے پہلے بوسنیا سربیا کی قدیم حکومت میں شامل تھا۔لہذا اسٹریا نے اس قتل کا ذمہ دار سربیا کو ٹھہراتے ہوے ہوئے 28 جولائی 1914ء کو اسکے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ روس کے سربیا کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ جسکی بنا پر اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جرمنی نے روس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، منع نہ ہونے کی صورت میں جرمنی نے روس کے خلاف 30 جولائی 1914ء کو اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روس کا حلیف تھا۔ لہذا 3 اگست 1914ء کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے جرمنی نے فرانس پر حملہ کرنے کیلئے بلجیم سے راستہ مانگا۔ برطانیہ نے جرمنی کو متنبہ کیا کہ وہ بلجیم سے راستہ نہ مانگے۔ کیونکہ برطانیہ، پروشیا، فرانس، اسٹریا اور روس نے 1839ء میں بلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔ لیکن جرمنی باز نہ آیا تو برطانیہ نے 4 اگست 1914ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جاپان نے (23 اگست 1914ء) کو برطانیہ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ رفتہ رفتہ اس جنگ نے عالمگیر صورت اختیار کر لی۔[100]

"چوائس آف دی ٹرکس" پر حکومت کا ردعمل

پہلی جنگِ عظیم نے محمد علی کو "کامریڈ" کے ذریعے انگریز حکومت کے مقابلے میں علی الاعلان میدان میں آنے

پر مجبور کر دیا۔ اس وقت "لندن ٹائمز" میں "Choice of the Turks" کے عنوان سے ترکوں کے خلاف ایک اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا۔ جس میں ترکوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ جنگ میں شرکت سے باز رہیں۔ ورنہ انہیں خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔[101] دراصل برطانیہ جو اتحادیوں کا ہمنوا تھا۔ اس نے شروع ہی سے ترکی کے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت کر کے اسکو ہر جائز و ناجائز طریقے سے نقصان پہنچایا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ترکی انتقاماً جرمنی کی طرف سے جنگ میں کود پڑے گا۔ اور مسلمانانِ ہند جنھیں طرابلس و بلقان کی جنگوں نے پورے طور پر بیدار کر دیا ہے۔ وہ ہر صورت میں مسلم ملک کا ساتھ دیں گے۔ ملک کے اندر بھی مسلمان انگریز حکومت کے خلاف ہو جائیں گے۔ اسلئے برطانیہ نے دباؤ اور دھمکی سے ترکی کو جرمنی کا ساتھ دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ برطانیہ کا کردار ماضی میں ترکی کے ساتھ انتہائی معاندانہ جابرانہ اور جانبدارانہ تھا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ برطانیہ نے ترکی کے مختلف صوبوں کے ضمن میں دوسروں کو ان پر اقتدار و تسلط قائم کرنے میں امداد و اعانت کی تھی۔ ترکی اسے نہیں بھولا تھا۔ خود برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر کے جنگِ طرابلس میں ترکوں کا مصر سے راستہ روک لیا تھا۔ بلقان میں برطانیہ و فرانس کے طرزِ عمل سے نوجوان ترکوں کو شدید مایوسی ہوئی تھی۔ ترکی کے دو کروڑ جنگی قیمت بھی ادا کی جا چکی تھی۔ برطانیہ نے ضبط کر لئے تھے۔ فرانس نے اپنے ٹیونس کے قبضے کے خلاف اٹلی کی حاسدانہ شورش رفع کرنے کیلئے طرابلس پر اٹلی کے حملے کی حمایت کی تھی۔ روس ترکوں کا ازلی دشمن تھا۔ جو بازنطینی روایات و سلطنت کی وراثت کا دعویدار اور قسطنطنیہ پر قبضہ کا خواہاں تھا۔[102] ان حالات میں ترکی کیلئے غیر جانبدار رہنا ناممکن تھا۔ اگرچہ سلطنت ترکیہ کمزور ہو چکی تھی۔ مگر ابھی یورپ کی سیاست میں اسکا اتنا عمل دخل تھا کہ ہر فریق اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھا۔ ان زیادتیوں کے پیش نظر ترکی کیلئے اتحادیوں کا ساتھ دینا یا برطانیہ کے جابرانہ احکامات کی تعمیل کرنا ممکن نہ تھا۔ دوسرا اتحادیوں کے مقابلے میں جرمنی کا طرزِ عمل ترکی کے ساتھ دوستانہ اور مثبت رہا تھا۔ حتیٰ کہ طرابلس و بلقان کی جنگوں میں جرمنی ترکی کا ساتھ دیا تھا۔ فتح ایڈریانوپل پر قیصر جرمنی نے سلطان ترکی (محمد خامس) کو مبارکباد کا تار بھیجا تھا۔ جنگِ بلقان میں ترکی فوج کی کمزوریاں ظاہر ہونے کے بعد ترکی حکومت نے جب اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کا اغاز کیا۔ تو حکومت جرمنی نے اسکے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اس کام کیلئے اپنے جنرل فان ور غولتز کو ترکی بھیجا۔[103] اب مشکل حالات میں ترکی جرمنی کے ساتھ بے وفائی کر کے احسان فراموش کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ برطانیہ نے دھمکیوں سے ترکوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں جو مضمون "Choice of The Truks" کے عنوان سے شائع ہوا، اسکا لب و لہجہ انتہائی حقارت آمیز تھا۔ جسے پڑھکر محمد علی اپنے جذبہ اسلامی اور غیرتِ ملی کی وجہ سے بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے چالیس گھنٹے کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد جواباً "Choice of The Truks" ہی کے عنوان سے ایک طویل ترین مضمون 26 ستمبر 1914ء کو "کامریڈ" میں شائع کر دیا۔ جو ترکی کی حمایت اور انگریزوں کے خلاف پر زور لیڈنگ آرٹیکل تھا۔ مضمون کا شائع ہونا تھا کہ سرکاری حلقوں میں ہل چل مچ گئی۔ حکومت نے محمد علی کے پریس کی ضمانت ضبط کر لی۔ اور آیندہ کیلئے بھاری ضمانت طلب کی۔ محمد علی مزید ضمانت جمع کروانا چاہتے تھے۔ لیکن احباب نے مشورہ دیا کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ آپ مسلمانوں کے حق میں حکومت کے خلاف لکھنے سے باز نہیں آئیں گے اور ضمانتیں ضبط ہوتی رہیں گی۔ آخر کب تک؟ اسلئے محمد علی نے مزید ضمانت جمع کروانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر وہ معاشی لحاظ سے بھی اس پوزیشن

میں نہیں تھے کہ یہ بار برداشت کر سکتے۔ مجبوراً "کامریڈ" کو بند کرنا پڑا۔ اور "ہمدرد" کیلئے نئے پریس کا ڈیکلریشن داخل کیا گیا۔[104]

محمد علی کچھ عرصہ پہلے تک انگریزوں کی نظر میں بڑے محبوب و مقبول تھے۔ لیکن ایسا اس وقت تھا جب تک انہوں نے انگریز حکومت کی غلط پالیسیوں، زیادتیوں اور مسلم ممالک کو نقصان پہنچانے کے خلاف قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد علی پہلے مصلحت پسندی کے تحت خاموش رہے۔ انہوں نے اعتدال کی روش اختیار کرتے ہوئے انگریزوں کو مسلمانوں کے جذبات و احساسات اور خیالات و نظریات سے آگاہ کر کے غلط پالیسیوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ حکومت سے الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں ہی کا نقصان تھا۔ لیکن جب انگریز نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اس پر کان نہ دھرے اور اپنے مفادات اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پار کر لیا۔ تو محمد علی بھی بے قابو ہو گئے اور انہوں نے برطانیہ پر بے باکانہ تنقید کی، مسلمانوں کے حقوق کی طلبی کا مطالبہ کیا، انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو معتوب قرار پائے۔ انکی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ 1914ء کے اوائل میں ڈاکٹر عدنان ادی وار Dr.Adnan Adivar کی سربراہی میں ترکی ہلالِ احمر کا ایک وفد ہندوستان آیا۔ انہوں نے محمد علی سے ملاقات کر کے انکی کوششوں کو سراہتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اسکے فوراً بعد حاجی سامی بے کی سربراہی میں ترکی سے ایک اور وفد ہندوستان آیا۔ جس نے محمد علی اور دیگر مسلم مشاہیر سے ملاقات کی۔ اس پر انگریزوں کو تشویش ہوئی اور پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اس وفد کا تعلق سلطنت ترکی کی خفیہ پولیس "تشکیلاتِ مخصوصہ" سے ہے۔ لہذا محمد علی جیسے مسلم قوم پرست لیڈروں کو بلیک لسٹ کر دیا۔ اور انکے ہندوستان میں ترکوں کے ساتھ روابط کو خطرناک نتائج کا حامل قرار دیتے ہوئے نگرانی سخت کر دی۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی خفیہ معلومات کی تنظیم کے افسرِ اعلیٰ نے محمد علی کے بارے میں رپورٹ تیار کرتے ہوئے الزام لگایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سمیت انتہائی مفسدانہ اور شرانگیز سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اسکے ساتھ ہی سی۔آئی۔ڈی محمد علی کے ساتھ سائے کی طرح لگ گئی۔[105]

جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 2 اگست 1914ء کو جرمن سفیر بیرون فان وانگن ہائم مقیم قسطنطنیہ کی وساطت سے ترکی اور جرمنی میں ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا۔[106] جب جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو ترکی پر معاہدہ کی دفعہ لاگو ہو گئی۔ اور وہ آسٹریا ہنگری کی امداد کیلئے جرمنی کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑا۔ ابھی تک ترکی انگلستان اور فرانس کے معاملے میں غیر جانبدار تھا۔ مگر انگلستان نے اپنے جارحانہ اقدامات سے ترکی کی اس غیر جانبداری کو بھی باقی نہ رہنے دیا۔ اسکی بھی دو وجوہات تھیں ایک وجہ تو یہ تھی کہ 5 ستمبر 1914ء کو ترکی نے اپنے نئے قوانین کے تحت ان مراعاتِ خصوصی کا خاتمہ کر دیا، جو اس نے ایک زمانے سے یورپی حکومتوں کو عطا کر رکھی تھیں۔ دوسری فوری وجہ یہ ہوئی کہ ترکی کے دو بحری جہاز انگلستان کے کارخانے میں بن رہے تھے۔ اور جنگ شروع ہونے سے قبل تیار ہو گئے تھے۔ ترکی نے انکی قیمت بھی ادا کر دی تھی۔ لیکن جونہی جرمنی نے اعلان جنگ کیا تو انگلستان نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ان جہازوں کو ضبط کر لیا، حالانکہ اس وقت تک برطانیہ سے جنگ نہیں چھڑی تھی۔ انگلستان کے اس اقدام کے خلاف ترکی میں اشتعال پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ اسی اثناء میں جرمنی کے دو جہاز گوبن اور برسلاو رُدانیال پہنچے تو ترکی نے ان جہازوں کو خرید لیا۔ لیکن اتحادی ترکی کی اس جرأت پر سیخ پا ہو گئے اور ترکی کو دھمکی دی کہ اگر یہ جہاز آبنائے باسفورس سے نکلے تو انہیں

تباہ کر دیا جائے گا۔ مگر روس کی ناکہ بندی کیلئے بحیرۂ اسود میں ان جہازوں کا جانا ضروری تھا۔ جونہی یہ جہاز بحیرۂ اسود میں داخل ہوئے تو روسی جہازوں نے ان پر گولہ باری شروع کر دی اور 4 نومبر 1914ء کو روس اور 5 نومبر 1914ء کو انگلستان نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی روز انگلستان نے قبرص کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور مصر کو بھی اپنی سرپرستی میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اب ترکی کیلئے بھی غیر جانبدار رہنے کی کوئی وجہ نہ رہ گئی تھی۔ اسطرح ترکی نے نومبر 1914ء میں جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔[107]

محمد علی کی حکومتِ برطانیہ پر تنقید اور گرفتاری

مسلمانانِ ہند کی دلی خواہش تھی کہ ترکی جنگ میں شریک نہ ہو اور انہیں اس سلسلے میں دو وفاداریوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کیلئے مجبور نہ کیا جائے۔ لیکن ترکی کی جنگ میں شمولیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ :۔

ع کعبہ میرے آگے ہے، کلیسا میرے پیچھے

محمد علی نے "کامریڈ" میں ایک نہایت ہی اعلیٰ اداریہ لکھا جس میں وضاحت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو جس چیز کا ڈر تھا وہی ہوا، یعنی ترکی کی جنگ میں شمولیت۔ محمد علی نے لکھا کہ ترکی جنگ میں شرکت کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یہ غلط ہو یا صحیح، اب اس پر بحث و تمحیص فضول ہے۔ لیکن اصل غور طلب بات یہ ہے کہ اس فیصلے کا ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ یہ چیز شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مسلمانوں کو ترکی، ترکوں اور خلیفہ سے بے پناہ محبت ہے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ ایک طرف خلیفہ کی عزت و تکریم اور دوسری طرف غیر مسلم حکومت سے وفاداری، فرائض کی بجاآوری میں کیا عجیب ٹکراؤ واقع ہوا ہے۔ لیکن ان حالات میں جب تک جنگ مذہبی رنگ اختیار نہیں کرتی اس وقت تک مسلمان انگریز حکومت کے وفادار رہیں گے۔ بصورت دیگر انہیں اپنی وفاداریاں تبدیل کرنا پڑیں گی۔[108]

محمد علی نے انگریزی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جہاں برطانیہ میں پامرسٹن اور ڈیزرائیلی جیسے سیاسی دانشور پیدا ہوئے ہیں، وہاں ترکی کے جانی دشمن گلیڈ اسٹون بھی ہیں۔ محمد علی نے اپنے مقالے میں تاریخی دستاویز اور مستند کتب کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ برطانیہ عرصہ دراز سے سلطنت ترکیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی مذموم کوشش کر رہا ہے۔ جسکی تازہ ترین اور بین مثال برطانیہ کی وہ کاروائی ہے، جسکے ذریعے ترکوں کی فرمائش پر بنائے جانے والے دو جنگی جہازوں "رشادیہ" اور "عثمان اول" کی ترسیل باوجود ادائیگی روک دی۔ اگر ترکی نے سیلونیکا کو واپس لینے کیلئے جنگ میں شرکت کی ہے تو برطانیہ اسکی مذمت کیوں کر رہا ہے؟ کیا فرانسیسی السائس لورین (AlsacaLoren) کو بھول سکتے ہیں؟ سیلونیکا ترکوں کیلئے "کعبۂ آزادی" ہے اور پھر اس شہر کے یہودی بھی ترکوں کی حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ محمد علی نے متنبہ کیا کہ انگریز حکومت نے جنگ میں شامل ہوتے وقت نہایت بلند وبانگ دعوے کئے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ نہایت اعلیٰ وارفع مقاصد کی خاطر جدوجہد کریں گے۔ لیکن نہیں معلوم اسکا انجام کیا ہوگا۔ شاید اس وقت برطانیہ کو اسکے وعدوں کی یاد دہانی کرانی پڑے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ پورے نہ ہونے والے وعدے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک زبردست جدوجہد کی طرف دھکیل دیں۔
محمد علی نے آخر میں مسلمانانِ ہند کی بے چینی والجھن کا حل یہ بیان کیا کہ :۔

" ہماری خدمات حکومت کیلئے ہیں اور ہماری روحیں اللہ کے قبضے میں۔"[109]

حکومت بھلا ایسی جرأت مندانہ اور حقائق پر مبنی تنقید کب برداشت کر سکتی تھی۔ وہ محمد علی جیسے حق پرست اور بے باک لیڈر سے خائف تھی۔ حکومت نے محمد علی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور 17 مئی 1915ء کو تحفظِ قانون کی رو سے حکومت دہلی کی طرف سے محمد علی اور شوکت علی کی نظربندی کے سلسلے میں جابرانہ حکم دے دیا گیا۔ شوکت علی کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ حاجیوں کے سلسلے میں کام کرنے کے علاوہ دہلی میں محمد علی کی عدم موجودگی میں پچھلے ایک ماہ سے مالی انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور محمد علی کی نظربندی کے حکم کی کامیابی سے پیروی کر کے جو نواب رامپور سے لیا گیا تھا، منسوخ کروادیا تھا۔[110] انگریز حکومت نے دونوں بھائیوں کو اپنے لئے خطرناک قرار دیتے ہوئے پہلے دہلی سے باہر مہرولی، پھر لینسڈاؤن، کچھ عرصہ بعد چھندواڑہ اور آخر میں بیتول جیل میں نظربند کر دیا۔

حکومت برطانیہ کو اس چیز کا احساس تھا کہ اگر مسلمانانِ ہند ترکی کی حمایت کرتے ہوئے جنگ میں کود پڑے تو حکومت کیلئے شدید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اسلئے حکومت نے مسلمانوں کو ترکی کا ساتھ دینے سے باز رکھنے کے لیئے مختلف وعدے اور یقین دہانیاں شروع کر دیں تھیں۔ اسی سلسلے میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے 12 جنوری 1915ء کو قانون ساز اسمبلی میں یہ بیان دیا تھا کہ (جو بعد میں ایک فریب ثابت ہوا)

"اتحادیوں نے جزیرۃ العرب اور عراق کے اماکن مقدسہ کو حملہ سے محفوظ رکھنے سے متعلق اعلان کیا ہے۔ اور برٹش گورنمنٹ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف انکی حفاظت کیلئے تیار ہیں۔ اور انکو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ گو واقعات کا رخ کتنا ہی بدلے، مگر اس میں شک نہ ہو گا کہ مقاماتِ مقدسہ کے معاملے میں کسی قسم کی دست درازی نہیں کی جائے گی اور اسلام دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہو گا۔"[111]

وزیراعظم برطانیہ مسٹر لائیڈ جارج (1863ء - 1945ء) نے 5 جنوری 1916ء کو ایک تقریر میں کہا کہ :۔

"ہم اس غرض سے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اسکے دارالسلطنت یا ایشیائے کوچک کے زرخیز ممالک یا تھریس جہاں ترکی النسل لوگ آباد ہیں محروم کر دیں یا مقاماتِ مقدسہ میں عراق، عرب اور جدہ پر قبضہ کر لیں۔"[112]

ان وعدوں کی بدولت مسلمان جنگ سے باز رہے۔ انہوں نے انگریز حکومت کا ساتھ دیا۔ حتٰی کہ مسلمان فوج میں بھرتی ہوئے اور انہوں نے عملاً مختلف محاذوں پر اتحادیوں کی طرف سے جنگ لڑی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق انگریزوں نے 1916ء میں ایک لاکھ تیرہ ہزار (113000)، 1917 میں دو لاکھ چوہتر ہزار (274000) اور 1918ء میں پانچ لاکھ (500000) ہندوستانیوں کو فوج میں لے کر محاذ پر بھیجا۔[113] مسلمانوں نے یہ قربانی اس لیے دی تھی کہ جنگ کے بعد انگریز ترکوں اور خلافت پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے اور ہندوستان کو آزادی دے دیں گے۔

اگرچہ ہندو مسلم اتحاد کے داعی محمد علی نظر بند ہو چکے تھے۔ لیکن ملک کے اندر اتحاد کے سلسلے میں کوششیں جاری رہیں۔ یکم جنوری 1916ء میں مسلم لیگ کا ایک تاریخی اجلاس ہوا۔ اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی گئی۔ کہ مسلم لیگ اصلاحات کے نفاذ کے ضمن میں ہندوستان کی دوسری جماعتوں مثلاً کانگریس سے ملکر صلاح مشورہ کرے اور تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو جائیں۔[114] لیکن مقام حیرت ہے کہ ایک طرف تو مسلمان اتحاد کیلئے کوشاں تھے۔ لیکن دوسری طرف کانگریس کے رویے میں مسٹر بال گنگادھر تلک کے بارے میں بھی خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ اسے دس سال بعد دوبارہ کانگریس میں شامل کر لیا گیا۔ تلک سیاسی طور پر نیشنلسٹ ہندو تھا اور مسلمانوں کے بارے میں اسکا رویہ بڑا درشت اور متعصبانہ ہوتا تھا۔[115]

یکم ستمبر 1916ء کو گوکھلے ہال مدراس میں ایک عیسائی پادری کی بیوی مسز اینی بسنت نے آل انڈیا ہوم رول لیگ تحریک کا آغاز کر دیا۔[116] اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان میں خود مختار حکومت کے قیام کو فوری ممکن بنایا جائے۔ دسمبر 1916ء میں قائداعظم کی کوششوں سے معاہدہ لکھنؤ طے پایا۔[117] جس نے باہمی مصالحت، سیاسی اور دستوری تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہندوستان کے مختلف جماعتوں اور قوموں کے اتحاد اور مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ وابستگی نے حکومت برطانیہ کو پریشان کر دیا۔ لہذا 30 اگست 1917ء کو برطانوی دارالعوام میں وزیر ہند مانٹیگو نے تاریخ ساز اعلان کیا۔ کہ برطانوی حکومت کی آئندہ پالیسی یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبے میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع دیا جائے۔ بتدریج حکومت خود اختیاری قائم کی جائے۔ تاکہ ہندوستان مکمل طور پر خود مختار ہو کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن جائے۔[118]

ہندوستانیوں کو نئی اصلاحات کے جو سہانے خواب دکھائے جا رہے تھے۔ اس ضمن میں جولائی 1918ء میں وائسرائے ہند چیمسفورڈ اور وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کی مشترکہ رپورٹ شائع ہوئی۔[119] تاکہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا جا سکے۔ رپورٹ میں ہندوستان میں اصلاحات کے نفاذ کا ذکر اور سفارشات کی گئی تھیں کہ :۔

1. ہندوستانیوں کو مقامی خود اختیاری کے اداروں میں مکمل اختیارات دیئے جائیں۔
2. صوبوں میں مرحلہ وار اور منتخب نمائندوں کو اختیارات دیئے جائیں۔
3. مرکزی قانون ساز کونسل کو زیادہ نمائندہ حیثیت دی جائے۔
4. برطانوی وزیر ہند کا ہندوستان کی حکومت پر تسلط نسبتاً نرم کیا جائے۔

رپورٹ کی اشاعت کے بعد تازہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کیلئے مسلم لیگ اور کانگریس کے غیر معمولی اجلاس اگست 1918ء کو بمبئی میں منعقد ہوئے۔ جس میں کانگریس نے اس رپورٹ کو مایوس کن اور غیر تسلی بخش قرار دیکر رد کر دیا۔ اور مسلم لیگ نے ان تجاویز میں ترمیم کا مطالبہ کیا۔[120]

جنگ میں ترکی کی شکست

بیرونِ ملک جنگ جاری تھی۔ ترکوں نے بھی جانبازی و جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ شجاعانہ کاروائیوں کی عظیم

مثال قائم کی۔ لیکن میسوپٹیامیہ میں ہندوستان کی ہندو مسلم فوجوں اور عربوں کی بغاوت کی وجہ سے آخر کار ترکوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[121] کرنل لارنس کی خفیہ کوششیں رنگ لائیں۔ عرب برطانیہ کی سرپرستی اور عرب نیشنلزم کے جوش میں ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یکم اکتوبر 1916ء کو شریف حسین نے اپنے شاہِ حجاز ہونے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ نے فوراً باضابطہ طور پر اسکی بادشاہت کو تسلیم کر لیا اور اسکا لڑکا امیر فیصل عرب فوجوں کو لیکر ترک افواج کے مقابلے کیلئے شام کی طرف بڑھا۔ برطانیہ کی مدد سے ترکوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ برطانیہ کی تدابیر نے عربوں کو ترکوں کے مقابلے پر لا کر ہمیشہ کیلئے اختلاف و نفاق کی خلیج حائل کر دی۔

ترکوں نے جمال پاشا کی قیادت میں نہرِ سویز پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامی ہوئی۔ ترکی فوجیں زیادہ عرصہ تک مدافعت نہ کر سکیں۔ 7 نومبر 1917ء کو غزہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا۔ 9 دسمبر کو یروشلم میں بھی ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بیت المقدس پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا۔ 28 ستمبر 1918ء کو عرب فوج بھی انگریزوں سے مل گئی۔ اسکے بعد دمشق، بیروت، طرابلس، حمص، اور 26 اکتوبر 1918ء کو حلب کا آخری مورچہ بھی اتحادیوں نے فتح کر لیا۔ اب ترکوں کی حتمی شکست میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اکتوبر 1918ء تک شام، لبنان، عراق اور عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ادھر یورپ میں حلب کی فتح سے تقریباً ایک ماہ قبل 3 ستمبر 1918ء کو بلغاریہ نے جو ترکی اور جرمنی کا حلیف تھا، اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جرمنی بھی پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے میدان چھوڑ رہا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ ترکی کے حلیفوں کی قوت یکسر ٹوٹ چکی تھی۔ اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اتحادیوں سے صلح کی درخواست کرے۔ آخر کار 30 اکتوبر 1918ء کو ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان مدروس (Mudros) کے مقام پر عارضی صلح نامہ طے پاگیا۔ عزت پاشا کی کابینہ نے جو انجمن اتحاد و ترقی کی جگہ برسرِ اقتدار آچکی تھی صلحنامے پر دستخط کر دیئے۔ اس سے قبل کئی ملک ہتھیار ڈال چکے تھے۔ صحیح معنوں میں جنگِ عظیم اول 11 نومبر 1918 کو ختم ہوئی۔ جرمنی کی فوجیں ہر جگہ سے واپس بلا لی گئیں۔ دسمبر 1918ء میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں مسلمانوں نے ترکی کے بارے میں برطانوی حکومت کے جانبدارانہ اور ناروا رویے کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔[122] کانگریس نے بھی مسلمانوں کی ہمنوائی میں ایسے خیالات ظاہر کئے۔ دوران نظر بندی محمد علی پر پابندیاں مزید سخت کر دی گئی تھیں۔ وہ بے بسی کے عالم میں ترکی کے ساتھ زیادتیوں اور اسکے حصے بخرے کرنے پر تڑپ رہے تھے۔

حکومت برطانیہ کی زیادتیوں نے انکے غم و غصہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ ہر حلقہ اور ہر مکتب فکر نے ترکی کے ساتھ اتحادیوں کے ناروا سلوک اور ہوس پرستی کو شدت سے محسوس کیا۔ بقول ٹائن بی (Toynbee)

"جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔
اس طرح اتحادی طاقتیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پاتے ہی ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔
کیونکہ ترکی قدرۃً ایک زرخیز ملک ہے اور شہنشاہیت حریص واقع ہوتی ہے ---"[123]

جنگ کے دوران ہی ترکی کی تقسیم کے بارے میں خفیہ معاہدے ہو چکے تھے۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ :۔

"انہیں دولِ عظمیٰ کے خفیہ معاہدوں کی خبر نہ تھی۔ جس سے اندازہ ہو جاتا کہ صلح کیلئے کتنی گراں قیمت ادا کرنا پڑے گی۔"[124]

محمد علی کی رہائی

اندرونِ ملک مسلمان محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی کی اسیری پر بے حد مضطرب تھے۔ رہائی کے سلسلے میں جو امکانی کوشش کی جاسکتی تھیں انہوں نے کیئں۔ آخر عوامی احتجاج اور اور خواص کی کوششوں سے وائسرائے نے رہائی کے سوال پر غور کرنے کیلئے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی۔ حکومت کی جانبداری کا یہ عالم تھا کہ جن دو ججوں (سر عبدالرؤف اور مسٹر لینڈ سے (Lendsay) اودھ کے جوڈیشنل کمشنر) پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی تھی۔ ان میں پنجاب چیف کورٹ کے جج سر عبدالرؤف محمد علی کے پرانے سیاسی مخالف تھے۔ ایک مدت سے ان میں چشمک چلی آرہی تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر سر عبدالرؤف اور محمد علی میں شدید اختلاف تھا۔ اسکے علاوہ 1912ء میں عبدالرؤف محمد علی کے مخالف گروپ میں تھے۔ اور بعد میں بھی یہ مخالفت جاری رہی۔[125] ان سے حق وانصاف کی توقع عبث تھی۔ یہ کمیٹی چھندواڑہ پہنچی اور فرداً فرداً علی برادران کی شہادت قلمبند کی۔ علی برادران نے اپنی بے گناہی اور حکومت کی دراز دستی ثابت کرنے کے بعد گورنمنٹ سے اپنے نقصان کی تلافی بھی طلب کی، جو ناجائز نظر بندی کے بعد انکی تجارت اور اخبار کو ہوا تھا۔ محمد علی نے درخواست کی کہ انہیں انکی وہ تحریریں دکھائی جائیں۔ جنکی وجہ سے ان پر سازش وبغاوت کاالزام یا فرد جرم عائد ہوتا ہے۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ انہیں دکھائی جانے والی تحریروں میں وہ سب سے اہم اور معین تحریر نہ تھی۔ جسکا جگہ جگہ چرچا ہو رہا تھا کہ محمد علی نے سابق امیر افغانستان حبیب اللہ خان کو ایک خط لکھ کر ہندوستان پر حملہ کرنے کی تاکید کی تھی۔ اور وہ خط امیر موصوف نے اپنے ایک خاص ایلچی کے ذریعے حکومت ہند کو بھیجا ہے۔[126] یہ محض ایک افسانہ تھا، جسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر واقعی یہ صحیح تھا، تو حکومت آج تک وہ خط اور ایلچی کیوں منظر عام پر نہ لاسکی۔

دوسرا الزام یہ کہ دوران نظر بندی شوکت علی نے مولانا عبدالباری فرنگی محل (1878ء -1926ء) کو ایک خط لکھا ہے کہ اس وقت تشدد سے کام لینے اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے یہ انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اول اگر یہ خط شوکت علی نے دوران نظر بندی لکھا تھا تو انہیں پہلے گرفتار کرنے کا کیا جواز تھا؟ اور اگر انہوں نے نظر بندی کے دوران بھی لکھا تو ڈاک سنسر ہونے، اتنی پابندیوں اور سی۔آئی۔ڈی کے باوجود کیسے یہ خط لکھا اور کسطرح مولانا عبدالباری فرنگی محل تک پہنچا؟ کیا حکومت اور اسکے محکمے کی کاروائی اتنی ناقص تھی کہ سب کچھ انکی موجودگی میں ہوتا رہا۔؟

حکومت نے محمد علی کو سیاسی افق سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ان کے معاملے میں جانبداری برتی گئی۔ 10 نومبر 1917 کو مسٹر مانٹیگو وفد کے دیگر ارکان لارڈ ڈونومور، سر ولیم ڈیوک، چارلس رابرٹس اور بھوپندر ناتھ باسو کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ تاکہ مقامی حکومتوں اور سیاستدانوں کے خیالات ونظریات معلوم کرسکیں اور انہیں حکومت برطانیہ

تک پہنچایا جاسکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سیاسی جماعتوں کے وفود سے ملاقاتیں کیں۔ کانفرنسیں بلائیں۔ دیگر نمائندوں مثلاً مسٹر جناح، مسٹر گاندھی، مسز اینی بسنت، پنڈت مالویہ، مسٹر چنتامنی، بیگم صاحبہ بھوپال، راجہ صاحب محمود آباد سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سید حسن امام، مظہر الحق، ڈاکٹر انصاری اور مولوی فضل الحق وغیرہ نے ملاقاتیں کیں۔ مسٹر مانٹیگو کے بارے میں عام رائے یہ تھی کہ وہ معقول، آزاد خیال اور دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں۔ اسلئے محمد علی نے بھی درخواست کی کہ وہ مسٹر مانٹیگو سے ملکر ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں اجازت نہ دی گئی۔[127] حسبِ روایت مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد نواب محمد اسحاق خان (1860ء -1918ء) کی سربراہی میں مسٹر مانٹیگو سے ملنے دہلی گیا۔ تو وفد سے کہا گیا کہ صرف اس صورت میں شرف ملاقات حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایڈریس میں سے محمد علی کا ذکر خارج کر دیا جائے۔ لیکن وفد نے جواب دیا کہ وہ ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے نمائندہ وفد کی حیثیت سے ملاقات کر رہا ہے۔ اسلئے نہ تو اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کچھ کم کر سکتا ہے۔ وفد کا یہ جواب حکومت کیلئے ناقابل قبول تھا اسلئے وفد "پیش گاہِ معلّی" میں شرفِ حاضری سے محروم رہا۔ آخر عوام وخواص کے دباؤ سے مجبور ہو کر سی۔آئی۔ڈی (کریمنل انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ) کے ڈائریکٹر نے اپنے ماتحت افسر سر چارلس کلیولینڈ کو شملہ بھیجا۔ تاکہ علی برادران سے قول وقرار اور وعدہ لیکر رہائی کے عمل میں پیش رفت کی جائے۔ 7 ستمبر 1917ء کو انہوں نے مسٹر عبدالمجید (المعروف سپرینٹنڈنٹ خفیہ) کو ملکی ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر چھندواڑہ بھیجا۔ وہ سر چارلس کلیولینڈ کی طرف سے ایک عہد نامہ لیکر گئے۔[128] اسی دوران راجہ صاحب محمود آباد نے جو امپریل لیجسلیٹیو کونسل میں مسلمانوں کے نمائندے تھے، حکومت سے اجازت لیکر محمد علی سے ملاقات کی۔ لیکن انکی آمد سے پہلے ہی محمد علی مطلوبہ قول وقرار کے متعلق دو جگہ ترامیم کے بعد رضامندی دے چکے تھے۔ ایک ترمیم تو یہ تھی کہ قول واقرار سے کہیں اشارۃً بھی یہ بات ظاہر نہ ہو کہ ماضی میں ہمارا طرز عمل نامناسب رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سابقہ طرز عمل اور سرگرمیوں کو حق بجانب سمجھتے تھے، اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دوسری ترمیم یہ تھی کہ ہماری مذہبی آزادی کا تحفظ ہو۔ غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو اس بیان میں کہیں بھی کمزوری، معافی یا اصولوں کی قربانی کا شائبہ تک بھی نہیں تھا۔ لیکن حکومت اور مخالفین نے اس واقعہ کو منفی رنگ دیکر خوب پروپیگنڈہ کیا۔ جو محمد علی کو بدنام کرنے اور انکی سیاسی ساکھ خراب کرنے کا طے شدہ منصوبہ تھا۔

محمد علی کے اصولی تعاون اور مثبت رویے کے باوجود 1917ء میں مسز بسنت اور انکے ساتھی رہا کر دیئے گئے۔ لیکن محمد علی کی رہائی ممکن نہ ہو سکی۔ حالانکہ عوام وخواص کو یقین ہو گیا تھا کہ اس قول واقرار کے بعد نظربندی کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ علی برادران کو فوراً رہا کر دیا جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علی برادران کے معقول رویے اور عہد نامے پر دستخط کرنے کے باوجود سر چارلس کلیولینڈ محمد علی سے نالاں کیوں تھے؟ اس کا صحیح اندازہ مسٹر گھاٹے، علی برادران کے قانونی مشیر کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے مسز بسنت کو لکھا کہ:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب مسٹر محمد علی مع سید وزیر حسن انگلستان گئے تھے تو وہاں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اس میں شریک ہوں جسکا نام اب

"انڈو برٹش ایسو سی ایشن" ہے۔ اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین عمال کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلہ میں کاروائی کریں۔ تاکہ 1911ء کے دربار میں جو انتظامی تبدیلیاں کی گئی تھیں وہ پھر لوٹادی جائیں۔ یہ افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ ڈائریکٹر جنرل سی۔آئی۔ڈی تھے۔ اور یہ واقعہ قابل غور ہے کہ اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دینے کے بعد مسٹر محمد علی نے محسوس کیا کہ انکے ساتھ سر چارلس کا طرز عمل بدل گیا۔"[129]

حکومت نے محمد علی کی رہائی کے مسئلے کو جتنا دبانے کی کوشش کی، اتنا ہی عوام و خواص کی طرف سے اس مطالبے میں شدت آتی گئی۔ مسلم لیگ، کانگریس اور ہوم رول لیگ وغیرہ کے پلیٹ فارم سے انکی رہائی کیلئے مطالبے ہوئے اور قراردادیں پاس ہوئیں۔[130] گاندھی جو محمد علی کو ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کے سلسلے میں مضبوط ستون تصور کرتے تھے، انہوں نے بھی اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انہوں نے علی برادران کی رہائی کیلئے وائسرائے سے بھی اپیل کی۔ 1918ء میں گاندھی نے وائسرائے کے سیکرٹری کو اس بارے میں تفصیلی خط لکھا[131] جس میں درج تھا کہ :۔

1. اگر ان کو قید کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ حکومت کے خلاف اشتعال نہ پھیلائیں۔ تو یہ خیال فضول ہے، کیونکہ باہر کے لوگوں سے انکی خط وکتابت ہے۔
2. نظر بندی انکے اثرو رسوخ میں اضافے کا موجب بن رہی ہے۔
3. انکی نظر بندی سے عوام میں بے چینی پھیل رہی ہے۔
4. مولانا عبدالباری، محمد علی کے روحانی پیشوا ہیں۔ اگر حکومت انہیں رہا کر دے تو مولانا عبدالباری اور انکے ہزاروں مرید حکومت کے شکر گزار ہونگے۔[132]

اسکے علاوہ گاندھی نے محمد علی کو بھی مشورہ دیا کہ وہ نرمی اختیار کریں۔ 1919ء میں محمد علی نے گاندھی کو ایک تار بھیجا۔ تاکہ اسے وائسرائے کو ارسال کر دیں۔ اسپر گاندھی نے محمد علی سے کہا کہ :۔

"آپکے مراسلہ " کی زبان اشتعال انگیز اور بہت جذباتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی جائے انکے دعاوی کے بارے میں آپکی باتیں سخت اور مبالغہ انگیز ہیں۔ میں اس خط سے ذاتی تکالیف کا ذکر حذف کر دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ تو زندہ حقیقت ہے اور ریکارڈ سے ثابت ہے۔ اگر آپکو میری تجویز قبول ہو تو میں آپکے ڈرافٹ پر شوق سے نظر ثانی کرونگا۔[133] لیکن محمد علی نے اس میں تبدیلی سے انکار کر دیا۔ انکے نزدیک ایسا کرنے سے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکے گی اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ خط وائسرائے کے پاس اسی حالت میں پہنچادیا گیا۔ جس سے محمد علی کی رہائی مؤخر ہو گئی۔[134]

بالاخر مئی 1915ء کی گرفتاری و نظر بندی کے بعد دسمبر 1919ء کو علی برادران قیدِ قفس سے آزاد ہوئے۔[135] علی برادران کی رہائی کیونکر ممکن ہوئی؟ اس میں ملکی حالات کا بڑا دخل تھا۔ دراصل رولٹ ایکٹ کے خلاف اپریل 1919ء میں گاندھی جی کی "ستیہ گرہ" کا اغاز ہوا۔[136] اسی زمانہ میں سانحہ جلیانوالہ باغ پیش آیا۔[137] جس نے سارے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کے جذبات کو تیز تر کر دیا۔ لہٰذا حکومت نے مزید سختی سے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی

عجائے دسمبر 1919ء میں ایک دانشمندانہ اعلان کے ذریعے تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ ان رہائی یافتگان میں ہندوستان کے محبوب و مقبول رہنما محمد علی اور شوکت علی بھی تھے۔ جنہیں بغاوت اور سازشوں کے بے بنیاد الزامات کی بنا پر مزید قید رکھنا ممکن نہ تھا۔ اگر واقعی ان فدایانِ قوم کے خلاف یہ سب کچھ درست تھا، تو انہیں غیر مشروط طور پر کیوں رہا کیا گیا؟۔ دراصل جنگِ عظیم کے دوران محمد علی سے قوم کی صحیح رہنمائی کرنے، حالات و واقعات سے آگاہ کرنے اور عوام میں شعور بیدار کرنے کا جو خوف تھا، وہ جنگ کے خاتمہ اور کامیابی کے بعد دور ہو گیا۔ اس لیے اب انکی مزید قید بے معنی تھی۔

حوالہ جات

1 - سید شاہ محمد قادری : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1996ء) ص.267

II - روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 5جنوری1927ء

نوٹ:۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بارے میں جامع اور تفصیلی معلومات کیلئے ملاحظہ کیجیے۔

2 - Mohammad Saleem Ahmed : *The All India Muslim League.* (BahawalPur-1988)

(ترجمہ)

II - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء)

3 - الطاف حسین حالی : حیات جاوید۔ (لاہور-1966ء) ص ص.89-91

II- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ 5اکتوبر1991ء ص ص.7-9

4 - فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء) ص.142

II- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ جنوری1991ء ص ص.3-4

5 - Mohammad Saleem Ahmed :*The All India Muslim League.* (BahawalPur-1988) P-20

II- ماہنامہ : قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل1966ء ص ص.5-9

6 - محمد سلیم احمد : آل انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.38

7 - الطاف حسین حالی : بحوالہ سابقہ۔ ص.163

II- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ جنوری1995ء ص ص-22-25

8 - عاشق حسین بٹالوی : ہماری قوم جدو جہد۔ (لاہور-1966ء) ص ص.255-56

II - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1967ء) ص.321

9 - الطاف حسین حالی : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.164-65

II - محمد اکرام اللہ خاں : وقار حیات۔ (علی گڑھ-1925ء) ص.673

10 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص.81

11 - سید الطاف بریلوی : علی گڑھ تحریکیں اور قومی نظمیں۔ (کراچی-1970ء) ص.20

12 - محمد الیاس فارانی : برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء۔ (کراچی-1968ء) ص.155

II - الطاف حسین حالی : بحوالہ سابقہ۔ ص.164

III - فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء) ص.158

13 - الطاف حسین حالی : بحوالہ سابقہ۔ ص.166

II- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ جنوری1996ء ص ص.34-30

14 - محمد امین زبیری : حیات محسن۔ (علی گڑھ-1934ء) ص.155

II - . . . . . : تذکرہ محسن۔ (دہلی-1935ء) ص.95

15 - الطاف حسین حالی : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.71-170

II- ماہنامہ : ماہ نو۔ کراچی۔ تحریک پاکستان نمبر۔ مارچ1968ء ص ص.43-41

16 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص.75

Mohammad Saleem Ahmed : *Op. cit.,* P-65 - II

17- محمد اکرام اللہ خان : وقار حیات۔ (علی گڑھ-1925ء) ص.693

II - محمد امین زبیری : تذکرہ وقار الملک۔ (اٹاوہ-1925ء) ص.42

18 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.85-84

19 - معین الدین عقیل : مسلمانوں کی جدوجہد آزادی۔ (لاہور-1981ء) ص.76

Mohammad Saleem Ahmed : *Op. cit.,* P-76 - II

III - مرزا اختر حسین : تاریخ مسلم لیگ ۔ (بمبئی-1940ء) ص ص.78-71

Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) P-81 - IV

K.K.Aziz : ***Britain and Muslim India.*** (London-1963) P-63 - V

K.K.Aziz : ***The Making of Pakistan.*** (London-1967) P-29 - VI

20 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.237

II- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق ۔ لاہور۔ فروری،مارچ1979ء ص ص.23-18

Syed Sharifudden Pirzada : ***Foundations of Pakistan : All India Muslim League Documents 1906-1947.*** (Karachi-1970) PP-19-21 - 21

Mussalman. Calcutta. 4, January-1938 (Abdur Rahman Siddiqui : Mohammad Ali) - II

G.Allana : ***Our Freedom Fighters.*** (Lahore-1985) P-272 - III

Mohammad Saleem Ahmed : ***Turkish Coats and Fezes***-A new look at the birth of The All India Muslim League at Dacea. Jounral of the Pakistan. Historical society. Part.II April-1988 P-120 - 22

Mohammad Saleem Ahmed : ***Mohammad Ali : Friend of all, Partisam of none?*** Paksitan Times : Lahore-2 March,1979 - II

II- ماہنامہ : الحق۔ اکوڑہ خٹک۔ پشاور۔ نومبر1975ء ص ص.42-44

23 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-44

II - Mushirul Hasan : ***Mohammad Ali in Indian Politics : Select writings 1906-1916.*** (Karachi-1985) PP-4-13

III - D.Lelyveld : ***Three Aligarh Students*** : Aftab Ahmad Khan, Ziaudin Ahmad and Mohammad Ali, Modern Asian Studies, VIII. 1974 PP-205-11

24 - Syed Sharifudden Pirzada : ***Foundations of Pakistan : All India Muslim League Documents 1906-1947.*** (Karachi-1970) PP-33-44

II - طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.360-361

25 - Syed Sharifudden Pirzada : ***Foundations of Pakistan.*** (Karachi-1970) P-82

II - Allah Bakhash Yusufi : ***Maulana Mohammad Ali Jauhar.*** Vol.1 (Karachi-1970) PP-71-72

III - A.H. Albiruni : ***Makers of Pakistan and Modern Muslim India.*** (Lahore-1950) P-153

26 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-56

II - S.Moinul-Haq : ***Muhammad Ali : Life and Works.*** (Karachi-1978) P-44

III- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ جنوری1997ء ص ص.50-57

27 - Syed Sharifudden Pirzada : ***Foundations of Pakistan.*** (Karachi-1970) PP-198-99

II - سہ ماہی : العلم۔ جوہر نمبر۔ کراچی۔ اکتوبر تا دسمبر1978ء ص.78

III - سید محمد ہادی : علی برادران اور انکار زمانہ۔ (دہلی-1978ء) ص.53

28 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.300

II - Syed Sharifudden Pirzada : *Op. cit.,* PP.199

29 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.302

II- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ فروری، مارچ1979ء ص ص.62-67

30 - ظفر ہاشمی : ہمارے سیاستدان۔ (لاہور-1949ء) ص.73

II- ابو سلمان شاہجہانپوری : مولانا محمدعلی اور انکی صحافت۔ کراچی1983ء ص ص.13-17

31 - Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment.*** (Lahore-1942) PP-34.35

II - Mushirul Hasan : *Op. cit.,* PP-28-34

III - S.Qalb-I-Abid : ***Muslim Struggle for Independence.*** (Lahore-1997) P-32

IV - اشتیاق حسین قریشی : جدوجہد پاکستان۔ (کراچی-1990ء) ص ص.43-42

32 - Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) P.85

منٹومارلے اصلاحات 1909ء: ان اصلاحات کے تحت 1. مرکزی و صوبائی کونسلوں میں ممبروں کی تعداد بڑھادی گئی۔ صوبائی مجالس کی تعداد بڑے بڑے صوبوں میں زیادہ سے زیادہ 50 ارکان تک اور چھوٹے چھوٹے صوبوں میں 30 ارکان تک بڑھادی گئی۔

2. کونسلوں میں ممبروں کے انتخاب کا اصول مروج کیا گیا۔ یعنی اب ممبر منتخب ہو کر کونسلوں میں آنے لگے۔ اور خاص خاص جماعتوں کیلئے جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا۔

3. مرکزی قانون ساز کونسل کے ممبروں کی تعداد 60 کر دی گئی اور ان میں سے 27 منتخب شدہ ممبر ہوتے تھے۔

4. وائسرائے کی انتظامی کونسل میں ایک ہندوستانی ممبر کا تقرر ہوا۔ اور پہلے ممبر لارڈ سنہا تھے۔ وزیر ہند کی کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے۔

5. قانون ساز کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کو سالانہ بجٹ پر بحث کرنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن وہ اسے مسترد نہ کر سکتے تھے۔

33 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mouhammad Ali*** (Lahore-1979) PP-54-55

II - Afzal Iqbal : (Ed) ***Selected writings and speeches of Mohammad Ali.*** Vol.2 (Lahore-1963) PP-71-74

34 - Syed Sharifudden Pirzada : ***Op cit.***, P-201

35 - Ibid., ...P-205

نوٹ:۔ محمد علی سے متعلق اصل اور مکمل خطوط (26 فروری 1909ء تا 16 مئی 1909ء) جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری میں ریکارڈ کے طور پر موجود ہیں۔

II - ایچ۔بی۔خان : برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار۔ (اسلام آباد-1985ء) ص.73

36 - Mushiral Hasan : ***Op. cit.***, PP-35.36

II - سہ ماہی : العلم۔ جوہر نمبر۔ کراچی۔ اکتوبر تا دسمبر 1978ء ص ص.80-79

37 - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.29-27

38 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.75-71

39 - ایضاً . . . . ص 88

-II Daily : ***Pakistan Times.*** Rawalpandi 4 Jan.1984 (Prof. Sharif -Ul-Mujahid

: Maulan Mohammad Ali, The real Leader of Muslim India. P-2)

Francis Robinson : ***Separatism among Indian Muslims.*** (London-1974) - 40

P-369

B.N.Pandey : (Ed) ***Leardership in South Asia (Frances Robinson :*** -II

17 Professional Politicians in Muslim Politics-1911-1923) (Dehli-1977)

PP-374-75

41 - محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء)

ص.89

Daily : ***Muslim News.*** Karachi. 17 Dec. 1978 (Maulana Mohammad Ali, -II

A Great Patriet. P-3)

42 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص ص.60-61

43 - محمد سرور : مضامین محمدعلی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء) ص.65

Daily : ***Muslim News.*** 22 Feb. 1985 (ShahJehan Ali Shah : Maulana -II

Mohammad Ali . A Great Muslim Leader. P-3)

44 - شریف الدین پیرزادہ : پاکستان منزل بہ منزل۔ (کراچی-1965ء) ص.128

Daily : ***Busniss Recorder.*** Karachi. 17 Dec. 1978 (Brohi : Jauhar Belived -II

in Historical Mission of Islam. P-5)

45 - ابو سلمان شاہجہانپوری : محمدعلی اور انکی صحافت۔ (کراچی-1983ء) ص ص.42-45

II- محمد صادق قصوری : تحریک پاکستان اور علماء کرام۔ (لاہور-1999ء) ص.54

III- عشرت رحمانی : سرسید سے قائد اعظم تک۔ (لاہور-1958ء) ص.15

Safdar Muhmood/Javaid Zafar : ***Founders of Pakistan.*** (Lahore-1968) -IV

P-136

46- سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.75

I.H. Qureshi : ***A Short History of Pakistan.*** (Karachi-1992) P-68 -II

Lal Bahadar : ***The Muslim League.*** (Agra-1954) PP-90.91 -47

Civil and Military Gazette : 3-Jan-1913 -II

Syed Sharifudden Pirzada : ***Op. cit.,*** P-250 -III

48 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.301

Afzal Iqbal : (Ed) ***Selected writings and speeches of Mohammad Ali.*** -II

(Lahore-1944) P-29-50

49 - Syed Sharifudden Pirzada : *Op. cit.,* P-258

II- Daily : ***Son.*** Karachi. 21 Dec. 1978 (Ziad-Ud-Din Ahmed : Maulana Mohammad Ali, As I Know Him. P-4)

50 - Shan Mohammad : ***The Indian Muslims.*** Vol.3 (Dehli-1980-83) PP-244.58

51 - میم کمال اوکے : تحریک خلافت۔ (کراچی-1991ء) ص.43

II- Mohammad Sadiq : ***The Turkish Revolution and the Indian Freedom Movement.*** (Dehli-1983) P-30

52 - Shan Mohammad : ***Op. cit.,*** Vol.3 PP-260-65

II - ماہنامہ : نگارِ پاکستان۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ کراچی۔ نومبر دسمبر1978 ص ص.119-23

III- Daily : ***The Muslim World.*** Islamabad. 23 Dec. 1978 (Murtaza Husain : Maulana Mohammad Ali Jauhar. P-5)

53- A.H. Albiruni : ***Makers of Pakistan and Modern Muslim India.*** (Lahore-1950) PP-136-38

II- مجلہ : علم واگہی۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر۔ گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی ص ص.38-46

III- Daily : ***The Muslim World.*** 4 Jan. 1980 (Dr. Afzal Iqbal : Contribution of Maulana Mohammad Ali to Muslim Politics. P-6)

54 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-150-53

II- S.Moinual Haq : (Ed) A ***History of the Freedom movement .*** Vol.3 (Karachi-1979) P-15-31

III- مقالات صدی کانفرنس : بر مولانا محمد علی جوہر۔ (کراچی-1988ء) ص ص.57-61

IV- ماہنامہ : نگار پاکستان۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ جوہر نمبر۔ جنوری2000ء کراچی۔ ص ص.29-36

55 - ایچ۔بی۔خان : بحوالہ سابقہ۔ ص.86

II- Daily : ***The Muslim World.*** 4 Jan. 1991 (Dr. Afzal Iqbal : Mohammad Ali Jauhar. P-3)

56 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.213

II- Ram Gopal : ***Indian Muslims : A Political History.*** (Bombay-1959) P-122

57 - اسٹینلے لین پول : (مترجم: نصیب اختر)سلاطین ترکیہ تا خاتمہ خلافت عثمانیہ۔

(کراچی-1975ء) ص.473

Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.3 Section 2 PP-80-81 - 58

Mohammad Ali : ***The Comrade.*** 11-October-1911 - 59

Daily : ***Morning News.*** Karachi. 4 Jan. 1976 Dr. Rayazul Hasan : -II
Maulana Mohammad Ali Great Struggla for Freedom and Muslim Cuese P-3)

Muhammad Sadiq : ***The Turkish revolution and the Indian freedom Movement.*** (Dehli-1983) P-25 - 60

A.H.Albiruni : *Op. cit.,* P-136 - 61

Daily : ***The Muslim World.*** 15 Jan. 1998 (Dr. Muhmoodur Rehman -II
Maulana Mohammad Ali, A Freedom Fighter. P-3)

Shan Mohammad : *Op. cit.,* PP-185-88 - 62

Daily : ***Morning News.*** Karachi. 18 Dec. 1978 P.5 -II

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-61-63 - 63

Morning News. 4 Jan. 1980 (Irshadul Haq Quddusi : Maulana Mohammad -II
Ali, A Valient Fighter for Freedom. P-5)

Ram Gopal : ***Indian Muslims : A Political History.*** (Bombay-1959) P-122 - 64

A.H. Albiruni : *Op. cit.,* P-155 - II

III - اسٹینلے لین پول : بحواله سابقہ۔ ص ص.470-72

Petar Hardy : ***The Muslims of British India.*** (Cambridge-1973) PP-182-83 - IV

65 - خالدہ ادیب خانم : ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش۔ (لاہور-1963ء) ص.92

66 - اسٹینلے لین پول : بحواله سابقہ۔ ص.473

Daily : ***Morning News.*** 30 Dec. 1977 (Asadd Qadri : Maulana Mohammad -II
Ali, A Valient Fighter for the Cause of Islam. P-3

Mohammad Ali : ***The Comrade.*** 14-June-1913 Dehli - 67

S.M.IKram : ***Modern Muslim India and the Birth of Pakistan.*** (Lahore-1978) P-161 - 68

S.Qalb-I-Abid : ***Muslim Struggle for Independence.*** (Lahore-1997) P-35 - 69

II- روزنامہ : امروز۔ لاہور۔ 12جنوری1979ء (جگن ناتھ آزاد، مولانا محمد علی جوہر ص.2)

Kh. Jamil Ahmed : ***Hundred Great Muslims.*** (Lahore-1984) P-480 - 70

J.A. Hameed : ***Historic Documents of the Muslim Freedom Movement.*** - II

(Lahore-1970) P-155

II- روزنامہ : امروز۔ لاہور۔ 4جنوری1978ء (عشرت رحمانی: مولانا محمد علی جوہر ص.4)

71 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.94

II - راج موہن داس : مسلم افکار۔ (لاہور-1996ء) ص.152

III- Daily : ***Morning News.*** 10 Dec. 1978 (S. Murtaza Husain : Maulana Mohammad Ali Jauhar, A Great Revolotionary. P-3)

72 - ***The Times*** : 6-Novomber-1906 London

II - I.H.Qureshi : ***A Short History of Pakistan.*** (Karachi-1992) PP-177-78

III - S.Qalb-I-Abid : ***Op. cit.,*** P-33

IV- عاشق حسین بٹالوی : ہماری قومی جدوجہد ۔ (لاہور-1966ء) ص.57

73 - Hardinge : ***My Indian years.*** (London-1948) PP-36-40

74 - اشتیاق حسین قریشی : (مترجم: ہلال احمد زبیری) برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ۔ (کراچی-1967ء) ص.350

II - Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment .*** (Lahore-1942) P-37

III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی ۔ (دہلی-1931ء) ص ص.29-28

IV- روزنامہ : امروز۔ لاہور۔ 4جنوری1980ء (قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند : مولانا محمد علی جوہر ص.3)

75 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.51-250

II - Afzal Iqbal : (Ed) ***Selected writings and speeches of Mohammad Ali.*** (Lahore-1944) P-155

76 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-61-63

II- روزنامہ : امروز۔ لاہور۔ 5جنوری1979ء (محمد اقبال یوسفی :اسلامیان برصغیر کا بے باک رہنما ص.7)

77 - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.30-29

II - S.M./J.Zafar : ***Founders of Pakistan.*** (London-1950) PP-171-80

III - Aga Khan : ***The Memories.*** (London-1954) PP-128-29

78 - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali*** (Lahore-1979) PP-91-94

II - سید محمد ہادی : علی برادران اور انکار زمانہ۔ (دہلی-1978ء) ص.95

III- روزنامہ : امروز۔ لاہور۔ 4جنوری1985ء (قاضی عبدالرسول :بطل جلیل مولانا محمد علی جوہر ص.6)

79 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.67

II - محمد سرور : مولانا محمدعلی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.96

80 - S.Moinual Haq : (Ed) ***A History of the Freedom Movement.*** Vol.3 (Karachi-1979) P-145

II - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali*** (Lahore-1979) P-97

III - واحد ندوی جامپوری : یادوں کے چراغ ۔ (ڈیرہ غازی خان-1967ء) ص.79

81 - خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931ء) ص.33

II - سید اشتیاق اظہر : تاریخ کانپور۔ (کراچی-1990ء) ص.83

III - رئیس احمد جعفری : علی برادران ۔ (لاہور-1963ء) ص.330

82 - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص ص.64-65

II - Mushiral Hasan : ***Mohammad Ali in Indian Politics : Select Writtings 1906-1916*** (Karachi-1985) P.151

83 - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص ص.65

84 - ایضاً ص.60

II - Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment.*** (Lahore-1942) P-97

III - عبدالرشید ارشد : بیس بڑے مسلمان ۔ (لاہور-1975) ص.205

IV - محمد صادق قصوری : اکابرین تحریک پاکستان۔ حصہ اول۔ (گجرات-1976ء) ص.180

V - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.79

85 - ایضاً . . . . ص ص.341-45

II - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص.66

86 - ایضاً . . . . ص ص.67-73

II - Allah Bakhsh Yusufi : ***Maulana Muhammad Ali Jauhar.*** (Karachi-1970) PP-69-75

III - محمد علی چراغ : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1997ء) ص ص.521-31

IV- روزنامہ : مساوات۔ کراچی۔ 21جون1976ء (ابو سلمان شاہجہانپوری : محمد علی جوہر صرف انسانی وجود کا نہیں بلکہ صدائے حق کا نام تھا۔ ص.7)

Mohammad Mujeeb : ***The Indian Muslims.*** (London-1967) PP-538-39 - 87

88 - محمد سرور : مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941) ص ص.20-32

II - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص ص.148-49

89 - ایضاً . . . . ص ص.150-52

II - محمد علی جوہر : ہمدرد دہلی۔ 23دسمبر1913ء

III - محمد سرور : مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941) ص ص.33-34

IV - خورشید علی مہر : درسِ آزادی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1932ء) ص ص.70-85

90 - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص ص.221-41

Choudhry Khaliquzzaman : ***Path way to Pakistan.*** (Lahore-1993) P-18 - 91

Allah Bakhsh Yusufi : ***Maulana Muhammad Ali Jauhar.*** (Karachi-1970) PP-242-43 - 92

II - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.253-54

Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment.*** (Lahore-1942) P-133 - 93

II- روزنامہ : مساوات۔ 5جنوری1977ء (پروفیسر اویس احمد : مولانا محمد علی جوہر ص.4)

G.Allana : ***Quaid-e-Azam .*** (Lahore-1988) P-74 - 94

95 - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ (سیاسی) (کراچی-1978ء) ص ص.221-41

Hary.J.Greenwel : ***His Highness, The Aga Khan, Imam of the Ismailias.*** (London-1952) PP-110-13 - II

Syed Razi Wasti : ***Momories and other Writings of Syed Amir Ali.*** (Lahore-1968) PP-95-99 -III

Mushiral Hasan : ***Mohammad Ali in Indian Politics : Select Writting 1917-1919*** Vol-2 (Karachi-1985) P-285 - 96

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-103 - 97

Syed Sharifudden Pirzada : ***Op. cit.,*** PP-313,321-22 - II

III- روزنامہ :مساوات۔ 3مارچ1979ء(وقار احمد کراچی یونیورسٹی : مولانا محمد علی جوہر کا قومی کردار ص.5)

98 - محمد سرور : مولانا محمدعلی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.104

II - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.73

99 - ایضاً ص.75

II - محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.105

-100 Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.5 PP-140-49

II - قاضی محمد عدیل عباسی : تحریک خلافت۔ (لاہور-1986ء) ص ص.50-51

III - میم کمال او کے : تحریک خلافت۔ (کراچی-1991ء) ص.19

- 101 Kh. Jamil Ahmed : ***Hundred Great Muslims.*** (Lahore-1984) P-479

- II S.M.IKram : *Op. cit.,* P-116

- III Safdar Muhmood/Javaid Zafar : *Op. cit.,* P-141

- IV A.H.Albiruni : *Op. cit.,* PP-155-56

برطانیہ اور اسکے اتحادی:-

1- برطانیہ 2- فرانس 3- اٹلی 4- امریکہ 5- جاپان 6- بلجیم 7- بولویا 8- برپریل 9- چین 10- کیوبا 11- زیکوسلوکیا 12- یونان 13- پولینڈ 14- پرتگال 15- رومانیہ۔ دیگر چھوٹی ریاستوں کی شمولیت سے مجموعی تعداد تقریباً17 تھی۔

-102 Muhammad Sadiq : *Op. cit.,* PP-30-37

-103 سید محمود : خلافت اور انگلستان۔ (پٹنہ-س ن) ص.82

II - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.81-82

III - رئیس احمد جعفری : علی برادران ۔ (لاہور-1963ء) ص.632

- IV Muhammad Sadiq : *Op. cit.,* PP-37-39

-104 حمیدہ ریاض : محمدعلی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص.104

-II روزنامہ : تجارت۔ لاہور۔ 28جنوری1977ء (حکیم راحت سوہدروی : محمد علی جوہر ص.7)

-105 Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.4 P-109

- II Muhammad Sadiq : *Op. cit.,* P-41

III - میم کمال او کے : بحوالہ سابقہ۔ ص.48

-106 اسٹینلے لین پول : بحوالہ سابقہ۔ ص.484

II - سید محمود : خلافت اور انگلستان ۔ (پٹنہ-س ن) ص ص.79-80

III - خالدہ ادیب خانم : بحوالہ سابقہ۔ ص.111

خفیہ معاہدہ (1) فریقین (ترکی اور جرمنی) اسٹریا، ہنگری اور سرویا کی موجودہ لڑائی میں غیر جانبدار رہیں گے۔ (2) اگر روس سرویا کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تو ایسی صورت میں جرمنی اپنے سابقہ معاہدہ کی رو سے پابند ہوگا کہ آسٹریا، ہنگری کی مدد کرے، اور ترکی پر بھی جرمنی کا ساتھ دینے کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ (3) اگر فرانس نے ترکی مقبوضات پر حملہ کیا تو جرمنی اسکی مدافعت میں مدد کرے گا۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو اسے اپنی مسلح افواج بھی بھیجنا پڑیں گی۔

107- سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.81-82

II - سید محمود : بحوالہ سابقہ۔ ص.82

III - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.632

-108 Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.5 PP-10-40

109- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص.52

110- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.249

II - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.111

111- مجلّہ : تحریکاتِ ملی ۔ ابو سلمان شاہجہانپوری، پروفیسر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی کراچی۔ ص ص.274-75

112- ایضاً . . . .

113- محمد عدیل عباسی : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.70-72

II- روزنامہ : تجارت۔ لاہور۔ 12اپریل1977ء (صادق حسین طارق : مولانا محمد علی بطل حریت۔ ص.4)

-114 Syed Sharifudden Pirzada : *Op. cit.,* PP-332-33

115- محمد علی چراغ : تاریخِ پاکستان۔ (لاہور-1993ء) ص ص.283-86

II - . . . : پاکستان منزل بہ منزل۔ (لاہور-1984ء) ص.53

-116 M.Hasan : ***Nationalism and Communal Politics in India. : 1916-1928*** (Delhi-1974) PP-23-27

II - محمد علی چراغ : تاریخ پاکستان۔ (لاہور-1993ء) ص ص.286-87

-117 Petar Hardy : ***The Muslims of British India.*** (Cambridge-1973) PP-59-62

II - سید طفیل احمد منگلوری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.315-17

118- ایضاً . . . . ص ص.327-30

II - پروفیسر محمد سعید : حصول پاکستان۔ (لاہور-1975ء) ص ص.312-15

119- عبدالوحید خان : مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی۔ (لکھنو-1938ء) ص ص.90-92

-120 Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.5 PP-50-55

121- اسٹینلے لین پول : بحوالہ سابقہ۔ ص.486

II- ماہنامہ : علی گڑھ میگزین۔ جنوری1936ء ص ص.85-184

-122 Syed Sharifudden Pirzada : *Op. cit.,* PP-351-57

-123 اسٹینلے لین پول : بحوالہ سابقہ۔ ص.488

-124 ایضاً . . . . ص ص.90-488

خفیہ معاہدے:.

1.**معاہدہ قسطنطنیہ :.** 18مارچ1915کو برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا۔ جس میں یہ طے پایا کہ روس، قسطنطنیہ، باسفورس اور درہ دانیال کے مغربی ساحل پر قبضہ کر سکتا ہے۔ لیکن قسطنطنیہ کی بندرگاہ اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کیلئے کھلی رہے گی۔ یعنی یہ نا قابل مداخلت علاقہ ہوگا اور برطانیہ کے حلقہ اثر میں رہے گا۔ عرب میں ایک آزاد اسلامی حکومت کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ اس میں روس نے وعدہ کیا کہ اگر ضرورت پڑی تو درہ دانیال کے حملے میں اتحادیوں کی مدد کرے گا۔

2. **معاہدہ لندن:.** 26اپریل1915ء کو برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی کے درمیان ہوا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ اٹلی کو بھی شریک جنگ بنایا جائے۔ اٹلی کو ایشیائی ترکی کی تقسیم کے وقت بعض علاقے مثلاً عدالیہ کا صوبہ اور اس سے متصل جزیرہ روم کے ساحلی علاقے کا ایک معقول حصہ دینے کا وعدہ کیا گیا۔

3.**معاہدہ سائیکس پیکو:.** (Sykespicot) روس، فرانس اور برطانیہ کے درمیان16 مئی1916ء کو ہوا۔ جس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم ہی کی تجویزیں تھیں۔ عربوں کو دولت عثمانیہ کا باغی بنانے اور عرب ملکوں کی ایک وفاقی حکومت بنانے کی تجویز تھی۔ اس میں ریلوے اور بندرگاہوں سے متعلق بعض حقوق کا بھی ذکر تھا۔

4. **معاہد سین زان ڈمارین:.** (St.jean Demaurienne) 17اپریل1917ء کو اٹلی کے مطالبات کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ اٹلی معاہدہ سائیکس پیکو کے متوقع فوائد میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ اس میں ایشیائے کوچک کے مغربی علاقے پر جس میں سمرنا بھی شامل تھا، اٹلی کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ بالشویک انقلاب کی وجہ سے اس معاہدہ پر روس کے دستخط نہ ہو سکے تھے۔

5. **کلیمینسو لائڈ جارج معاہدہ:.** لندن میں دسمبر 1918ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا۔ میسوپوٹامیہ میں برطانیہ کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ لہذا معاہدہ سائیکس پیکو میں تبدیلی کرتے ہوئے فرانس نے موصل کا علاقہ اپنے حصے سے نکال کر برطانوی حلقہ میں شامل کر دیا اور اس کے عوض فرانس نے برطانیہ سے شمالی میسوپوٹامیہ کے تیل کے ذخیروں میں اپنے حصے کا وعدہ لے لیا۔

-125 Mushiral Hasan : ***Mohammad Ali in Indian Politics.*** Vol.II
(Karachi-1985) PP-281-82

-126 رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص ص.53-251

- II M.Hasan : ***Mohammad Ali : Ideology and Politices.*** (Delhi-1981)
PP-212-15

127- سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.95-89

128- محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء)
ص ص.11-110

II- روزنامہ : زمانہ۔ لاہور۔ 18جنوری1979ء (جگن ناتھ آزاد: مولانا محمد علی جوہر ص.3)

129- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص ص.63-262

II- روزنامہ : زمانہ۔ کوئٹہ۔ 7جنوری1977ء مولانا محمد علی جوہر۔ ص.3

130- مہاتما گاندھی : تلاش حق۔ (لاہور1993ء) ص ص.55-453

- II Shan Mohammad : ***Op. cit.,*** Vol.5 PP-72-79

-131 J.M.Brown : ***Gandhi's Rise to Power, Indian Politics. : 1915-1922***
(Cambridge-1972) PP-155-57

II - مہاتما گاندھی : تلاش حق۔ آپ بتیی ۔ (لاہور-1993ء) ص ص.85-580

-132 J.M.Brown : ***Op. cit.,*** PP.160-63

II - راج موہن داس : مسلم افکار۔ (لاہور-1996ء) ص.157

133- ایضاً . . . .

- II J.M.Brown : ***Op. cit.,*** PP.201-11

-134 M.Hasan : ***Mohammad Ali : Ideology and Politices.*** (Delhi-1981)
PP-279-83

- II Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-142

- III S.Muhammad : ***Freedom Movement in India : The Role of Ali Brothers.***
(Delhi-1979) PP-95-99

IV- روزنامہ : کوئٹہ۔ 18اکتوبر1977ء مولانا محمد علی جوہر ص.3

135- رفیق غوری : جب پاکستان بن رہا تھا۔ (لاہور-1982ء) ص.93

II - مفتی انتظام اللہ شہابی : مشاہیر جنگ آزادی ۔ (کراچی-1957ء) ص ص.99-295

III - رئیس احمد جعفری : کاروان گم گشتہ ۔ (کراچی-1971ء) ص.42

IV - عزیزالرحمٰن جامعی : جنگِ آزادی کے مسلم مجاہدین۔ حصہ سوم۔ (دہلی-1975ء) ص.170

V - سید محمد ہادی : علی برادران اور انکار زمانہ۔ (دہلی-1978ء) ص ص.67-60

136- غلام حسن ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص.42

II - مہاتما گاندھی : تلاشِ حق۔ (آپ بتیی) (لاہور-1993ء) ص ص.10-607

-137 Rupert Furnaeux : ***Massacre at Amritsar.*** (London-1963) P-35

II - پروفیسر احمد سعید : حصولِ پاکستان ۔ (لاہور-1986ء) ص.397

III - غلام حسین ذوالفقار : جلیانوالہ باغ کا قتل اور مظالم پنجاب۔ (لاہور-1996ء) ص.25

IV - مہاتما گاندھی : تلاشِ حق۔ (آپ بیتی) (لاہور-1993ء) ص ص.33-631

باب سوم

محمد علی اور تحریک خلافت

1919ء - 1924ء

1919ء محمد علی کی رہائی کا سال سیاست بر صغیر پاک و ہند میں تحریک خلافت ، مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات، رولٹ ایکٹ، ستیہ گرہ اور سانحہ جلیانوالہ باغ کی وجہ سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانانِ ہند حکومت برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے جنگِ عظیم میں خلافت ترکیہ اور مسلمانوں کے ساتھ جذباتی وابستگی کے باوجود افرادی قوت کے ساتھ عملاً انگریز کے حلیف ہوئے۔ لیکن اب انکا یہ خوابِ شیریں خوابِ پریشان ثابت ہو رہا تھا۔ کہ مسلمان متحد ہو کر خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپی عفریت کے پنجوں سے چھڑا لیں گے۔ کیونکہ جنگ میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہی برطانیہ نے مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر سلطنت ترکیہ کے حصے بخرے کرنے کی دیرینہ خواہش پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ استنبول خلافت کا مرکز تھا۔ اور دارالخلافہ پر عیسائیوں کے قبضے سے خلیفہ اور سلطان کی ظاہری و روحانی حیثیت پر آنچ آنا یقینی بات تھی۔ مسلمانوں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ ترکی کی تقسیم سے مقاماتِ مقدسہ آئندہ کیلئے غیر مسلموں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ خلافت کا خاتمہ ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ انہی اندیشہ ہائے دور دراز کے تحت مسلمانانِ ہند نے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے درمیان ترکی کے مسئلہ پر مکمل اتفاق رائے اور اتحاد و یکجہتی پایا جاتا تھا۔

محمد علی ابھی نظر بند تھے کہ عارضی صلح نامہ کی رو سے ترکوں کو نہایت ذلت آمیز شرائط پر مجبور کر دیا گیا۔[1] انگریزوں نے قسطنطنیہ پر پنجہ استبداد گاڑ لیا۔ موصل پر بھی انگریزوں نے جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ ترکی کے خلاف یہ کاروائیاں مسلمانانِ ہند کیلئے ناقابل برداشت تھیں۔ ردِ عمل کے طور پر ہندوستان میں احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 17 جنوری 1919ء کو مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن کی صدارت میں احتجاجی جلسہ ہوا۔[2] جس میں حکومتِ برطانیہ کو اسکے وعدے یاد دلائے گئے۔ اور ترکی کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے حسب دعاوی تلافی پر زور دیا گیا۔ ایک طرح سے یہ خلافت تحریک کا نقطۂ آغاز تھا۔ چند روز بعد 26 جنوری 1919ء کو لکھنو میں انجمن اسلام کے زیرِ انتظام مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صدارت میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔[3] جس میں یہ موضوع خصوصیت سے زیرِ بحث آیا کہ خلافت، حرمین شریفین اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کیلئے کوئی مستقل منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ جلسہ میں یہ بات بھی واضح کی گئی کہ سلطان ترکی عالم اسلام کے خلیفہ ہیں۔ اور ان سے متعلق معاملات و مسائل میں غیر مسلموں کو مداخلت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مزید یہ کہ بشمول استنبول سلطنت ترکیہ میں شامل مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کا انتظام خلیفہ ہی کے ہاتھ میں

رہے۔ جلسے کے آخر میں یہ اعلان بھی شامل تھا کہ جو بھی امن سمجھوتہ ان شرائط کا لحاظ کئے بغیر طے ہوا وہ ناقابلِ قبول ہوگا۔ مذکورہ فیصلوں کی روشنی میں ایک فتویٰ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو علمائے ہند کے دستخطوں سے برطانیہ بھیجا جانا تھا۔[4] خلافت تحریک ارتقائی منازل طے کرنے لگی۔ زبانی اور تحریری احتجاجی کاروائیاں شروع ہوگئیں۔ 3مارچ 1919ء کو مسلمانوں نے برطانوی سیکریٹری برائے ہندوستان کو اس سلسلے میں ایک الٹی میٹم بھیجا۔ جس میں ترکی کی بقاو استحکام کا مسئلہ خصوصیت سے درج تھا۔[5]

محمد علی جنھیں ترکی کی حمایت میں انگریزوں پر بے باکانہ تنقید کی وجہ سے مئی 1915ء میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور تاحال نظر بند تھے۔ وہ بھی ترکوں کے اندرونی معاملات میں اتحادیوں کی مداخلت اور زیادتیوں کی وجہ سے شدید ذہنی کرب کا شکار تھے۔ انہوں نے حالتِ اسیری ہی میں وائسرائے ہند مسٹر چمسفورڈ (بحیثیت وائسرائے 1916ء 1921ء) کو 24اپریل 1919ء کو ایک طویل خط لکھکر درخواست کی، کہ خلافت کے معاملے میں دست درازی نہ کی جائے۔ اور مقبوضہ علاقے ترکوں کو واپس کر دیئے جائیں۔[6] محمد علی نے خط میں مسلم وفاداری و حمایت، مسئلہ خلافت اور اسکی نوعیت، امن کانفرنس، مقامات مقدسہ، جزیرۃالعرب، ترکی کے ساتھ برطانیہ کا رویہ، اسلامی قانون کی وجہ سے مسلمان کا مسلمان کے ساتھ لڑنا اور مسلم مطالبات کے تحفظ کے بارے میں دلائل و براہین کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اور ہمدردانہ غور کی اپیل کی۔ اسی قسم کے خطوط انہوں نے دیگر حکام کو بھی تحریر کئے۔[7] اس سلسلے میں محمد علی نے صرف انگریزی حکام سے ہی رابطہ نہیں رکھا۔ بلکہ مختلف ریاستوں کے حکمران جن میں مہاراجہ آف ہلکر، نواب آف جاورہ وغیرہ سر فہرست تھے۔ جنھیں بذریعہ خطوط مسائل کی نوعیت سے آگاہ کیا۔[8] گاندھی (1869ء -1948ء)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عبدالرحمٰن صدیقی (1887ء -1953ء) وغیرہ سے انکا مسلسل رابطہ تھا۔ محمد علی کے ان روابط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر چھندواڑہ جیل میں مزید سختیاں عائد کرتے ہوئے گورنمنٹ کا اعلان شائع ہوا جس میں کہا گیا کہ :-

> "سرحد میں معرکہ آرائی شروع ہونے کے وقت سے گورنمنٹ ہند کو اسکے ناقابلِ متنازعہ ثبوت پہنچے ہیں۔ کہ یہ دونوں بھائی (محمد علی-شوکت علی) مسلمانانِ ہند کو اسکی ترغیب دینے کی ہر ممکن کوششیں کر رہے ہیں۔ کہ وہ امیر افغانستان کو حضور شہنشاہ معظم کے خلاف انکی لڑائیوں میں عملی مدد دیں۔"[9]

ترکی کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے سلسلے میں صرف مسلمانانِ ہند ہی مضطرب نہیں تھے۔ بلکہ عالمی سطح پر بھی مسلمانوں میں شدید دکھ اور کرب پایا جاتا تھا۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ میں مقیم مسلمانانِ ہند نے 17جولائی 1919ء کو وہائٹ ہال کو ایک عرضداشت پیش کی۔ کہ امن کانفرنس میں انکے ترکی سے متعلق احساسات و جذبات کا خیال رکھا جائے۔ اس سے پہلے بھی اسی قسم کی عرضداشتیں یا محضر نامے برطانیہ میں مقیم ہندوستانی مسلمان 3مئی اور 14جون کو وہائٹ ہال کو بھیج چکے تھے۔[10] مسلمان مسئلہ خلافت اور ترکی کے سلسلے میں شدید پریشانی کا شکار تھے کہ مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات 1919ء کا نفاذ عمل میں آیا۔ جس نے نا صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہل ہند میں ہیجان پیدا کر دیا۔ کیونکہ دورانِ جنگ حکومتِ برطانیہ نے ہندوستانیوں کو آئندہ اصلاحات کے سلسلے میں جو سبز باغ دکھائے تھے۔ یہ انکے برعکس تھیں۔ خصوصاً

حکومتِ خود اختیاری کا جو وعدہ ہندوستانیوں سے کیا گیا، وہ بھی پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے یہ اصلاحات تمام ہندوستانیوں کیلئے نا قابل قبول تھیں۔ اہل ہند اپنی خدمت کے صلے میں ان اصلاحات کو ناکافی سمجھتے تھے۔ اس چیز نے حکومت کے خلاف عوامی بے چینی و اضطراب میں مزید اضافہ کر دیا۔ جب ملک کے اندر بے چینی کا اصحابِ اقتدار کو علم ہوا تو وائسرائے ہند نے جسٹس سر سڈنی رولٹ کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ تحقیقات کر کے بتائے کہ ملک کے اندر بے چینی اور حکومت کے خلاف منفی رجحانات کی نوعیت کیا ہے؟ اور اسکے خاتمے کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ تحقیق و تفتیش کے بعد کمیشن نے 18 جنوری 1919ء کو دو بل :۔

1. Indian Criminal (Amendment) Bill No.1 of 1919 (Which was Punitive in Character)
2. The Criminal Law (Emergency Powers) Bill No.II of 1919 (Deals with preventive measures)

شائع کئے۔[11] جنھیں 6 فروری 1919ء کو امپریل لیجسلٹو کونسل میں پیش کر دیا گیا۔ جب یہ بل اسمبلی میں پیش ہوئے تو دیسی اراکین نے بیک زبان انکے خلاف احتجاج کیا۔ بل کی مخالفت میں مختلف الخیال اراکین متحد و متفق تھے۔[12] احتجاج و مخالفت کے باوجود رولٹ بل کو چھ ماہ تک ملتوی کرنے کی ترمیم یورپین ممبروں کی کثرت رائے سے مسترد ہو گئی۔ 18 مارچ 1919ء کو چند معمولی ترامیم کے ساتھ کونسل نے رولٹ بل پاس کر دیا۔ اور 21 مارچ کو وائسرائے کی توثیق کے بعد یہ قانون کا حصہ بن گیا۔[13] بل کی منظوری پر مسٹر جناح، مسٹر مظہر الحق (1866ء - 1930ء) اور پنڈت مدن موہن مالویہ احتجاجاً کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ رولٹ ایکٹ مارشل لاء کا ہم پلہ اور شہری آزادی کے قطعی منافی تھا۔ گاندھی (جو سیاست ہند میں نووارد تھے) نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ردِ عمل کے طور پر "ستیہ گرہ" تحریک شروع کر دی۔[14] جسکے تین پہلو اہم تھے۔

1. کونسلوں کا بائیکاٹ
2. عدالتوں کا بائیکاٹ
3. سرکاری امدادی اسکولوں کا مقاطعہ اور قومی درسگاہوں کا قیام

اگرچہ اس تحریک کے لیڈر گاندھی تھے۔ لیکن تمام ہندوستانی عدم تشدد اور اہمسا پر مبنی انوکھے نسخے "ستیہ گرہ" کو آزمانے کیلئے تیار ہو گئے۔ مسلمان بھی انکا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ "ستیہ گرہ" کے معاہدہ پر دستخط کرنے والے مسلم راہنماؤں میں مولانا ابو الکلام آزاد (1888ء - 1958ء)، حکیم اجمل خان (1863ء - 1927ء)، عباس طیب جی، عمر ثوبانی (1895ء - 1926ء)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سیٹھ یعقوب حسن اور چودھری خلیق الزماں (1889ء - 1973ء) وغیرہ سر فہرست تھے۔[15] گاندھی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب ترلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ابھی جنگِ عظیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ گاندھی نے مارچ 1918ء میں ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کر کے انکی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک مقصد یعنی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں پھر وہ کیوں نہ آپس میں تعاون کریں۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ خصوصاً ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ گاندھی کی اس درخواست سے اندازہ ہوتا ہے کہ

انہیں ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کی اہمیت کا پوری طرح احساس ہونے لگا تھا۔[16] لیکن صحیح معنوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون 1919ء سے پہلے ممکن نہ ہو سکا۔ مارچ 1919ء میں گاندھی لکھنؤ گئے۔ اور وہاں مولانا عبدالباری سے ملکر ان سے درخواست کی کہ وہ انکی ستیہ گرہ تحریک میں شامل ہوں۔ اسطرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے کافی قریب آگئے۔ درحقیقت ایسا کرنے میں دونوں قوموں کے مفادات پوشیدہ تھے۔ کیونکہ الگ الگ پلیٹ فارم سے حکومت پر دباؤ ڈالنا اور اپنے مطالبات منوانا ناممکن تھا۔ دونوں قومیں حکومت کے جبر و تشدد کی پالیسی کے خلاف متحد ہو چکی تھیں۔ جس سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت پہنچی۔ جسکی بین مثال آریہ سماج کے رہنما سوامی شردھانند کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر کی۔[17] اور مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد کے ذوق و شوق میں ہوش کی بجائے جوش سے کام لیتے ہوئے ایسا کرنے دیا۔ حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ اقدام سراسر غلط تھا۔ ارشاد ربانی ہے کہ :-

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا ٥

ترجمہ:۔ مشرکین تو صرف نجس و ناپاک ہیں۔ پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب بھی نہ جائیں۔

اس آیت کی رو سے مشرکین کو نجس و ناپاک قرار دیا گیا ہے۔ اور انھیں نزولِ آیت کے وقت کے بعد سے قیامت تک کے لیے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ مسجدِ حرام کے اس حکم پر قیاس کرتے ہوئے تمام مساجد اس زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن مسلمانانِ ہند رواداری میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے حکم ربانی کی بھی پرواہ نہ کی۔ ستیہ گرہ کی حمایت میں سارے ہندوستان میں جلسے اور تقریریں شروع ہو گئیں۔ 7اپریل 1919ء کو گاندھی کو دہلی جاتے ہوئے راستے میں گرفتار کر لیا گیا تاکہ وہ پنجاب نہ جا سکیں۔ کیونکہ صوبہ پنجاب حکومت کے خلاف کافی متحرک ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں گاندھی کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔ جسکے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ ہندو مسلم اتحاد ہی میں ملک کی بھلائی ہے۔ اور اس اتحاد کو قائم کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں پر ہے۔ گاندھی کی گرفتاری پر تمام ہندوستان میں بالعموم اور احمد آباد و مدراس میں بالخصوص سخت بلوے ہوئے۔[18] بدامنی کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کیلئے سر مائیکل اوڈائر (1864ء -1940ء) گورنر پنجاب نے سارے علاقے میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اور سیاسی جلسے جلسوں پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن رام نومی کی تقریب سے فائدہ اٹھا کر گورنر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 11اپریل 1919ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جلسہ کا اعلان کر دیا گیا۔ امرتسر میں سیف الدین کچلو (1884ء-1963ء) اور ڈاکٹر ستیہ پال "ستیہ گرہ" کے سلسلے میں پیش پیش تھے۔ انہیں ڈپٹی کمشنر (Barron) نے ملاقات کے بہانے بلا کر گرفتار کر لیا۔ جس سے عوام مشتعل ہو گئے۔ ہندوستانی جو "ستیہ گرہ" کے بنیادی اصول "سچ" اور "عدم تشدد" کو سمجھ نہیں پائے تھے، حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرکاری املاک کو نذر آتش کرنے اور انگریز افسروں کو قتل کرنے کے سنگین واقعات پیش آئے۔ 13اپریل کو جنرل ڈائر نے چار سو سے زائد آدمیوں کے مجمع پر پابندی لگا دی۔ لیکن عوام نے اس حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی شام جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ اس خلاف ورزی پر جنرل ڈائر تلملا اٹھا، فوج اور مشین گنوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا اور فائر کھول دیئے۔ اس کاروائی کے نتیجے میں تقریباً 379 ہندوستانی ہلاک اور 1200 زخمی ہوئے۔[19] اس واقعہ نے ہندوستانیوں کو مزید مشتعل کر دیا۔ اور حکومت کے خلاف انکی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔

ایک طرف رولٹ ایکٹ اور سانحہ جلیانوالہ باغ نے ہندوستانیوں کو حکومتِ وقت کے خلاف سرگرم عمل کر دیا تھا۔ دوسری طرف مسلمانانِ ہند نے محسوس کیا کہ ترکی کے بارے میں انکے زبانی اور تحریری احتجاج و مطالبات کے باوصف برطانوی رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ توانہوں نے اپنی آواز کو موثر طریقے سے پہنچانے کیلئے ایک تنظیم کے قیام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ موجود تھی۔ جو عام طور پر آئینی حقوق کیلئے جدوجہد کر رہی تھی۔ اسکے مقاصد زیادہ تر سیاسی تھے۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ نے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا یقین بھی اپنے منشور میں دلایا تھا۔ اسلیئے بعض جدت پسند اور انقلابی مسلمان رہنماؤں کا خیال تھا کہ مذہبی نوعیت کی ایک ایسی جماعت قائم کی جائے۔ جو ہر قسم کے سیاسی خدشات سے ہٹ کر انکے حقوق کیلئے جدوجہد کرے۔ جسکی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلم لیگ پر کسی قسم کی قانونی ذمہ داریاں عائد نہ ہوں اور انہیں سیاسی سرگرمیوں کیلئے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوسکیں۔ انہی خیالات و نظریات کے حامی تقریباً 15 ہزار مسلمانوں کا ایک بڑا اجتماع 20 مارچ 1919ء کو بمبئی میں ہوا۔ جسکے آخر میں آل انڈیا مرکزی خلافت کمیٹی تشکیل دی گئی۔[20] بقول پروفیسر محمد سلیم احمد

> "---- 1919ء میں اپنا سیاسی تشخص برقرار رکھنے کیلئے مسلم لیگ نے الگ خلافت کمیٹی بنانے میں سرگرمی سے مدد کی۔ اس خلافت کمیٹی نے ایک مذہبی اور سیاسی تہذیب کی قیادت کی۔ جو مختصر وقت کیلئے ہندوستانی امور پر چھائی رہی اور اس سے ہندوؤں کے ساتھ ایک نئی طرح کے سمجھوتے نے جنم لیا۔ جس میں ہندوؤں کی طرف سے ایم۔اے گاندھی (1869ء -1948) نے نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ اس وقت کانگریس میں ایک ابھرتی ہوئی قوت تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے علی برادران یعنی محمد علی اور شوکت علی پیش پیش تھے۔"[21]

اگرچہ محمد علی نے تحریک خلافت کے آغاز اور خلافت کمیٹی کے قیام کے سلسلے میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ اسکی وجہ انکی نظربندی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ملکی حالات وواقعات سے بے خبر تھے، یا انہیں مسلمانوں کے مسائل و معاملات سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ انکی تڑپ اور دکھ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ کیونکہ نظر بند ہونے کی وجہ سے وہ عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے معذور تھے۔ ان مجبوریوں اور بندشوں کے باوجود محمد علی کے خطوط اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ بحیثیت مسلمان وہ دوران قید بھی اپنے دینی فرائض سے غافل نہ رہے۔ تحریک کی کمان محمد علی کے پیر طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محل کر رہے تھے۔ جنھوں نے خلافت کمیٹی کی طرح ڈال کر تحریک کو منظم و مستحکم راہوں پر ڈالا۔ یعنی تحریک خلافت کے سلسلے میں زمین ہموار کرنے اور تخم ریزی میں مولانا عبدالباری نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اور جب محمد علی قید فرنگ سے رہا ہو کر باہر آئے تو متفقہ طور پر تحریک کی کمان انہیں سونپ دی گئی۔ کیونکہ تحریک جس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی وہاں پرجوش راہنماؤں کی ضرورت تھی اور محمد علی کی یہ خوبی اظہر من الشمس تھی۔ تحریک کی کمان سنبھالنے کے بعد محمد علی نے خلافت کمیٹی کے متفقہ فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سخت سرگرمی دکھائی اور میر کارواں کہلائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا عبدالباری کے مرید محمد علی بھی ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں اپنے مرشد کے

ہم خیال تھے۔ گاندھی کے ساتھ انکا مسلسل رابطہ تھا۔ گاندھی کا عقیدہ تھا کہ محمد علی کی شخصیت ہندو مسلم اتحاد کے قیام اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے خاتمے کیلئے انتہائی موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ اسلیئے وہ محمد علی کی رہائی سے بہت سی امیدیں وابستہ کر چکے تھے۔ اندولال یاجنیک سے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ :۔

"مجھے سہارن پور کے ہندو مسلم فساد اور اسکی ہولناکیوں اور بیرحمانہ مظاہروں سے سخت اذیت پہنچی ہے۔ لیکن اس معاملہ میں تنہا میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ علی برادران (محمد علی و شوکت علی) کے بغیر میں اس آگ کو بجھانے سے قاصر ہوں۔ جونہی وہ رہا ہوئے میں انکے ساتھ یوپی جاونگا اور اسی خون سے جو وہاں اس بیدردی سے بہایا گیا ہے۔ اپنے ہندو اور مسلمان بھائیوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دونگا۔ میں اسی پر اکتفانہ کرونگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ گئو رکھشا کیلئے بھی میں ان دونوں بھائیوں کی امداد حاصل کر سکوں گا۔ اگر انکے دلوں میں ہندوؤں کی حقیقی عزت ہوگی تو انکے نازک احساسات کی خاطر ضرور اپنے ہم مذہبوں کو گاؤکشی سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے۔"[22]

22 ستمبر 1919ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محل کی زیرِ صدارت لکھنو میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے تقریباً پانچ ہزار مسلمان مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں منظور کی جانے والی قرادادوں میں یہ آٹھ نکات سرفہرست تھے۔

1. خلیفہ اسلام کی روحانی و اخلاقی طاقت اور حیثیت، اسکی مادی اور جسمانی طاقت و اقتدار کے بغیر بے معنی ہے۔
2. مسلمانوں کے مقدس مقامات پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔
3. اناطولیہ اور ترکی کے یورپی حصے کو ترکوں کے قبضے میں رہنے دیا جائے۔
4. یونانی ازمیر (سمرنا) اور مغربی اناطولیہ کو خالی کر دیں۔
5. ترکوں کے ساتھ صلح سے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے خدشات برطانوی حکومت کے گوش گذار کر دیئے جائیں۔
6. 17 اکتوبر کو خلیفہ کے عزت و وقار کا دن منایا جائے۔
7. بمبئی میں واقع خلافت کمیٹی کو مرکزی حیثیت دی جائے اور سارے ملک میں اسکی شاخیں قائم کی جائیں۔
8. کانفرنس میں کی جانے والی تقریروں اور فیصلوں کی رپورٹ تیار کی جائے۔

کانفرنس کے اختتام پر خلیفہ ترکی کو مسلمانانِ ہند کی طرف سے ایک خصوصی پیغام بھی بھیجا گیا جس میں انکو بھرپور حمایت اور وفاداری کا یقین دلایا گیا۔[23]

مسئلہ خلافت اور ترکی کے سلسلے میں اگر علماء کرام اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف مسلم لیگ بھی تعاون کرتے ہوئے سرگرم عمل تھی۔ 3 نومبر 1919ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی وزیرِ ہند کو ایک احتجاجی ٹیلگرام روانہ کیا۔ جس میں انگریز وزیراعظم کی شیفیلڈ میں کی گئی تقریر میں ترکوں سے متعلق مختلف ریمارکس پر سخت غم و غصہ کا اظہار

کیا گیا اور اس سے متعلق مختلف سوالات بھی کئے گئے۔[24] اس عرصے میں ممتاز مسلم لیڈروں اور عمائدین نے انگریزی پریس میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے اور احتجاجات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر ہندوستانی مسلمان کا دل ترکی کے ساتھ زیادتیوں پر تڑپ رہا تھا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم بھی اس چیز کو محسوس کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں سر تھیوڈر ماریسن سابق پرنسپل علی گڑھ کالج نے اپنے ایک مضمون میں برطانوی عوام کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"اب وقت آگیا ہے کہ برطانوی پبلک اس نزاکت کو پہچانے جو کچھ مشرق میں ہو رہا ہے۔ ترکی کی مجوزہ تقسیم پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ آپ ذرا ان مسلمانوں سے ملکر دیکھیں جو لندن میں موجود ہیں۔ اور اندازہ کریں کہ انکے دلوں میں اس مسئلہ کے متعلق کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں پشاور سے لیکر ارکاٹ تک مسلمان جوش سے بھرے ہوئے ہیں ----دیوبند اور ندوہ کے عالم جنکا سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں، اپنے حجروں سے نکل آئے ہیں۔ اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ مسلمان اس غم میں سب کچھ بھول گئے ہیں۔"[25]

گاندھی بھی مسلمانوں کی اس رائے کی پوری حمایت کر رہے تھے کہ ترکی اور ترک حق پر ہیں۔ اور انکو انکا حق ملنا چاہیے۔ انہوں نے خلافت اور خلیفہ سے متعلق مسلمانوں کے خدشات و خواہشات کا پورا پورا ساتھ دیا۔ گاندھی نے اپنے پیروکاروں اور حامیوں کو تاکید کی کہ وہ بھی خلافت کانفرنس میں شریک ہوں۔ اور مسلمانوں کا ساتھ دیں۔[26] آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنو کے بعد 22 نومبر 1919 کو دہلی میں ہندو مسلم راہنماؤں پر مشتمل خلافت کانفرنس کا اجلاس مولوی فضل الحق (1873ء -1962ء) کی صدارت میں ہوا۔ نمایاں ہندو لیڈروں میں گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سوامی شردھانند اور مدن موہن مالویہ وغیرہ شامل تھے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ اتحادیوں اور حکومتِ برطانیہ سے انکے وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کیا جائے۔ یہ اجلاس اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں انگریزوں کے خلاف بعض اہم فیصلے کئے گئے تھے کہ :۔

1. ہندوستانی باشندے فتح کے جشن میں حصہ نہیں لیں گے۔
2. ترکی کے ساتھ صلح کا خاطر خواہ سمجھوتہ نہ کیا گیا تو انگریزی حکومت کے ساتھ عدمِ تعاون کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔
3. انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے گا اور ایک وفد برطانیہ روانہ کیا جائے گا۔
4. کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ان فیصلوں پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کیلئے مختلف ذیلی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔[27]

اگر یہ کہا جائے کہ تحریک خلافت سے متعلق آئندہ کا لائحہ عمل یا فیصلے اس کانفرنس میں طے کر لیئے گئے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ خلافت کمیٹی نے عملی اقدامات پر غور و فکر کرنے کیلئے ایک خصوصی کانفرنس 23 نومبر 1919ء بمقام دہلی منعقد کی جسکی صدارت گاندھی نے کی۔ مسٹر آصف علی صدر استقبالیہ نے گاندھی کو دعوت نامہ جاری کرتے ہوئے اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ مسئلہ خلافت کے ساتھ ترک گاؤکشی کا مسئلہ بھی حل کیا جائے گا۔[28] یہ حرکت سوامی شردھانند کو جامع مسجد کے منبر پر لے

جانے سے بھی بری تھی، بلکہ احکام اسلامی کی خلاف ورزی تھی۔ قران پاک میں ارشاد ہے کہ :۔

لم تحرم مااحل الله لك ٥

ترجمہ: ۔ کیوں تم نے حرام کرلیا ہے اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے۔ (1:44)

یا ایها الذین امنو لا تحرمو اطیبت ما احل الله لکم والاتعتدو ا - ان الله لا یحب المعتدین ٥

ترجمہ: ۔ مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیئے حلال کی ہیں انکو حرام (ترک) نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو۔ بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (8 : 87)

جہاں تک ہندوؤں سے اتحاد کا تعلق ہے سیاسی اتحاد وقت کی ضرورت تھی، مذہبی اتحاد نہیں کہ دینی احکام ہی کو ترک کردیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے کہ :۔

یا ایها الذین امنو لا تتخذ و ا الکفرین اولیاء من دون المومنین اتریدون ان تجلعوا الله علیکم سلطنامبینا ٥

ترجمہ: ۔ اے اہل ایمان! مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لو۔ (144:4)

یہ اقدام انتہائی غلط تھا کہ مسلمان مشرکین کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے اپنے دینی احکام ہی سے دستبردار ہو جائیں۔ بقول امام کعبہ شیخ علی عبدالرحمٰن الخذیفی

> "مسلمانو! تم اسلامی احکام سے کتنے ہی دور ہو جاؤ۔ کفار تم سے کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ بلکہ (انکو خوش رکھنے کی جائے) اپنے دین اور اپنے حقوق کا دفاع کرو۔"[29]

گاندھی جو سمجھ دار اور سیاسی چالوں کے ماہر تھے۔ وہ جذباتی مسلمان کی کمزور رگ سے واقف بھی تھے، انہوں نے دعوت نامے کے جواب میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ "گئورکھشا" کے مسئلے کو ایجنڈے سے نکال دیا جائے۔ گاندھی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ :۔

> "ہم ہندو اپنی روایات پر اعتماد کر کے، اسکو عزت کی بات نہیں سمجھتے کہ ایک مذہبی معاملے میں ہمدردیاں پیش کرنے کے عوض کوئی چیز لیں۔ اگر یہاں کوئی ایسے ہندو ہیں۔ جو اپنے دلوں میں یہ خیال لیکر آئے ہیں۔ تو انکو چاہیے کہ اسکو ترک کردیں۔"[30]

یہ ایسی زبردست چال تھی کہ مولانا عبدالباری بھی اس پھندے میں پھنس گئے اور رواداری میں گاؤکشی بند کرنے کا فتویٰ دے دیا۔ سادہ لوح اور مخلص مسلمان یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ انہی گاندھی نے تو 1917ء میں لارڈ اروِن (1881ء-1959ء) کو

گاؤکشی کے بارے میں انتہائی شدید خط لکھا تھا۔ جو "اسٹیٹسمین" میں بھی شائع ہوا تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ :۔

> "غلط یا صحیح گائے کی پوجا ہندو کی فطرت میں شامل ہے اور مجھکو اس سے کوئی مفر نظر نہیں آتا کہ عیسائی اور مسلمان ایک طرف ہوں، ہندو دوسری طرف، اور انکے درمیان اس مسئلے پر نہایت متعصبانہ اور خونی جنگ ہو ---- لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جس کو یہ توقع نہ ہو کہ وہ ایک دن اپنے ملک کو گاؤکشی سے پاک کرے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ہندو مذہب کے مزاج کے خلاف وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرے گا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کو بزور شمشیر گاؤکشی کے ترک پر مجبور کرے۔" [31]

اب اچانک پانسہ کیسے پلٹ گیا؟ متضاد بیانات کے باوجود مسلمانوں نے گاندھی کو مخلص جان کر اپنا لیڈر مان لیا۔ اسی کانفرنس میں مولانا عبدالباری فرنگی محل نے گاندھی سے متاثر ہو کر کہہ دیا کہ :۔

> "خواہ ہندو ہماری مدد کریں، خواہ نہ کریں۔ مسلمانوں کو اپنے برادران وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤکشی ختم کر دینا چاہیے۔" [32]

قیام جمعیت العلمائے ہند

خلافت کانفرنس کے اسی اجلاس میں برصغیر کے علماء جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محل، مولانا محمد انیس، پیر محمد امام، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا قدیر بخش بدایونی سمیت تقریباً 25 علماء تھے، جنھوں نے ایک علیحدہ جلسہ منعقد کر کے فیصلہ کیا کہ ایک جمعیت قائم کی جائے۔ جسکا نام "جمعیت العلمائے ہند" رکھا جائے۔ اور اس تنظیم کے پرچم تلے وہ علماء و ماہرین جمع کئے جائیں۔ جو سیاسی اور بین الاقوامی واقعات کا اسلامی علوم اور اصولوں کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کیلئے راہنما اصول مرتب کر سکیں۔ اس جمعیت کے صدر مفتی کفایت اللہ اور سیکرٹری مولوی احمد سعید (1887ء-1959ء) منتخب ہوئے۔ [33]

خلافت کانفرنس کے انعقاد کے بعد 12 دسمبر 1919ء کو خلافت کمیٹی نے برطانوی وزیر اعظم کو ایک عرضداشت بھیجی۔ جس میں واضح کیا کہ اناطولیہ یورپی حصہ (رومیلیہ) اور استنبول ترک قوم کی سرزمین کا جزو لاینفک ہیں۔ سلطنت ترکیہ کو پارہ پارہ کرنا تو دور کی بات ہے، ترکی کے کسی ایک حصے میں بھی کوئی غیر ملکی نظام قائم ہوا تو مسلمانوں کو شدید صدمہ اور مسلم قوم کے وقار کو زبردست دھچکا پہنچے گا۔ یہ انکے مذہب کی بھی توہین ہوگی۔ چنانچہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ترکوں کے ساتھ کوئی ایسا امن سمجھوتہ کیا جائے جو باعزت، منصفانہ اور پائیدار ہو۔ [34]

دسمبر 1919ء کے آخری ہفتہ میں کانگریس، مسلم لیگ، جمعیت العلمائے ہند، اور خلافت کانفرنس کے اجلاس امرتسر میں ہو رہے تھے، ان میں شرکت کیلئے محمد علی کو بیتول جیل سے رہائی کے بعد سیدھے امرتسر آنے کی دعوت دی گئی۔ وہ امرتسر پہنچے اور ان چاروں انجمنوں کے اجلاسوں میں جو مختلف مقاصد کے باوجود قومی آزادی کے مطالبے پر متفق

تھیں شریک ہوئے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی :۔

"مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانانِ ہند کی شرکت تھی۔ کیونکہ وہ اپنے علم و فضیلت، اسلام نوازی، جرات، حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم لیڈر بن چکے تھے۔"[35]

محمد علی امرتسر پہنچے تو حکیم اجمل خان کے صدارت میں مسلم لیگ کا بارہواں سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ جب آپ جلسہ گاہ میں پہنچے تو اس وقت اجلاس میں مختلف امور اور مسائل سے متعلق قراردادیں زیر بحث تھیں۔ لیکن ان پر بحث ملتوی کر دی گئی۔ اور محمد علی کو اجلاس سے خطاب کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے پر جوش تقریر کی۔ رولٹ بل کی مخالفت کرتے ہوئے حکومت پر نکتہ چینی کی۔ علامہ اقبال (1877ء-1938ء) نے اس اجلاس میں محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے ان اشعار میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند	قطرہ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے	مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر	کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست	ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند[36]

اگرچہ رہائی کے بعد محمد علی دیوانہ وار خلافت تحریک میں کود پڑے۔ لیکن مسلم لیگ سے انکی محبت، شیفتگی اور وابستگی بدستور رہی۔ 30 دسمبر 1920ء بمقام ناگپور مسلم لیگ کا تیرھواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی زیرِ صدارت ہوا۔ اس اجلاس کی کاروائی کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں مسلم لیگ کا مقصد "پُر امن اور آئینی ذرائع سے ہندوستان کے عوام کیلئے آزادی کا حصول" قرار پایا۔ اس قرادر کی تحریک محمد علی کی طرف سے گئی تھی۔[37] مسلم لیگ کا چودھواں سالانہ اجلاس 30 دسمبر 1921ء بمقام احمد آباد مولانا حسرت موہانی (1877ء-1951ء) کی صدرات میں ہوا۔ اور پندرھواں سالانہ اجلاس 31 مارچ 1923 بمقام لکھنو محمد علی جناح کی زیرِ صدارت ہوا۔ جن میں محمد علی نظر بند ہونے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ البتہ سولھواں سالانہ اجلاس منعقدہ 30-31 دسمبر 1924ء بمقام بمبئی سید رضا علی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا اس اجلاس میں تیسری اور چوتھی قراداد پر بحث کے دوران محمد علی نے بھی حصہ لیا۔[38]

31 دسمبر 1919ء کو مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا اس میں گاندھی اور محمد علی جناح نے بھی شرکت کی تھی۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ محمد علی کی سربراہی میں ایک وفد یورپ بھیجا جائے۔ جو برطانیہ اور اسکے حلیفوں کو (جو مفتوح ترکوں سے صلح کی شرائط طے کرنے والے تھے۔) مسلمانانِ ہند کی طرف سے باور کرائے کہ خلافت کا ادارہ مسلمانوں کیلئے مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ اور خلافت کی عظمت و توقیر کے لیے سلطنتِ ترکی کی سالمیت اور قوت کا برقرار رہنا ضروری ہے۔[39] یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ اقبال جو چند روز قبل مسلم لیگ کے بارھویں سالانہ اجلاس امرتسر میں محمد علی پر اشعار کی صورت میں عقیدت کے پھول نچھاور کر چکے تھے، وہ وفد خلافت کے یورپ جانے کے خلاف تھے۔ یورپ جانے سے پہلے محمد علی نے ہندو مسلم لیڈروں کا ایک مشترکہ وفد ترتیب دیا۔ خود اسکا میموریل تیار کیا۔

یہ وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سربراہی میں 19 جنوری 1920ء کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ چمسفورڈ سے ملا اور انہیں ہندوستان کی مسلم رعایا کے جذبات سے اگاہ کیا۔[40]

وفد خلافت یورپ میں

تحریک خلافت کے سلسلے میں محمد علی کی مجاہدانہ خدمات کا تجزیہ کرنے سے پیشتر ضروری ہے کے ان تمام سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سرانجام دیں۔ ان تمام کوششوں اور خدمات میں محمد علی کا جذبہ اسلامی جھلکتا نظر آتا ہے۔ محمد علی کی سربراہی میں وفد خلافت یکم فروری 1920ء کو ہندوستان سے روانہ ہوا اور مارچ میں لندن پہنچا۔ رئیس وفد نے انگلستان میں تمام دستاویزات پیش کر کے تہلکہ مچادیا۔ لیکن جہاں صرف بھیڑیوں کی حکومت ہو وہاں حق وانصاف کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ 2 مارچ 1920ء کو وفد نے وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو کے نمائندے برطانوی وزیر مسٹر فشر سے ملاقات کی۔ محمد علی نے دوران گفتگو اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ صلح کے مذاکرات میں جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ محمد علی نے ان الزامات کا بھی جواب دیا۔ جو یورپ میں ترکوں پر عائد کئے جارہے تھے۔[41] انہوں نے واضح کیا کہ یہ الزامات محض مذہبی ولسانی تعصبات اور حسد کی بنا پر عائد کئے جارہے ہیں۔ جب مسٹر فشر نے کہا کہ وزیراعظم لائڈ جارج (1863ء-1945ء) اپنی مصروفیات کی وجہ سے وفد سے نہیں مل سکتے۔ تو محمد علی نے انکی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی۔ کہ اس سے قبل برطانوی وزیراعظم، یونانی وزیراعظم وینی زی لوس (Venizelos) سے کئی بار ملاقات کر چکے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یونانی، آرمینی، اور یہودی آزادی کے ساتھ ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی وزیراعظم کا دفتر) میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ سہولت حاصل نہیں۔[42] آخر کافی جدوجہد کے بعد محمد علی کو وفد کے ہمراہ مارچ 1920ء میں وزیراعظم برطانیہ لائڈ جارج سے ملاقات کی اجازت ملی۔ وزیراعظم نے وفد کے ساتھ انتہائی سردمہری، غرور وتکبر اور نخوت کا مظاہرہ کیا۔ اسکے باوجود محمد علی نے صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے تفصیلاً اپنا مدعا بیان کر دیا۔ اور آخر میں وزیراعظم کو یہ بھی باور کروادیا کہ اگر انھیں تاج برطانیہ سے وفاداری اور انکے مذہبی اعتقادات کے درمیان کسی ایک چیز کو چننے پر مجبور کیا گیا تو وہ بلاشبہ اپنی رائے اسلام کی حمایت میں دیں گے۔[43] محمد علی نے وزیراعظم کے رویے سے مایوسی کے بعد برطانوی باشندوں کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی۔ جیسکے لیئے 23 مارچ 1920ء کو ایسکس (Essox) ہال میں اینگلو انڈین ایسوسی ایشن کے سیکریٹری مسٹر آرتھر فیلڈ نے ایک جلسہ عام منعقد کروایا۔ وہ ترکوں کے زبردست دوست تھے۔ جلسے کی صدارت مارماڈیوک پکتھال نے کی، جو سوسائٹی کے صدر تھے اور مسلمان ہوچکے تھے۔ (آخر میں ہندوستان آگئے تھے۔ حیدرآباد کے مشہور رسالہ "اسلامک کلچر" (IslamiCulture) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ "Meaning of the Glorious Quran" کے مصنف کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔) انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں لائڈ جارج کے بیانات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا۔ محمد علی نے اپنی تقریر میں لائڈ جارج کی سردمہری، نخوت اور جانبدارانہ رویے پر افسوس کا اظہار کیا۔[44]

محمد علی نے اپنی تقریروں سے نہ صرف انگلستان میں انگریزوں اور انکی حکومت کے ضمیر کو مسئلہ خلافت پر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ امریکہ اور سپریم کونسل جسکا اجلاس سان ریمو میں ہو رہا تھا، جس میں سلطنت ترکی کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، اسکی توجہ بھی مسئلہ خلافت کی طرف مبذول کرائی۔ کانفرنس میں وفد نے اپنے خیالات پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ لیکن لائڈ جارج نے اپنے فاتحانہ غرور میں محمد علی کی درخواست کو رد کر دیا۔ محمد علی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی کوشش سے کنگسوے ہال میں ایک بڑا اجتماع کروا کر انگریزوں کی زبان میں انگریزی حکومت کی عیاری و مکاری کا پول کھول دیا۔ اس جلسہ کی صدارت اس زمانہ کی لیبر پارٹی کے مشہور لیڈر السبری نے کی۔[45] محمد علی نے ٹی۔جی۔پارنی مین کی صدارت میں مانچسٹر میں ایک جلسہ کرایا۔ پھر کیبرج مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے وفد کو دیئے گئے عشائیے میں محمد علی نے اجتماع سے خطاب کیا۔ وفد اڈنبرا اور آکسفورڈ گیا۔ دوبارہ پیرس کا سفر کیا۔ محمد علی 24 اپریل 1920ء کو پیرس پہنچے۔ جہاں انہوں نے وزیر اعظم میلے ران (Millerand) اور حکومت کے اراکین سے ملاقات کر کے اپنے دورے کی غرض و غایت سے اگاہ کیا۔ الٹا فرانسیسی وزیر اعظم نے وفد کو "معقول رویہ" اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اراکینِ وفد نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ اخباروں کے دفاتر گئے۔ مختلف جلسوں میں شرکت کی اور ورسائی (Versailles) پہنچ کر عثمانی امن کمیٹی سے بھی ملاقات کی۔ محمد علی نے فرانسیسیوں کو بھی اپنے موقف سے اگاہ کیا اور اپنی لسانی و علمی قابلیت سے منطق دلائل کی حد کر دی۔ وہ جزیرۃ العرب کے لوگوں سے بھی ملے اور انہیں خلیفہ ترکی کے اقتدار کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ کرنے کی کوششیں کیں۔[46] وہ جہد مسلسل میں مشغول رہے۔ ٹیونس، مراکش، حجاز اور مصر کے وفود سے ملاقاتیں کیں۔ اور اپنے خیالات و مقاصد کا موثر انداز میں اظہار کیا۔[47] لیکن یہ کاوشیں ثمر آور ثابت نہ ہوئیں۔ محمد علی وفد کے ہمراہ لندن سے ترکی جانا چاہتے تھے لیکن لارڈ کرزن نے وزیرِ ہند کے ایما پر انہیں ترکی جانے کی اجازت نہ دی۔ لندن سے وفد خلافت نے ایک رسالہ "مسلم اوٹ لک" (Muslim out look) بھی جاری کیا۔ جس میں وفد کی کارکردگی کی تفصیلا روئیداد شائع ہوتی تھی۔[48] ستم یہ کہ لندن میں وفد کی سرگرمیوں کے بارے میں انگریزی پریس نے غلط خبریں اور پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس نے وفد کے بارے میں منفی رجحانات کو جنم دیا۔ محمد علی کے ترکوں کی حمایت میں ادا کئے گئے کلمات کا سخت نوٹس لیا گیا۔ حتیٰ کہ ان پر لوگوں کو مشتعل کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ برطانوی حکومت کسی بھی شہری کو اپنی حکمت عملی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔[49] لیکن محمد علی ایسے حربوں اور پروپیگنڈے سے خائف نہ ہوئے۔ اور جرات مندی کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھا۔

محمد علی وفد کے ہمراہ 23 جولائی 1920 کو روم گئے۔ وہاں انہوں نے اطالوی وزیر اعظم جیولیٹی (Giolitla) سے ملاقات کی اور اچھے تاثرات کے ساتھ واپس آئے۔ پھر اور ویٹیکن میں پوپ سے ملاقات کی۔ 6 اگست 1920ء کو سوئزرلینڈ گئے۔ جہاں انہوں نے طلعت پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے اراکین کے ساتھ ملاقات کی۔ انہوں نے ایشیائی مسلمانوں کی طرف سے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنی حمایت کا پورا پورا یقین دلایا۔[50] وفد خلافت ابھی یورپ ہی میں تھا کہ ترکی پر معاہدہ سیورے ٹھونس دیا گیا۔ خلیفہ ترکی نے مجبوراً 10 اگست 1920ء کو اس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔[51] اگرچہ وقتی طور پر محمد علی کی تمام کوشش، جملہ تقاریر اور کل پروپیگنڈہ بے سود ثابت ہوا۔ لیکن محمد علی نے دول متحدہ اور اہل عرب کے ضمیر کو

جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہندوستان، مصر، افغانستان اور تمام بلاد اسلامیہ کے سامنے مسئلہ کی صحیح صورت پیش کی۔ جس سے بڑی طاقتوں کا ظلم کھل کر سامنے آگیا۔ برطانوی حکومت نے اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ایفائے عہد کرنے والی قوم نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ قوت کے دیوتا کو سجدہ کرتی اور پوجتی ہے۔ اور کمزور کے لیے ان کے ہاں باعزت جگہ نہیں۔

ع ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ دور بین اور مصلحت شناس نہیں۔ بلکہ "وقت شناس" ہے۔ جو وقت پر سب کچھ کر گزرتی ہے۔ جسکا بین ثبوت معاہدہ سیورے ہے۔ بظاہر وفد خلافت ناکام رہا۔ لیکن پہلی دفعہ مشرق نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود مغرب کو دعوتِ مبارزت دی۔ اہل ہند کا تنفر انگریزی حکومت سے پہلے ہی بڑھ رہا تھا وفد کی ناکامی نے اس میں مزید شدت پیدا کر دی۔ وفد خلافت تقریباً آٹھ ماہ تک یورپ کے مختلف ممالک میں تگ و دو کرتا رہا اور اکتوبر 1920ء کی ابتدائی تاریخوں میں واپس بمبئی آیا۔ اگرچہ بظاہر وفد ناکام رہا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ محمد علی نے اپنے فرائض ملی کی انجام دہی کیلئے رات دن محنت کی۔ اور واپسی پر اہل ہند کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کیا تاکہ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ جائے۔ بقول محمد علی

> "حضرات آپ نے جو کام تجویز فرمایا تھا۔ اسے ہم نے ہر ایک جائز طریقے سے انجام دیا۔ متحدہ ہندوستان نے آل عثمان کا مسئلہ اور پیام دول یورپ تک پہنچانے کا جو فرض ہمارے سپرد کیا تھا۔ ہم نے اسے آپکی خواہش کے موجب ان تک پہنچا دیا۔ ہمارے اختیار میں یہ بات تو نہ تھی کہ صلح کانفرنس کے فرامین کو ہم درہم برہم کر دیتے۔ یا بہ جبر اپنی بات منوا لیتے۔ لیکن وفد کے سپرد جو خدمت کی گئی تھی اسے ہم نے نہایت ایمانداری اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا---- میں نے ہر طرح سے احتیاط کی تھی کہ کوئی دھمکی استعمال نہ کی جائے۔ کیونکہ وفد کی غرض و غایت انس و مصالحت کی تھی۔ ہندوستان دھمکی دینا نہ چاہتا تھا۔ بلکہ انگلستان کو متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس ظلم کی تلافی کرے جو مسئلہ خلافت میں لاکھوں مسلمانانِ ہند پر توڑا گیا ہے۔ ہندوستان کو اپنے اندرونی امن و امان کی فکر انگلستان سے بڑھ کر ہے۔ اگر یہاں فساد اور بد امنی ہو تو اس سے ہندوستان کو نقصان پہنچے گا نہ کہ مسٹر لائڈ جارج یا کسی اور برطانوی مدبر کو۔"[52]

محمد علی کو اس دورے کے دوران جو تلخ تجربات ہوئے۔ اس سے انہوں نے جو سبق سیکھا۔ اسکے بارے میں 20 اکتوبر 1920ء کو لاہور کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

> "ہمارا ارادہ یورپ میں تین چار ماہ سے زیادہ ٹھہرنے کا نہ تھا۔ لیکن ہم نے آٹھ مہینے صرف کر دیئے۔ اٹلی گئے، فرانس گئے، سب جگہ پھرے لیکن جو سبق ہم نے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ بھائیو! خواہ معاملہ خلافت کا ہو، پنجاب کا یا سوراج کا، تم کو انگلستان کی کسی جماعت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، اوپر خدا پر بھروسہ رکھو اور نیچے خود اپنے اوپر۔"[53]

تحریکِ ترکِ موالات و عدمِ تعاون

محمد علی انگلستان ہی میں تھے کہ ترکِ موالات و عدمِ تعاون کی قرارداد منظور کر لی گئی۔ ترکِ موالات کے پروگرام پر غور کرنے کیلئے بمبئی میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اور 28 مئی 1920ء کو کمیٹی نے اس پروگرام کو منظور کر لیا جو گاندھی "ینگ انڈیا" میں شائع کروا چکے تھے۔ 30 مئی 1920ء کو کانگریس کا بھی اجلاس ہوا۔ لیکن اس نے فوری فیصلے کی جائے ستمبر 1920ء کو کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ یکم جون 1920ء کو گاندھی نے ترکِ موالات پروگرام کے سلسلے میں ایک ہندو مسلم کانفرنس بلالی۔ اس کانفرنس میں مسز بیسنت، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر سپرو، موتی لال نہرو، مسٹر چنتامنی (1880ء - 1941ء) اور دیگر لیڈر موجود تھے۔ اعتدال پسند لیڈروں نے ترکِ موالات کی مخالفت کی۔ مگر انکے اعتراضات کو رد کر دیا گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کانفرنس سے پہلے ہی گاندھی 5 مئی 1920ء کو اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں ترکِ موالات کے چار مرحلے از خود اختراع کر کے پیش کر چکے تھے۔[54]

1. خطابات اور اعزازی عہدوں کا ترک کرنا۔
2. سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی۔
3. پولیس اور فوج سے علیحدگی۔
4. ٹیکسوں کی ادائیگی روک دینا۔

خلافت کمیٹی اس قدر گاندھی کے زیرِ اثر آچکی تھی کہ اس نے بلا چون و چرا ترکِ موالات کے پروگرام کو تسلیم کر لیا۔ بلکہ خلافت کمیٹی تو اپنی پہلی کانفرنس منعقدہ دہلی 23 نومبر 1919ء کو ہی کلی اختیار گاندھی کو تفویض کر چکی تھی۔ 9 جون 1920ء کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں حکومت کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 13 جون 1920ء کو بنارس میں کانگریسی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں خلافت کمیٹی سے کہا گیا کہ وہ مجلس ترک موالات کے نام سے ایک انتظامی مجلس بنائے اور مفصل پروگرام بنا کر اس پر عمل درآمد کرائے۔ 22 جون 1920ء کو گاندھی اور خلافت کمیٹی نے الہ آباد کے فیصلے سے لارڈ چمسفورڈ کو بذریعہ خط آگاہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ :-

> "اگر یکم اگست 1920ء تک پیش کردہ شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو ترکِ موالات شروع کر دیا جائے گا۔"[55]

اسی روز گاندھی نے اپنی خدماتِ سرکار کا حوالہ دیتے ہوئے وائسرائے سے اپیل کی کہ :-

> "وہ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق طے کرا دیں، ابھی وقت ہے۔ ورنہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے تین راستے باقی ہیں۔ 1. جہاد 2. ہجرت 3. ترکِ موالات۔ میں نے مسلمانوں کو ترکِ موالات کا مشورہ دیا ہے۔"[56]

اسکے علاوہ جون 1920ء کے آخر میں مظہر الحق، یعقوب حسن، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ مسلم رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد وائسرائے سے ملا اور کہا کہ خلافت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کیلئے ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ اسلیئے آپ

برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال کر ترکی کے ساتھ معاہدہ صلح میں ہمارے مطالبات کے مطابق مناسب ترمیم کرادیں۔ ورنہ ہم مجبور ہو جائیں گے کہ یکم اگست 1920ء سے ترکِ موالات کی تحریک پیش کر دیں۔ گاندھی ترکِ موالات کے سلسلے میں اسقدر مستعد تھے کہ انہوں نے 7 جولائی 1920ء کو خلافت کمیٹی کی "مجلس ترکِ موالات" کی طرف سے عدمِ تعاون کے پہلے مرحلے کیلئے درج ذیل تجاویز بھی پیش کر دیں۔[57]

1. خطابات اور عہدوں سے دستبرداری۔
2. سرکاری قرضوں میں عدم شرکت۔
3. قانون پیشہ لوگوں کا اپنی وکالت ترک کرنا اور نجی پنچائتوں کے ذریعے سول تنازعات کا تصفیہ کرنا۔
4. سرکاری مدارس کا بائیکاٹ۔
5. کونسلوں کا مقاطعہ۔
6. سرکاری تقریبات میں شرکت سے انکار۔
7. میسوپوٹیمیا اور کسی قدیم ترکی عملداری میں گورنمنٹ کی فوج یا سول ملازمتوں سے انکار۔
8. ولائتی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کا آغاز۔

کانگریس نے کافی سوچ بچار کے بعد ترکِ موالات کے پروگرام کو اپنے خصوصی اجلاس کلکتہ میں بصدارت لالہ لاجپت رائے 6 ستمبر 1920ء کو منظور کیا۔ اور اسکے کچھ عرصہ بعد کانگریس کے سالانہ اجلاس ناگپور دسمبر 1920ء میں اسکی توثیق کی گئی۔[58] خصوصی اجلاس کلکتہ (6 ستمبر 1920ء) ہندوستان کی تاریخ میں "سوراج" کے مطالبے کے لحاظ سے اہم ترین تھا۔ اس اجلاس کی تمام تفصیلات گاندھی کے ایک رفیق اور موقع کے گواہ اندولال یاجنیک نے اپنی کتاب "Gandhi As I Know Him" میں بیان کی ہیں۔ انکے علاوہ خود گاندھی اپنی سوانح حیات "تلاشِ حق" میں لکھتے ہیں کہ :۔

> "---- میں نے ریزولیوشن میں ترکِ موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف پر مجبور کیا جائے۔ یہ بات وجیار اگھو چاری جی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا "اگر ترکِ موالات کرنا ہی ہے تو اسے کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرانے کیلئے کیوں کیا جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ "سوراج" سے محروم ہے اسکی چارہ جوئی کیلئے ترکِ موالات کرنا چاہیے۔ پنڈت موتی بھی یہی چاہتے تھے۔ کہ ریزولیوشن میں سوراج کے مطالبے کا اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی۔ اور اپنے ریزولیوشن میں "سوراج" کا مطالبہ بھی شامل کر لیا۔ کانگریس میں اسکے ہر پہلو پر نہایت گرمی سے بحث ہوئی۔ جس میں کبھی کبھی تندی اور تلخی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ریزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔"[59]

واقعات سے ظاہر ہے کے بحیثیت ہندو گاندھی ہندوؤں کے طرفدار تھے۔ کانگریس نے "سوراج" کا مطالبہ ترکِ موالات کے ساتھ مشروط کر کے تحریک خلافت کو مذہبی کی بجائے سیاسی رنگ دے دیا۔ پنڈت جواہر لال (1889ء-1964ء)

نہرو لکھتے ہیں کہ :۔

" 1920ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی۔ دونوں ایک ہی راستہ پر چلنے لگیں۔ آخر جب کانگریس نے گاندھی کے پرامن ترکِ موالات کا اصول تسلیم کر لیا تو دونوں بالکل مل گیں۔ خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی۔" [60]

یکم اگست 1920 کو الٹی میٹم کے مطابق مسلمانوں نے گاندھی کی معیت میں ترکِ موالات کا آغاز کر دیا۔ گاندھی نے اپنے تمام تمغے اور سندیں جو انہیں برطانوی حکومت کی خدمت کے سلسلے میں ملی تھیں واپس کر دیں۔ یکم اگست 1920ء ہی کو لوکمانیہ تلک کا طویل بیماری کے بعد بمبئی میں انتقال ہو گیا۔[61] مسٹر تلک کی وفات اور گاندھی کی تحریک کا بیک وقت آغاز ہونا اس بات کی علامت تھی کہ آج سے گاندھی ہندوستانی سیاست کے اس بلند مقام پر پہنچ گئے جس پر ربع صدی سے لوکمانیہ تلک فائز رہے تھے۔ اسکے لیئے گاندھی کو مضبوط سیاسی پلیٹ فارم مسلمانوں نے فراہم کر دیا۔

محمد علی جب انگلستان سے واپس آئے تو ترکِ موالات و عدمِ تعاون کے الفاظ ہر ہندوستانی کی زبان پر عام تھے۔ علماء کرام جو عرصہ دراز سے جمود و تعطل کا شکار تھے، اب میدانِ عمل میں آچکے تھے وہ نہایت جانبازی اور اخلاص کے ساتھ انگریزی حکومت کے خلاف صف آراء ہو گئے تھے۔ محمد علی نے آتے ہی اس تحریک میں نئی جان ڈال دی۔ ترکِ موالات کے پس منظر، مسئلہ خلافت اور مسئلہ آزادی ملک کے ایک جامع پروگرام اور مشترکہ حکمت عملی کے تحت اس "ذریعہ" کی اہمیت کے بارے میں محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ :۔

" تحریک ترکِ موالات کی محرک ---- دراصل برطانیہ کی وہ وعدہ خلافیاں ہیں۔ جو اس نے مسلہ خلافت اور مظالم پنجاب کی تلافی کے سلسلے میں کی تھیں۔ تحریک ترکِ موالات کے رہنماوں کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ باشندگان ہند کی شکایات کا ازالہ "سوراج" لینے سے ہی ہو سکتا ہے۔ گو تحریک خلافت کا مقصد ابتداء میں خلافت عثمانیہ کا تحفظ اور جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ لیکن کارکنان خلافت نے فوراً بعد ہی اپنے مقاصد میں حصول "سوراج" بھی داخل کر لیا۔ جو مذکورہ دو مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی تھا اور بجائے خود ایک عظیم مقصد بھی۔" [62]

محمد علی تحریک ترکِ موالات کو کامیاب بنانے کے لیے اس زمانے کے سیاسی نمرود کے خلاف سیاست کی آگ میں کود پڑے اور اسکو گلزار بنانے کی کوشش میں لگ گئے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کو مزید مستحکم کرنے کیلئے گاندھی کو لے کر ملک گیر دورے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہندوستانیوں میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ مسلمان انگریز حکومت سے پہلے ہی بدظن ہو چکے تھے۔ محمد علی اور گاندھی کی آواز پر انکی بڑی تعداد نے سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ وکلاء نے وکالت چھوڑ دی۔ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے پہننے ترک کر دیئے گئے۔ اور ملکی مصنوعات کو فروغ دیا جانے لگا۔ کھدر کاتنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی خاطر ذبیحہ گاؤ بھی بند کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے پر کیف مناظر اکثر جگہوں پر دیکھنے میں آئے۔ بقول محمد علی

"دو سال تک ہندوستان نے جس سامانِ بے تابی کا معائنہ کیا وہ فرانس کے انقلاب
کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔"[63]

تحریک ترکِ موالات کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں محمد علی اکتوبر 1920ء کو لاہور بھی گئے اور انجمن حمایت اسلام کے سیکریٹری علامہ محمد اقبال سے خصوصی طور پر ملے۔ وقتی طور پر تو علامہ محمد اقبال نے محمد علی سے اتفاق کیا لیکن علامہ صاحب کو ترکِ موالات کے سلسلے میں ترکِ موالات سلسلے میں ترک تعلیم اور اسکے طریقہ کار سے اختلاف تھا۔ اسلیئے بعد ازاں انہوں نے محمد علی کا ساتھ نہ دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور محمد علی انھیں "اقبال مرحوم" کہنے لگے تھے۔

لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ محمد علی کی غیر معمولی کوششوں اور سرگرمیوں کا اسقدر مفید نتیجہ نکلا کہ انگریزوں کا خوف عوام کے دل سے کافور ہو گیا۔ قید خانہ ایک مذاق اور گرفتاری ایک کھیل بن گیا۔ مشہور سیاستدان و فلسفی ونسٹائل شرل نے اپنی کتاب "Unrest in India" میں کس قدر سچی بات لکھی ہے کہ :۔

"مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری
علی برادران کی گردان پر ہے۔ جنھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر امن پسند
ہندوؤں میں جرات کے عناصر پیدا کر دیئے اور ادھر مسلمان فوج کو بغاوت پر آمادہ
کیا۔"[64]

محمد علی نے واقعی ہندوؤں میں جرات تو پیدا کر دی۔ لیکن یہی جرات بہت جلد مسلمانوں کیلیئے وبال جان بن گئی۔ فتنہ و فساد اور خونریزی کی عادی تو یہ ہندو قوم پہلے ہی تھی۔ لیکن اب ان میں مزید تشدد کا عنصر غالب آگیا، اور وہ بھی مسلمانوں کے خلاف۔ جسکی واضح مثال شدھی و سنگھٹن کی تحریکیں اور انتہا پسند ہندوؤں کی کاروائیاں ہیں۔ لیکن محمد علی مستقبل کے مضر اثرات سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن، ہندو مسلم اتحاد میں کوشاں اور تحریک ترکِ موالات کو کامیاب بنانے میں مشغول رہے۔ ترکِ موالات کے فلسفہ، اہمیت اور نتائج پر محمد علی نے فکر انگیز تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"عدم موالات کا نام جو آپ سنتے ہیں۔ دراصل یہ نام ہی غلط ہے۔ کیونکہ
عدم موالات یہی نہیں ہے کہ ہم گورنمنٹ کے ساتھ ہی عدم موالات کریں۔
جس چیز کا ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم آئندہ سے غلامی کے پرستار
نہیں رہیں گے جو لوگ حکومت سے اتحاد عمل کی دعوت دے رہے ہیں ان سے
آپ دریافت فرمائیں کہ آیا پہلے کبھی ہم نے حکومت سے اتحاد عمل کیا ہے جو آج ہی
کریں۔ ہمارا حال یہ تھا کہ ہم غلام تھے اور ہم اتحاد عمل کی کوشش کرتے تھے۔
مگر کوئی ساعت نہیں ہوتی تھی۔ اور ہم سے کبھی بھی اتحاد عمل نہیں کیا گیا۔ آج
کیا بات ہے کہ وہ اتحاد عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ آج کس بات نے
مسٹر گاندھی کی طرف نظریں واکر دیں؟ وہی پانیر جو پہلے یہ کوشش کر رہا تھا کہ
مسٹر چنتامنی اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے ناموں کو ملا کر ایک نیا نام پیدا

کرے۔ آج انکی تعریفوں میں رطب اللسان ہے اور پانیر و مالوی جی و چنتامتی میں
آج اتحاد و عمل ہو رہا ہے۔"[65]

محمد علی نے جون 1921ء کو گجرات کانفرنس میں خطبہ صدارت کے بعد اپنے عقیدے کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ :۔

"میں پرامن ترکِ موالات ہوں۔ لیکن اگر ترکِ موالات کی تحریک ناکام رہی تو
میں جیسا کہ پہلے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں، اب پھر کہتا ہوں کہ ہم جنگ سے کام لیں
گے۔ کیونکہ ہم بھی خدا کی طرف سے اپنے مذہب کے حکم بردار ہیں۔ یہ حکم
برداری ہمیں خدائے کریم نے سونپی ہے۔ ہم سے کوئی اگر حکم برداری کے
ساتھ جنگ نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں۔"[66]

محمد علی کو انگریز حکومت سے ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ وہ کسی معاملے میں بھی اب اسکے ساتھ تعاون کرنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ انکی محبوب ترین مادر درسگاہ تھی۔ وہ اسکے بڑے فدائی تھے۔ کیونکہ مغلیہ حکومت کے خاتمے کے بعد سے یہی کالج مسلمانوں کی آرزوں کا محور اور انکی تمناؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن اسے اس برطانوی حکومت سے مالی امداد ملتی تھی۔ جس نے ترکی سلطنت اور خلافت پر کاری ضرب لگا کر اسلام کی اہانت کی تھی۔ محمد علی نے علی گڑھ کالج کی انتظامیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ سرکاری گرانٹ لینا بند کر دیں اور حکومت سے عدمِ تعاون کرتے ہوئے ترکِ موالات کریں۔ لیکن ناکامی کی صورت میں محمد علی نے مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خان کے تعاون و تائید سے علی گڑھ کے مقابلے میں 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی۔[67] محمد علی خود مختار اور انگریزی اثر سے پاک درسگاہوں کے وجود پر یقین رکھتے تھے۔ ایسی درسگاہیں جہاں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جا سکے۔ محمد علی کی خواہش تھی کہ مسلمان صحیح تعلیم پا کر صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ بقول محمد علی

"---- ہم اپنی درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں، جو نہ صرف حسب معیار
زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جا سکنے کے مستحق ہوں۔ بلکہ صحیح معنوں میں
مسلمان بھی ہوں۔ جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے
اس قدر بہرہ انداز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی مدد سے
مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔"[68]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندوؤں نے اپنے اہم تعلیمی اداروں کو ترکِ موالات کی تحریک کے اثرات سے دور رکھا۔ مدن موہن مالویہ نے محمد علی اور گاندھی کو اس سلسلے میں بنارس یونیورسٹی میں جانے کی اجازت ہی نہ دی۔ ہندو لیڈر خصوصاً گاندھی مسلمانوں کو تو ترکِ موالات کے اقدامات پر سختی سے عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ لیکن اپنے ہم مذہبوں کے بارے میں انکی پالیسی کیوں نرم پڑ جاتی تھی۔ اگر گاندھی واقعی تحریک اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص ہوتے۔ تو ہندوؤں پر بھی ترکِ تعاون کے سلسلے میں اتنا ہی دباؤ ڈالتے، جتنا کہ وہ مسلمانوں پر ڈال رہے تھے۔ لیکن وہ ایسا کیونکر کرتے۔ انکا مقصد تو مسلمانوں کو کمزور کر کے ہندوؤں کو مزید مضبوط بنانا تھا۔ گاندھی نے مسلمانوں کے اندر رہ کر یہ کام کمالِ مہارت سے کر دکھایا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں "مسٹر ہمفرے کے اعترافات" واضح دلیل ہیں کہ غیر مسلم کسطرح اسلام دشمنی میں

مسلمانوں کے اندر رہ کر بظاہر انکے دوست، مگر انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ یعنی بغل میں چھری منہ میں رام رام۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :۔

یا ایھاالنبی اتق اللہ ولاتطع الکفرین والمنفقین ان للہ کان علیما حکیما ٥

ترجمہ:۔ اے پیغمبر !اللہ سے ڈرتے رہنا اور کافروں اور منافقوں کا کہا نہ ماننا۔ بیشک اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ (1-23)

لتجدن اشدالناس عدواۃ للذین امنو ا الیھود والذین اشرکوا ٥

ترجمہ:۔ ضرور تم عداوت میں شدید تر پاؤ گے مومنین کے لیے، ان لوگوں کو جو یہودی ہیں اور جو مشرک ہیں۔ (82-5)

تاریخ نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر بے جا اعتماد کرنے اور اپنے غیر محتاط رویوں کی وجہ سے شدید نقصان اٹھایا۔

ترکِ موالات کا ایک مقصد کونسلوں کا بائیکاٹ بھی تھا۔ لیکن حکومت کی طرف سے 1921ء میں نئی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان ہوتے ہی ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے نے ان اصلاحات کو قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ کانگریس جو ترکِ موالات و عدمِ تعاون کی قرار دادیں پاس کروانے میں بڑی متحرک تھی، اسکے بعض سربرآوردہ لیڈر بھی حکومتی حاشیہ نشینوں کے اس جم غفیر میں شامل ہوگئے۔ سریندر ناتھ بیز جی، بنگال کے مشہور قوم پرست لیڈر نے حکومت سے "سر" کا خطاب اور نئے آئین میں بنگال کی وزارت قبول کر لی۔[69] مسٹر سنہا "لارڈ سنہا" بہار اور اوڑیسہ میں پہلے ہندوستانی گورنر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ مسٹر چنتامنی نے یوپی، سر سی پی راما سوامی آئنیر نے مدراس اور لالہ ہر کشن لال نے پنجاب میں وزارتیں سنبھال لیں۔[70] لیکن مسلمان ان تمام چیزوں سے دور اور محرومِ حکومتِ برطانیہ سے ترکی کا "انتقام" لینے میں مصروف رہے۔ اگر غیر جذباتی مسلمانوں نے ملکی بقا اور قومی وجود کے تحفظ کی خاطر اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی۔ تو انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

گاندھی جو ہندوؤں کے مسلمہ لیڈر اور عدمِ تعاون و ترکِ موالات کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کو ایسا کرنے سے کیوں نہ روکا؟ وہ تو قوم کے باپو تھے اور ہندو انکے اشارے پر دوڑ کھڑے ہوتے تھے۔ درحقیقت وہ قوم پرست تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ انہیں کسی ایسے کام کے لیے مجبور کریں جو مستقبل قریب میں انکے لیئے نقصان یا پریشانی کا باعث ثابت ہو۔ جہاں تک مسلمانوں کی پریشانی یا نقصان کا تعلق تھا، گاندھی کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ :۔

والذین کفرو بعضھم اولیاء بعض ٥

ترجمہ:۔ اور جو لوگ کافر ہیں (وہ) ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (73-8)

حالانکہ اصل طاقت عوام کی ہوتی ہے۔ تحریکیں انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کے سائے میں پروان چڑھتی اور کامیاب ہوتی

ہیں۔ اگر یہ بھی کہا جائے کہ وہ لوگ گاندھی کے قابو میں نہیں تھے۔ تو کیا گاندھی نے ان سے قطع تعلق کیا، یا ان پر تنقید کی؟ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی عدمِ تعاون میں شرکت ایک ڈھونگ تھا۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو عدمِ تعاون اور ترکِ موالات کے جال میں پھنسا کر سیاسی، سماجی و معاشی لحاظ سے کمزور کرنا اور حکومت وقت کی نظروں میں معتوب کرنا تھا۔ کیونکہ ترکِ موالات کی صورت میں مسلمانوں کے پاس کوئی نعم البدل نہیں تھا کہ وہ اپنے آپکو خوشحال اور مستحکم رکھ سکتے۔

مسٹر محمد علی جناح بھی ترکِ موالات و عدمِ تعاون کے خلاف تھے۔ کیونکہ گاندھی نے مسلمانوں کو بے یار و مددگار کرنے کے لیے "نان کوآپریشن" کا ڈھونگ رچایا تھا۔ مسٹر جناح کے نزدیک یہ ایک غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ اس بارے میں انہوں نے کہا کہ :۔

"گاندھی جی جو مسلمانوں کو ترکِ موالات کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتا رہے کہ اسکے بعد کیا کریں۔" [71]

ترکِ موالات یا عدمِ تعاون کا خاکہ گاندھی نے سب سے پہلے اپنی "ستیہ گرہ" مہم میں پیش کیا۔ مگر اپنی حکمت عملی کو کامیاب بنانے کیلئے مسلمانوں کو آلہ کار بنایا۔ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے بعد ہندو تو سست پڑ گئے۔ لیکن جذباتی مسلمانوں نے اپنے آپکو مکمل طور پر اس تحریک کی نذر کر دیا۔ جب عدمِ تعاون کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ اس وقت محمد علی جیل میں تھے۔ جب اسے ملکی سطح پر شروع کیا گیا، تو وہ وفد خلافت لیکر یورپ گئے ہوئے تھے۔ لیکن واپس ہندوستان آنے کے بعد اسکے ضرر رساں نتائج پر غور کرنے کی بجائے خود بھی پوری قوت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے اور اس کو کامیاب بنانے کیلئے ملک کے طول و عرض میں گاندھی کے ساتھ دورے کئے۔ جگہ جگہ تقاریر کر کے لوگوں کو ترکِ موالات کیلئے تیار کیا۔[72] یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک میں شدت پیدا کرنے اور اسکو عروج پر پہنچانے میں محمد علی کے زور خطابت کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے جلسے کئے، جلوس نکالے اور دورے کر کے ملک بھر میں ایک مرتبہ پھر شدید ہیجان پیدا کر دیا۔ اکثر ہندوستانیوں نے خطابات واپس کر دیے۔ عدالتوں کا بائیکاٹ ہوا۔ تعلیمی اداروں میں بے چینی بڑھی، بہت سے طلبا کالجوں سے نکل آئے۔ غرض سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر شعبہ زندگی پر اسکا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ آخر حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لیے سختی سے کام لیا۔ تشدد گرفتاریوں اور گولیوں کے واقعات پیش آئے۔ حکومت کے سخت اقدامات کا نشانہ بننے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کثیر گرفتاریوں سے تحریک کمزور پڑ گئی اور بڑے بڑے مسلمان لیڈروں کے جیل جانے کے بعد تحریک کی کمان مکمل طور پر گاندھی کے ہاتھ میں آ گئی۔ جسے انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق چلایا۔ بقول محمد جلال الدین قادری

" تحریک ترکِ موالات اور ہجرت سے مسلمانوں کو سراسر نقصان پہنچا اور ملکی سیاست پر ہندوؤں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔" [73]

تحریک خلافت کے دوران گاندھی کا کردار دورخ پیش کرتا ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسری طرف کانگریس اور خلافت کمیٹی کے یہ امر مطلق (گاندھی) محمد علی جیسے محب وطن کو چکمہ دیکر ایک بار پھر ایوانِ ملوکیت برطانیہ کی سیاحت کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اور شملہ میں وائسرائے کی قدم بوسی کر رہے تھے۔ جسکا ثبوت مئی 1921ء

میں پنڈت مالویہ کی وساطت سے گاندھی کی شملہ میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ (بحثیت وائسرائے 1921ء-1926ء) سے ملاقتیں ہیں۔ جہاں گاندھی اپنی وفاؤں کی یقین دہانی میں مصروف تھے[74] درحقیقت اندرون خانہ وہ برطانوی حکومت کے سب سے بڑے دوست تھے۔ اس بارے میں اسپیر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

"ایک ایسے دور میں جبکہ جذبات حد درجہ برانگیختہ تھے، اور تناؤ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ گاندھی نے ہندوستان کو پرامن اور لوگوں کو قابو میں رکھنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔۔۔۔ورنہ اسکا پورا امکان تھا کہ تحریک خلافت ایک ایسی مسلم بغاوت اور شورش کی شکل اختیار کرلیتی۔ جس پر انگریزوں کا قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔"[75]

تحریکِ ہجرت 1920ء

مسلمانوں کے نزدیک ترکِ موالات کے بعد دوسرا حربہ ہجرت تھا۔ جو انتہائی جذباتی اور غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے علماء کرام نے بغیر سوچے سمجھے ہجرت کا فتویٰ دے دیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی ابتداء شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فرمائی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اس سلسلے میں تینوں شرطوں کا واضح اعلان فرمادیا تھا کہ :۔

"دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوسکتا۔ مگر جب تین امور پائے جائیں۔ وہاں مشرکین کے احکام جاری ہو جائیں۔ دارالاسلام دارالحرب سے مل جائے اور وہاں کوئی مسلمان باقی نہ رہے، اور نہ وہاں کوئی ایسا کافر ذی رہ جائے جو پہلے سے مسلمانوں سے پناہ لے رہا ہو اور اب بھی اسی پناہ کیوجہ سے ہو۔"[76]

مولانا احمد رضا خان بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی ہجرت کی ناگزیر صورت میں انہی تین حالتوں کا ذکر کیا ہے۔[77] لیکن ہندوستان میں تو ان میں سے کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ہجرت کا فتویٰ دے دیا جاتا۔ اسلیئے مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856ء-1921ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ نے تحریک ہجرت کی شدید مخالفت کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کا فتویٰ کس نے دیا۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محل کے نام سر فہرست ہیں۔ فتویٰ ہجرت کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ :۔

" تمام دلائل شرعیہ حالات حاضرہ مصالح مہمہ امت اور مقتصاو مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کیلئے بغیر ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کیلئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں۔ ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔"[78]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اس فتویٰ سے متعلق ایک مکمل رسالہ ہجرت بھی لکھا۔ جسکا حوالہ خود مولانا آزاد نے اپنے فتویٰ

میں دیا ہے۔ غلام رسول مہر کے نزدیک ہجرت کا فتویٰ مولانا ابوالکلام آزاد نے دیا تھا۔[79] لیکن اللہ بخش یوسفی، ظفر حسن ایبک، رئیس احمد جعفری، روزنامہ پیسہ اخبار اور روزنامہ خلافت نے ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری فرنگی محل سے منسوب کیا ہے[80]۔ دراصل مولانا عبدالباری فرنگی محل کا نام زیادہ مشہور ہونے کی وجہ سے آتا ہے کیونکہ آپ اس وقت مسلمانانِ ہند کے مسلمہ لیڈر تھے اور یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ سوائے آنکے کوئی اور بڑے پیمانے پر تحریک چلا ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ جب ہجرت کی بات عام ہو گئی تھی تو اس وقت ایک مہاجر غلام محمد عزیز امرتسری نے مولانا عبدالباری سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ :۔

"ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں۔ جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو۔"[81]

اگرچہ فتویٰ کی ابتداء مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی۔ لیکن مولانا عبدالباری کو بھی اس سے بری نہیں کیا جاسکتا۔ بیشک انہوں نے فتویٰ ہجرت کی ابتداء نہیں کی۔ اور نہ فرض واجب قرار دیا۔ لیکن لوگوں کیلئے جائز ضرور قرار دے دیا۔ مذہبی بنیادوں پر فتویٰ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بغیر کسی نقصان کی پرواہ کئے اس تحریک میں کود پڑے۔ اور افغانستان ہجرت کرنا شروع کر دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے مسلمان اناطولیہ جا کر اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف ترکوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ اسطرح انکی جدوجہد کامیاب رہے گی۔ دوسری طرف گاندھی کو اندیشہ تھا کہ کہیں جوشیلے مسلمان ہندوستان میں مسلح جدوجہد نہ شروع کر دیں۔ اس وجہ سے ہجرت کی تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ محمد جلال الدین قادری تحریک ہجرت کو گاندھی کی چال قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

" 1920ء میں گاندھی نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے ایک اور چال چلی۔ جمعیت العلماء ہند اور خلافتی ہندوؤں سے ہندوستان کو دارالحرب قرار دلوا کر ہندوستان سے ہجرت کا فتویٰ جاری کروا دیا۔"[82]

جہاں تک انگریز حکومت کا تعلق ہے اسپیشل ٹرینوں کے چلانے اور تحریک ہجرت کے خلاف کسی قسم کی کاروائی نہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ انگریز بھی اس تحریک کے سلسلے میں ایک طرح سے مسلمانوں کے ساتھ تعاون ہی کر رہے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ اس تحریک کی ناکامی مسلمانوں کی موت ہے۔ اور فرض کریں یہ تحریک کامیاب ہو بھی جاتی ہے تب بھی ایک بڑی تعداد سے حکومت کو چھٹکارا مل جائے گا۔

تحریک ہجرت کی بدولت مسلمانوں کا جسقدر جانی و مالی ضیاع ہوا۔ اس کے پیش نظر فتویٰ دینے والوں، تائید کرنے والوں یا اس کی تبلیغ و تنظیم کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری، محمد علی اور ان کے رفقاء کار برابر کے شریک تھے۔ انکے اس عاجلانہ اور جذباتی اقدام پر تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہجرت کا فتویٰ دینے والوں اور جیالوں نے یہ نہ سوچا کہ مسلمان وہاں جا کر کیا

کریں گے؟ انکا ذریعہ معاش کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ان مفتیوں نے عام مسلمانوں کو تو اس پُر خطر راہ پر ڈال دیا لیکن خود کسی نے بھی ہجرت نہ کی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ :۔

یاایھاالذین امنو ا لم تقولون مالا تفعلون ٥

ترجمہ: . مومنو! تم ایسی بات کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ (2:61)

یاایھاالذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عنداللہ ان تقولوا ما لا تفعلون ٥

ترجمہ: . اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم کہو (کوئی بات) اور نہ کرو (اسپر عمل) (2,3:61)

اللہ بخش یوسفی ایڈیٹر "سرحد" اور سیکریٹری "سرحد خلافت کمیٹی" لکھتے ہیں کہ :۔

> "مستقبل سے آنکھیں بند کئے عوام کو ہندوستان سے ہجرت کا شرعی حکم دیا جاتا رہا اور اس طرح کے حکم دینے والے خود آرام دہ مسکنوں سے ایک انچ بھی نہ ہل سکے۔ یہی نہیں جس جس علاقے سے یہ لوگ شرعی احکام صادر فرمارہے تھے۔ ان علاقوں سے بھی شاید ایک فی صد دس ہزار باشندے اپنا وطن چھوڑنے پر آمادہ ہو سکے۔"[83]

جہاں تک تحریک ہجرت کے حوالے سے محمد علی کا تعلق ہے اس کے آغاز کے وقت وہ ہندوستان سے باہر وفد خلافت لیکر گئے ہوئے تھے۔ جون، جولائی، اگست، 1920ء تک یہ تحریک جوش دکھانے کے بعد ماند پڑھ گی تھی۔ لیکن ہندوستان واپسی پر محمد علی نے اسکے منفی پہلو پر غور کرنے کی بجائے اس کی تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے ملک گیر دوروں، جلسوں اور تقاریر سے عوام میں جوش پیدا کر دیا اور وہ بلا سوچے سمجھے ہجرت کرنے لگے۔ اس تحریک سے خلافت کی تحریک اور مسلمانوں پر جو انتہائی مضر اثرات مرتب ہوئے، اس سلسلے میں محمد علی کو بری الزمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وہ بھی تحریک ہجرت کے حامیوں میں سے تھے۔ اور حامی بھی ایسے جو ہوش کی بجائے جوش سے کام لینے والے ہوں۔ ان لیڈروں کا کیا بگڑا۔ اگر نقصان ہوا تو غریب مسلمانوں کا، جنھوں نے بلا سوچے سمجھے مذہبی جوش میں انکی آواز پر لبیک کہا۔ ایک لاکھ سے بھی زائد مسلمانوں نے اپنی نوکریاں، تعلیم، کاروبار اور گھربار چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی۔[84]

بقول قاضی عبدالغفار (1888ء - 1956ء)

> "تحریک ہجرت ایک جذباتی تحریک تھی۔ جس سے مسلمانوں کو بے حد نقصان ہوا۔"[85]

مہاجرین کی تعداد کے بارے میں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد اٹھارہ یا بیس ہزار تھی۔ لیکن تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد تھی۔ چودھری خلیق الزماں نے مہاجرین کی تعداد 20 ہزار لکھی ہے۔[86] جانباز مرزا کے نزدیک مہاجرین کی تعداد 40 ہزار تھی۔[87] پیسہ اخبار کے مطابق دو لاکھ،[88] روزنامہ زمیندار کے مطابق ایک لاکھ،[89] روزنامہ اہل حدیث امرتسر کے مطابق ایک لاکھ بارہ ہزار، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

کے نزدیک عزیز ہندی کے حوالے سے تقریباً دو لاکھ،[90] دربار علی شاہ کے مطابق ایک لاکھ[91] سے زائد، ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مطابق تقریباً 60 ہزار،[92] خلافت کمیٹی کے نمائندے ملک لعل خان اور محمد صفدر کی رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ،[93] ر شبرک ولیمس نے اگست 1920ء تک 18 ہزار اور پروفیسر احمد سعید نے 5 سے 20 لاکھ[94] تک مہاجرین کی تعداد تحریر کی ہے۔[95] اگرچہ پروفیسر سعید احمد کی تعداد مبالغہ آمیز ہے۔

محمد علی کے خلاف پروپیگنڈہ اور معافی کا افسانہ

تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی۔ ہندو مسلم باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ محمد علی کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ محمد علی کی مقبولیت، ہر دلعزیزی، جادو بیانی، جذبہ جانبازی اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں نے انگریز حکومت کو پریشان کر دیا۔ حکومت اس حقیقت سے باخبر تھی کہ بین الاقوامی سطح پر اور خود ہندوستان میں حالات انکے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسکا حل انھوں نے یہی تلاش کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا کر کے ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کو زمین بوس کر دیا جائے اور محمد علی کے بارے میں مسلمانوں کے دل میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیئے جائیں۔ محمد علی کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ انہوں نے وفد خلافت کے یورپ قیام کے دوران فضول خرچی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے دریغ قوم کا روپیہ خرچ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے وفد کے اخراجات کا مکمل حساب نہ رکھا جا سکا۔ جس سے مخالفین کو تنقید کا موقع مل گیا۔ چنانچہ جب انہوں نے محمد علی سے حساب مانگا۔ تو وہ اخراجات کی مکمل تفصیل دینے سے قاصر رہے۔ ویسے بھی بحیثیت سیکرٹری یہ کام حسن محمد حیات کا تھا۔ مگر مخالفین نے سوال محمد علی ہی سے کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے مخالفین کے منفی طرز عمل کو دیکھتے ہوئے محمد علی کی پوزیشن واضح کی۔ اور ساتھ ہی تمام حساب کتاب دیگر وفود کے موازنے کے ساتھ پیش کر کے ناقدین کو خاموش کر دیا۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں کہ :-

> "مرکزی دفتر خلافت سے وفد خلافت کو شروع سے آخر تک ایک لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو چالیس روپیہ تین پائی (125840) مختلف تاریخوں میں دیئے گئے۔ اور علاوہ ازیں دوسرے اتفاقی ذرائع امداد سے چار ہزار چار سو اکیس روپے سات آنے نو پائی ولایت میں ملے کل ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب یہ رقم پہنچی ہے۔ اس میں سے بیس ہزار تین سو پچانوے روپے سرنافنڈ کے تھے۔ جو غالب کمال بے (سفیر ترکی متعین اٹلی) کے حوالے کیے گئے۔ اور پندرہ ہزار دو سو چھیانوے ڈیلی ہیرلڈ اخبار کے حصہ کی خریداری میں خرچ ہوئے۔ باقی تقریباً 3470-171 دفتر کو واپس کیے گئے۔ 392 روپے ابو قاسم صاحب کے ذمے ہیں۔ باقی وفد کے سفر، قیام، طعام اور کاموں پر صرف ہوئے۔ یہ سوا لاکھ کے قریب روپے، جو آٹھ مہینے کے انگلستان، فرانس، سوئزرلینڈ، اٹلی کے کرایہ جہاز و ریل، سفر، قیام، طعام، تبلیغ واشاعت و طباعت وانعقاد و مجالس و معاوضہ

مضامین و مہمانداری و میزبانی وغیرہ میں صرف ہوئے ----اسی زمانے میں جو مصری قومی وفد یورپ میں کام کر رہا تھا۔ وہ کم از کم چودہ ہزار پونڈ (دو لاکھ دس ہزار روپے) لے کر یورپ گیا تھا۔" [96]

سید سلیمان ندوی نے گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے وفد کے ساتھ بھی اخراجات کا موازنہ کیا۔ جو سیٹھ چھوٹانی کی سربراہی میں انگلستان گیا تھا۔ یہ وفد بھی چھ ارکان پر مشتمل تھا۔ ان حضرات میں سے سر آغا خان اور سیٹھ چھوٹانی نے اپنا خرچ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف مسٹر حسن امام، ڈاکٹر انصاری اور قاضی عبدالغفار نے اپنے اخراجات کے بل پیش کئے تھے۔ ان حضرات نے قیام انگلستان کے زمانے کا بیس پونڈ روزانہ الاؤنس بل میں رکھا تھا۔ لیکن حکومت ہند نے دس پونڈ یومیہ منظور کیا۔ اس وفد کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"----ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی صاحب کے وفد پر فی کس گیارہ ہزار روپیہ (11,000) خرچ ہوا۔ اور مسٹر حسن امام کے وفد پر فی کس دس ہزار روپیہ (10,000)۔ لیکن مولانا ممدوح کا وفد نو مہینے یورپ میں رہا۔ اور مسٹر حسن امام کا وفد صرف ڈھائی ماہ انگلستان رہا۔ اس حساب سے مولانا کے وفد کے مقابلہ میں گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے وفد کے اخراجات تین گنے (زیادہ) ہوئے۔ ان اعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کے خیالات پر حیرت ہوتی ہے۔ جو مولانا محمد علی صاحب پر فضول خرچی کا الزام عائد کرتے ہیں۔" [97]

سید سلیمان ندوی کی وضاحت اور حسابات پیش کرنے کے بعد شر پسندوں کے منہ تو بند ہوگئے۔ معاملہ ختم ہوگیا۔ مگر کتنے عظیم نقصان کے بعد۔ لیکن یہ قوم کی پست اخلاقی اور ایک خادمِ قوم کو بے وقعت کرنے کی انتہائی کوشش تھی۔ مخالفین نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ محمد علی کی مارچ 1921ء والی تقریر کو غلط رنگ دے کر خوب اچھالا۔ جس میں محمد علی نے کہا تھا کہ وہ افغانستان کی ہندوستان پر حملہ آور فوج کی مدد کریں گے۔ اس جملے کو تو پکڑ لیا گیا۔ لیکن اس بات کو چھوڑ دیا جس میں کہا تھا کہ وہ افغان فوج کی مدد فقط اس صورت میں کریں گے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کے واپس چلی جائے۔ [98] اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اس صدی کے زیرک ترین وائسرائے لارڈ ریڈنگ (1860ء-1935ء) نے 14 مئی 1921ء کو گاندھی سے ملاقات کی اور کہا کہ محمد علی اپنی شعلہ نوا تقریروں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جو غیر معمولی زور دے رہے ہیں۔ اسکا ہدف محض عیسائی نہیں بلکہ ہندو بھی ہیں۔ انکے لیے ہندو دھرم بھی قابل نفرت و ملامت ہے۔ کیونکہ اسکی بنیاد شرک اور بت پرستی پر رکھی گئی ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے گاندھی کو اس بات پر اکسایا کہ وہ محمد علی سے تحریری ضمانت نامہ لیں۔ محمد علی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے رضامندی دے دی۔ گاندھی نے جو ضمانت نامہ تیار کیا اس میں محمد علی کی طرف سے یہ یقین دھانی کرائی گئی تھی کہ وہ تشدد پر یقین نہیں رکھتے۔ اور اگر اس سلسلے میں کسی کو غلط فہمی ہوئی ہے تو اسکے لیئے معذرت طلب کرتے ہیں۔ [99]

سیکرٹری آف اسٹیٹ مانٹیگو نے محمد علی کی طرف سے معذرت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"مجھے یقین ہے کہ انہوں نے (محمد علی) اسلیئے معذرت کر لی ہے، کہ گاندھی جی

اسپر مصر تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انکے اور گاندھی کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی۔ اس صورتحال سے بچنے کیلئے انہوں نے معذرت کر لی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ انکے ذہنوں میں ایک تلخ یاد باقی رہے گی۔ جو کہ ہمارے لیئے مفید ہے۔"[100]

سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ معذرت نامہ محمد علی کو دکھائے اور بتائے بغیر ردوبدل کے بعد انگریزی حکومت کی جانب سے اخبارات میں شائع کرا دیا گیا۔ جس سے یہ تاثر پیدا کرنا مقصود تھا کہ محمد علی نے بزدلانہ طور پر انگریزی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ لارڈ ریڈنگ اور لندن کے کارپرداز اپنے مذموم منصوبے کی تکمیل پر شاداں و فرحاں تھے۔ لارڈ ریڈنگ نے اپنے بیٹے کو جو خط لکھا، اس سے انکے عزائم کی قلعی کھل جاتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"محمد علی اور گاندھی کے درمیان چپقلش اور رنجش سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ٹوٹ جائے گا۔"[101]

مقام افسوس کہ محمد علی نے معذرت نامے سے لاتعلقی کے بارے میں جو تحریری بیان دیا۔ اسے انگریزوں نے شائع ہونے سے روک دیا۔ محمد علی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ انگریز ہندوستان کے دو فریقوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ واقعی معذرت نامے نے تحریکِ خلافت کے بعض لیڈروں کے دل میں محمد علی کے خلاف بدگمانی اور بدظنی پیدا کر دی۔ اکثر کا صفِ اول کے لیڈروں پر سے اعتماد اٹھ گیا یا کم ہو گیا۔ بعض مسلمانوں نے تحریک خلافت میں ہندوؤں اور گاندھی کے کردار پر شک و شبے کا اظہار شروع کر دیا۔ جس سے ہندو مسلم تعلقات متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

موپلا بغاوت 1921ء

19 اگست 1921ء میں ہندو مسلم اتحاد کو زبردست دھچکا لگا۔ جب مالابار کے موپلوں نے وہاں کے ہندوؤں اور حکومت کی مشترکہ ظالمانہ کاروئیوں سے تنگ آکر بغاوت کر دی۔ (یہی وہ دور تھا جب گاندھی بمبئی میں بدیشی کپڑوں کو نذر آتش کر رہے تھے۔) نتیجے کے طور پر فوجی کاروائی ہوئی جس میں تقریباً 2339 افراد جان بحق ہوئے اور تقریباً 24167 کو بغاوت اور دوسرے جرائم کی پاداش میں سزائیں دی گئیں۔[102] بغاوت کا فوری سبب خلافت کے کچھ کارکنوں کی گرفتاری تھا۔ حکومت نے بلوے کو تو وحشیانہ تشدد سے دبا دیا۔ لیکن اس کا رخ ہندو مسلم فسادات کی طرف موڑ دیا۔ گاندھی نے 6 ستمبر 1921ء کے "ینگ انڈیا" میں موپلوں کے تشدد کی مذمت کی اور اسے کامیابی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالتے ہوئے انہیں "غنڈے" اور ہندوؤں کو "بزدل" قرار دیا۔ پھر 20 اکتوبر 1921 کے "ینگ انڈیا" میں ہندو "بزدلوں" کو مسلمان "غنڈوں" کے مقابلے میں دفاعی درس دیا۔ دراصل اب گاندھی کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ محمد علی اور دیگر مسلم راہنما جیل جا چکے تھے۔ گاندھی کو مسلمانوں نے بااختیار تو پہلے ہی بنا دیا تھا۔ اب تو مکمل طور پر تحریک کی کمان اس فردِ واحد کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ کلی اختیارات و اقتدار نے واقعی گاندھی کو امر مطلق بنا کر رکھ دیا۔[103]

خلافت کانفرنس کراچی

تحریک اپنے عروج پر تھی۔ 9جولائی 1921ء کو خلافت کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ جس کی صدارت محمد علی نے کی۔ کانفرنس میں محمد علی کی تجویز پر ایک قرارداد منظور ہوئی۔ جس میں مسلمان سپاہیوں پر فوج کی ملازمت کو حرام قرار دیا گیا۔[104] محمد علی نے واضح کیا کہ فوج کی ملازمت میں انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو گولیوں کا نشانہ بنائیں۔ انہوں نے قرآن وسنت سے واضح کیا کہ جس نے جان بوجھ کر اپنے مسلمان بھائی کو قتل کیا، اسکی سزا دوزخ ہے۔ بالخصوص مولانا حسین احمد مدنی (1879ء - 1952ء)، پیر غلام مجدد (1883ء - 1958ء) اور مولانا نثار احمد (1880ء -1934ء) نے اس تجویز کی تائید نہایت پرجوش اور مدلل طریقے سے کی۔ ہندو لیڈر سوامی شنکر اچاریہ نے بھی اپنے مذہب کے اعتبار سے اس تجویز کی زوردار تائید کی۔[105] اور ثابت کیا کہ اس معاملہ میں اسلام اور ہندومت میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ ایسی صورت میں دونوں مذاہب میں ظالم حکومت کی عام ملازمت بالعموم اور فوج و پولیس کی ملازمت بالخصوص حرام ہے۔ لہذا ہندوؤں کو بھی چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دیں۔ حکومت نے محمد علی کی کراچی کانفرنس کی تقریر کو بنیاد بنا کر بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ قائم کر دیا۔ 14 ستمبر 1921ء کو محمد علی گاندھی کے ہمراہ مدراس جارہے تھے کہ والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کر لیئے گئے۔ جرم یہ تھا کہ کراچی میں حکومت کے خلاف باغیانہ تقریر کی تھی۔ انہیں کراچی لاکر "تاریخی مقدمۂ کراچی" کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ محمد علی کے ساتھ نام نہاد جرم کے شریک مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد اور شنکر اچاریہ تھے۔ ان حضرات نے ترکِ موالات کے عقیدے کی بدولت عدالت کی کاروائی کا بائیکاٹ کیا۔ آخر مجسٹریٹ نے فرد جرم عائد کر کے مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔ وہاں بھی ملزمان نے کاروائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ البتہ محمد علی نے ایک طویل بیان دیا۔ جس میں اسلام کی عظمت، احکام خداوندی کی حرمت اور اپنے جذبات کی شدت کا اظہار جس قدر فصیح و بلیغ پیرائے میں کیا۔ اس میں طنز، جوشِ خطابت اور علم الکلام کے تمام ابواب نظر آتے ہیں۔ بقول محمد علی

> "---- یہ بادشاہت جسکے زیرِ سایہ ہم رہ رہے ہیں۔ شاہ لائڈ جارج کی بادشاہت نہیں، یہ خدا کی بادشاہت ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ دینا چاہیے اور مجھے بھی اس بات کو سامنے رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے جس کی بناءٔ میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس وقت تک شاہ جارج کے قانون کی اطاعت کرونگا، جب تک یہ قانون مجھے اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ میں خدا کے قانون کی اطاعت کرنا چھوڑ دوں ----"[106]

آخر کراچی کا عدالتی ڈرامہ ختم ہوا اور سوائے شنکر اچاریہ کے باقی تمام ملزموں کو دو دو سال قید بامشقت سنا دی گئی۔ بقول محمد علی

> "جج نے چھ ملزموں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور ساتھ ہی ہندو ملزم کو بری کر دیا۔ ایک عرصے بعد اب کہیں جا کر کراچی جیل میں جائے امن ملی۔

جہاں کہ حکومت کی نظر میں "شریرتنگ کرنا چھوڑ دیتے ہیں" اور "شریروں" کی
نظر میں تھکے ہوؤں کو آرام مل جاتا ہے۔" [107]

اگرچہ محمد علی خود تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔ لیکن انکے عزم وہمت کی گونج ہندوستان بھر میں سنائی دے رہی تھی۔ گاندھی جنھوں نے مولانا حسرت موہانی کو کامل آزادی کا نعرہ لگانے سے روکا تھا اور جنکی سیاست مقاطعہ و ترکِ موالات سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مجبور ہونا پڑا کہ کھلے بندوں سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیں۔ گاندھی انگریز سے ٹکر لینا چاہتے تھے یا نہیں۔ ان میں حوصلہ تھا یا نہیں۔ یہ انکا اپنا ضمیر جانے۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر وہ سول نافرمانی پر تیار ہو گئے۔ اتفاق سے جلد ہی 5 فروری 1922ء میں چوراچوری کا واقعہ پیش آگیا۔ جس میں مشتعل ہجوم نے ایک تھانے کو آگ لگادی اور تقریباً 22 سپاہی جل مرے۔ جسکو بہانہ بنا کر گاندھی نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور خود دوبارہ اپنے خول میں گھس گئے۔ جس نے ہندو مسلمان دونوں کو حیران کر دیا۔ تحریک کی معطلی کے باعث محمد علی بیجاپور جیل میں شدید کشمکش کا شکار ہو گئے۔ انکے نزدیک یہ واقعہ "شکست کے مترادف" تھا۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو

"فروری 1922ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا۔ جیل خانے میں یہ سن کر
بڑی حیرت اور پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کاروائیاں ایکدم سے
روک دیں اور عدمِ تعاون کی تحریک ملتوی کر دی۔" [108]

گاندھی کی اس سیاسی قلابازی نے تحریک خلافت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ملکی حالات پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے اس بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ :۔

"اس زبردست تحریک کے یکایک بند کر دینے سے ملک میں وہ افسوسناک
صورتحال پیدا ہو گئی کہ جس نے قومی تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا۔ تشدد کے دبے
ہوئے جذبات اور طریقوں نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے۔ آگے چل کر
فرقہ ورانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے جو رجعت پسند اور فرقہ پرست
ترکِ موالات کی ہماہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے۔
اب انہیں موقع مل گیا اور وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل پڑے۔" [109]

چوراچوری کا واقعہ کوئی ایسا اہم نہیں تھا کہ جسکو جواز بنا کر سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی جاتی۔ کیونکہ انقلاب کے دوران تو ایسے واقعات کا پیش آنا معمول کی بات ہوتی ہے۔ بقول محمد مرزا دہلوی

"انقلاب تو جنون اور دیوانگی کا ایک طوفان ہوتا ہے، وحشیانہ ہنگاموں کا ایک
سیلاب ہوتا ہے، جو آن کی آن میں ہر چیز کو بہالے جاتا ہے جو اسکی راہ میں حائل
ہوتی ہے۔ اسکا تو مفہوم ہی ان جذباتی بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ ان غیر ذمہ دار حیوانی
قوتوں کی کار فرمائیوں سے عبارت ہے جو کسی قاعدہ قانون یا ضبط و نظم سے مانوس
نہیں ہوتیں ---" [110]

مگر گاندھی کا "فلسفۂ انقلاب" اس سے مختلف نوعیت کا تھا۔ وہ "پُر امن انقلاب" کے حامی تھے۔ ایسا انقلاب جس میں بدامنی

کا ذرا بھی دخل نہ ہو۔ گاندھی کے اس اقدام نے مسلمانوں کو مایوسیوں کے گرداب میں پھنسا دیا اور انکی تمام قربانیوں پر پانی پھر کر رہ گیا۔

دوسری طرف غیر جذباتی مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ گاندھی نے سول نافرمانی شاید اسلیئے بند کر دی ہے کہ اس میں زیادہ تر ہاتھ مسلمانوں کا تھا۔ اور وہ اپنی قربانیوں اور سرگرمیوں کی بدولت ملک میں سیاسی اہمیت اختیار کر رہے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ اندیشہ نہیں حقیقت تھی۔ بقول نسیم الظفر

> "خلافت اور ہجرت کی تحریکوں سے مسلمانوں کو شدید جانی، مالی اور ذہنی نقصان پہنچا۔ لیکن اس تحریک سے یہ فائدہ ہوا کہ عامۃ المسلمین میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ وہ تھوڑی دیر کیلیئے سہی ایک مقصد کیلیئے متحد اور منظم ہوئے اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلمان باوجود اپنی کم مائیگی اور بے نوائی کے، قوم کی خاطر بڑے سے بڑا ایثار کر سکتے ہیں۔"[111]

مسلم لیڈروں کی سزایابی اور سول نافرمانی بے نتیجہ اختتام پذیر ہونے بعد مسلم سیاست میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلم لیگ انتہا پسند اور اعتدال پسند گروہ کے اختلافات کی وجہ سے انتہائی کمزور ہو گئی۔ خلافت کمیٹی میں ابھی کچھ سکت باقی تھی۔ اسلیئے کہ اس جماعت کے پاس ابھی کافی فنڈ تھا اور مسلمانوں کو اس سے ہمدردی بھی تھی، لیکن اسکی حقیقی روح سلب ہو چکی تھی۔ اسلیئے کہ اسکا سارا تعمیری پروگرام مولانا ابو الکلام آزاد نے کانگریس سے منسلک کر لیا تھا۔ اور خلافت کمیٹی کو صرف چندہ جمع کرنے والی جماعت بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ جمعیت العلماء اگرچہ صحیح حالت میں تھی۔ لیکن اسکا اپنا کوئی پروگرام مسلمانوں کے سامنے نہیں تھا۔ وہ تو خود کانگریس کی طفیلی بن گئی تھی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانا اسکا شعار تھا۔ محمد علی جیل جا چکے تھے۔ اعتدال پسند لیڈر ایک ایک کر کے پلیٹ فارم سے ہٹ چکے تھے اور سارے ہندوستان میں کوئی ایسی جماعت نہ تھی۔ جو مسلمانوں کے سامنے حتمی پروگرام پیش کرتی۔ اور انکے افتراق و انتشار کو دور کر کے انہیں ایک مرکز پر جمع کرتی۔ اگرچہ اس دوران کئی چھوٹی چھوٹی تحریکیں اٹھیں۔ لیکن ان میں سے ہر تحریک مسلمانوں کیلیئے مزید انتشار کا باعث ثابت ہوئی۔ اس دور کی تصویر کھینچتے ہوئے محمد علی رقمطراز ہیں کہ :۔

> "جب ترک تعاون کی آزمائش والے زمانہ کے جیل خانوں سے نکلے تو انہوں نے اصلاح کی بہت کوشش کی۔ مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ ہر شخص "لیڈر" تھا۔ مقتدروں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میسر آتے تھے۔ عوام پریشان تھے کہ کس کو راہنما سمجھیں۔ ایک، ایک راستہ پر لے جانا چاہتا تھا۔ تو دوسرا، دوسرے راستہ پر ---- سب الگ الگ سر الاپ رہے تھے۔ "ذوق نغمہ" کی شدت اور کثرت اب کہاں میسر آتی۔ بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانہ میں اپنی صدا کو بند کر دیا ہے۔"[112]

ہندوستان میں ہر طرف ناکام "انقلاب" کا رد عمل شروع ہو گیا۔ اور بد قسمتی سے اس رد عمل میں جنھوں نے سب سے زیادہ جانی، مالی اور اخلاقی نقصان اٹھایا وہ مسلمان ہی تھے۔

محمد علی جیل میں تھے کہ وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر نے یہ بیان دیا کہ :۔

> "میں جب ان بد قسمت مہاجرین کے بارے میں سوچتا ہوں جو خیبر کی پہاڑیوں میں لقمۂ اجل بن گئے۔ اور جنکی ہڈیاں وہیں دفن ہیں۔ انکوان دو بھائیوں (علی برادران) اور انکے ساتھیوں نے ہجرت پر اکسایا تھا۔ جنھوں نے خود سوائے پیرس اور لندن کے کبھی کسی اور جگہ ہجرت نہیں کی۔ میں یہ بھی سوچتا ہوکہ اس ملک کے غریب مسلمانوں کی جیبوں سے جو رقم نکالی گئی۔ اسکا زیادہ تر حصہ مختلف طریقوں سے خرد برد کیا گیا۔ آخر میں مجھے خیال آتا ہے کہ مالابار میں بہت سے ہندوؤں کو ذلیل ورسوا کیا گیا۔ بہت سے قتل ہوئے۔ ہزاروں موپلوں کو غلط راستے پر لگا دیا گیا۔ وہ موت کا شکار ہوئے اور برباد ہوئے۔ یہ سب تباہی محمد علی۔ شوکت علی اور ان لوگوں کے اشتعال دلانے پر ہوئی۔ جو علی برادران کے ہم خیال تھے۔ جناب والا! مجھے حیرت ہے کہ یہاں کے مسلمان کتنے سادہ لوح ہیں۔ جو اس طرز عمل کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایسے افراد کو راہنما تسلیم کر لیتے ہیں۔"[113]

اگرچہ محمد علی اور شوکت علی نے ہجرت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ لیکن وہ اسکے اصل محرک نہ تھے۔ جہاں تک مالابار کے موپلوں کا تعلق ہے۔ انہوں نے تو محمد علی کو دیکھا تک نہ تھا۔ اور نہ انکی تقریر سنی تھی۔ وزیر داخلہ نے ہندوؤں کو ذلیل ورسوا اور قتل کرنے کا جو مسئلہ اٹھایا۔ اسکے پس پردہ ہندو مسلم تعلقات کو غیر مستحکم کرنے کا جذبہ کار فرما تھا۔ محمد علی پر یہ الزام کہ انہوں نے غریب عوام کی جیبوں سے روپیہ نکلوا کر خرد برد کیا، سراسر غلط ہے۔ محمد علی کی تمام زندگی شفاف آئینے کی طرف سب کے سامنے ہے کہ انہوں نے کتنی تنگ دستی اور عسرت میں زندگی بسر کی۔ ملک و قوم کیلئے جانی و مالی قربانیوں سے کبھی دریغ نہ کیا۔ بلکہ جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی وہ بھی ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دی۔ انکی تو کوئی جائیداد اور بنک بیلنس بھی نہیں تھا۔ بنظرِ غور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ محمد علی نے سید احمد خان کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنا سب کچھ ملک و قوم کی بھلائی میں نذر کر دیا۔ اور کوئی ترکہ نہ چھوڑا۔ جہاں تک مالابار کے واقعہ کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں کو جبراً ہندو بنانے کی افواہیں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھیں۔ ہندو فرقے کو مستحکم و منظم کرنے اور دوبارہ ہندو بنانے کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ جسکا واضح ثبوت شدھی اور سنگھٹن تحریکیں تھیں۔ جنکی وجہ سے مسلمانوں میں ردعمل کے طور پر تبلیغ و تنظیم جیسی تحریکوں نے جنم لیا۔ منفی پروپیگنڈہ کے سلسلے میں پروفیسر محمد مجیب بھی وزیرِ داخلہ کے ہم خیال مکتب فکر کے حامی تھے۔ جنہوں نے واقعات کا تجزیہ، علت واسباب اور حقائق معلوم کئے بغیر ہر واقعہ کا ذمہ دار محمد علی کو ٹھہراتے ہوئے Frances Robinson کی طرح انپر تنقید کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھا ہے۔

معاہدہ لوزان

بیرون ملک اتحادی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان میں کچھ لچک پیدا ہوئی اور ترکی کے ساتھ معاہدہ صلح

کے سلسلے میں پیش رفت ہوئی۔ جولائی 1923ء میں لوزاں میں صلح کانفرنس ہوئی۔ اس میں سلطنت ترکیہ تو ضرور ختم کر دی گئی۔ لیکن ترکوں کو اپنے علاقے پر آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق دے دیا گیا۔ جسکے بعد انگورہ میں ایک قومی اسمبلی قائم ہوئی۔ اسکے صدر مصطفیٰ کمال پاشا تھے۔ سلطان وحید الدین اب بھی خلیفہ تھے۔ لیکن انکے سارے اختیارات قومی اسمبلی کو منتقل کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں بعد سلطان وحید الدین کو ترکی چھوڑنا پڑا اور انکی جگہ عبدالمجید خلیفہ بنے۔[114]

محمد علی کی رہائی

اکتوبر 1923ء میں محمد علی قید سے رہا کر دیئے گئے۔ (بعض کے مطابق رہائی کا مہینہ اگست ہے۔) اس وقت ملک کی سیاسی صورتحال بدتری کے دہانے پر تھی۔ رہائی کے فوراً بعد ہی محمد علی ہندوستان میں مختلف متضاد عناصر کے درمیان اتحاد قائم کرنے کیلئے کانگریس کے صدر چن لیئے گئے۔ محمد علی نے دوران صدارت عدمِ تعاون کی تحریک کو جاری رکھا۔ دسمبر 1922ء کانگریس کے اجلاس منعقدہ گیا میں سی۔آر۔داس اور موتی لال نہرو نے "سوراج پارٹی" کے نام سے ایک جدید سیاسی جماعت قائم کرلی تھی۔ جس کے صدر سی۔ار۔داس، جنرل سیکرٹری موتی لال نہرو، اور سیکرٹری تصدق احمد خان شیروانی منتخب ہوئے اس پارٹی کے تمام ممبر تبدیلی پسند تھے۔[115] جنکا مقصد یہ تھا کہ جدید اصلاحات کو ناکام بنانے کیلئے کونسلوں پر قبضہ کرلیا جائے۔ کانگریس اس وقت تک سختی سے عدمِ تعاون کی حکمت عملی پر قائم تھی۔ لیکن سوراج پارٹی کے قیام سے کانگریس دو گروہوں میں منقسم نظر آنے لگی۔ محمد علی نے تبدیلی پسندوں اور غیر تبدیلی پسندوں میں توازن و یگانگت برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ محمد علی اور گاندھی کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن انکی حیثیت خیر سگالی کے انفرادی مظاہرے سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ کانگریس کے اندر مخالفانہ خیالات کا اظہار کیا جانے لگا تھا۔ 1923ء میں مسٹر نہرو نے بلدیاتی انتخابات میں شمولیت کا فیصلہ کر کے کانگریس اور انگریزی حکومت کے درمیان تعاون کی راہ ہموار کر دی۔ مسٹر نہرو کا خیال تھا کہ اسطرح ہوم رول کی جانب تیزی سے قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ کانگریس کے اندر بھی انکے ہم خیال پیدا ہو چکے تھے۔ ملک میں جا بجا ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ کانگریس جو اتحاد کی علمبردار تھی۔ شدید اندرونی نزاع کا شکار تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ قانون ساز مجلسوں کے بائیکاٹ کی پالیسی کو بدل کر نئے انتخابات میں حصہ لیا جائے یا نہیں۔ ستمبر 1923ء کو دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اس مسئلے کا فیصلہ کرنے کیلئے اجلاس ہوا۔ اس میں محمد علی نے دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرانے کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ آخر آپس کے سمجھوتے سے یہ ریزولیوشن پاس ہوا کہ کانگریس عدمِ تعاون کی پالیسی پر گامزن ہے۔ لیکن ان ممبروں کو جو انتخابات میں حصہ لینے کے خواہش مند ہیں، انہیں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ کانگریس پر متعصبانہ ہندو ذہنیت کا حامل مہاسبھائی گروہ حاوی ہو چکا تھا۔[116] یعنی اس کا مطلب ہے کہ بالواسطہ نا سہی، بلاواسطہ ہی سہی، کانگریس ترک عدمِ تعاون کے راستے پر چل پڑی۔ آخر مہاسبھائی بھی تو کانگریس ہی کا حصہ تھے۔

دوسری طرف پنجاب خلافت کمیٹی اور احرار پنجاب نے مرکزی خلافت کمیٹی کو مجبور کیا کہ وہ بھی خلافت کے

ٹکٹ پر لوگوں کو اسمبلی اور کونسل میں جانے کی اجازت دے دیں۔ تاکہ ان جگہوں پر ہمارا بھی اثر و اقتدار رہے۔ لیکن محمد علی نے شدید اختلاف کیا کہ جس چیز کو خوب سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد چھوڑ چکے ہیں، تو پھر کانگریس کی تقلید میں ایسا کرنا کہاں کی دانائی ہے ؟ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ جس کا دل چاہے وہ ذاتی یا شخصی حیثیت میں حصہ لے سکتا ہے، خلافت کے ٹکٹ پر نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان ایک نکتے پر متحد ہی نہیں تھے۔ اور پھر جس پالیسی کو نظریہ ضرورت کے تحت یا دباؤ کی وجہ سے لچکدار اور غیر لچکدار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، وہ کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی تحریک عدمِ تعاون کے ساتھ بھی ہوا۔ اور یہ چیز مزید اختلافات پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ محمد علی نے رہائی کے بعد خلافت کمیٹی کو خواب گراں سے جگانے، کانگریس کو نئے سرے سے منظم کرنے اور ہندو مسلم تعلقات بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن یہ ردِ عمل کا زمانہ تھا۔ جذبات سرد پڑ رہے تھے۔ اسلیئے محمد علی کی آواز کچھ زیادہ بااثر ثابت نہ ہو سکی۔ دسمبر 1923ء میں محمد علی نے کانگریس اور خلافت کانفرنس کی کوکناڈا میں صدارت کی۔ آپ نے اجلاس کو کناڈا میں بھی ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت اور اسے قائم و دائم رکھنے پر طویل ترین تاریخی خطبہ دیا۔[117] لیکن ان تمام کوششوں اور باتوں کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ جمعیت العلماء کا بھی وہیں اجلاس ہوا۔ ایک سال کی خاموشی کے بعد اس سال مسلم لیگ کا اجلاس بھی لکھنؤ میں ہوا لیکن وہ ہر اعتبار سے بے جان تھا۔ کانگریس کے اجلاس میں سوراج پارٹی کے حامیوں اور ترک تعاون کے داعیوں میں کافی گرما گرمی رہی۔ گو اس اجلاس نے ترک تعاون کی تجویز کو بحال رکھا۔ لیکن سوراج پارٹی بھی بدستور اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔[118]

شُدھی تحریک اور "تبلیغ" کا آغاز

اس دوران وہ پروپیگنڈہ بھی رنگ لیا۔ جو بسلسلۂ تحریک خلافت ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈلوانے کیلیئے شروع کیا تھا۔ اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے والے ہندوؤں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا۔ کہ واقعی مسلمانوں نے انہیں تحریک خلافت کے دوران اپنے اسلامی مقاصد کی تکمیل اور اسلام کے مفاد کیلیئے استعمال کیا ہے۔ کٹر ہندوؤں کو تو یہ کہنے میں بھی باک نہ تھا کہ ہندوؤں کا تحریک خلافت میں شرکت کا فیصلہ غیر دانشمندانہ تھا۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ ملیچھ لوگوں سے اپنے آپ کو پاک کرنے کیلیئے اسلام سے توبہ کریں۔ اور اپنی آتما اور شریر کو پوری طرح ہندومت کے حوالے کر دیں۔ یہ شدھی تحریک تھی۔ اس تحریک کو مزید کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلیئے حکومت نے سوامی شردھانند کو جو تحریک خلافت کے دوران سزا یافتہ تھے اور رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جن سے مسلمانانِ دہلی نے جامع مسجد کے منبر پر تقریر کروائی تھی، معیادِ اسیری پوری ہونے سے پہلے ہی رہا کر دیا۔ شردھانند نے جیل سے باہر آتے ہی اپنی کارگزاریوں کا ثبوت یہ دیا کہ ملکانہ کے راجپوتوں پر چھاپہ مارا، جو نو مسلموں ہی کی طرح تھے۔ کیونکہ کلمہ پڑھنے کے علاوہ انکی کوئی اسلامی تربیت نہ ہوئی تھی۔ انہیں ہزاروں کی تعداد میں آسانی سے قابو کر کے انہیں شدھ کر لیا۔ اس سے مسلمانوں کو شدید صدمہ ہوا۔ ان میں مخالفانہ ردِ عمل پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے دفاعی مہم کے طور پر "تبلیغ" کا آغاز کر دیا۔[119]

شدھن اور تنظیم تحریکوں کا قیام

شدھی تحریک نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کو ہوا دی اور اپنی کوکھ سے "شدھن تحریک" کو جنم دیا۔ اس دہشت گرد اور متشدد تحریک نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے، انکے جذبات کو برانگیختہ کرنے، عدم تشدد کا رویہ ترک کر کے جارحانہ طرز عمل اختیار کرنے اور مسلمانوں پر مسلح حملے کرنے کی ترغیب دی۔ شدھن تحریک نے ہندوؤں میں جنگجوئی اور دہشت گردی کی لہر پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔ رد عمل اور جوابی کاروائی کے طور پر "تنظیم" کی تحریک وجود میں آئی۔ شدھن کے حامی مسلمانوں سے اس ظلم و زیادتی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ جو انکے خیال میں ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں نے روا رکھی تھی اور جس کے تحت انکے کروڑوں ہم مذہبوں کو زبردستی مسلمان بنا لیا گیا تھا۔[120] قصہ کوتاہ یہ کہ مسلمان اور ہندو رہنماؤں کے جذبہ خیر سگالی اور خصوصاً مسلمان رہنماؤں کے نیک ارادوں کے باوجود ان دونوں قوموں کے درمیان ہندوستان کی آزادی جیسے مشترکہ مسئلے کیلئے باہمی جدوجہد کرنے کے امکانات آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے۔

شدھی تحریک کے سربراہ سوامی شردھانند جنھیں کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں نے جذبہ اتحاد میں بہت زیادہ عزت دی تھی۔ اب وہ آریہ سماجیوں کے لیڈر تھے۔ آریہ سماجیوں کے متعلق محمد علی رقمطراز ہیں کہ :۔

> "جو طریقہ تبلیغ آریہ سماجیوں نے اختیار کیا ہے اور جسطرح وہ لوگ بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں۔ اور مسلمان حکمرانان ہند سے جو پرخاش انہیں ہے۔ اور جسطرح جذبہ انتقام سے یہ لبریز ہیں۔ اس سے مجھے سخت نفرت اور بیزاری ہے۔"[121]

محمد علی سوامی شردھانند کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ :۔

> "سوامی شردھانند کو مالوی جی سے زیادہ بہادر اور زیادہ آزاد خیال سمجھتا تھا۔ اور سمجھتا ہوں ---- لیکن میں ہرگز ایسے شخص کو ملک کا دوست نہیں سمجھتا جو مسلمانوں کے خلاف ذلیل حرکات کرنے والوں کو پناہ دے یا دلائے یا پناہ دینے یا دلانے والوں کو دوست رکھے۔"[122]

ترکی میں خلافت کا خاتمہ

محمد علی ہندوستان کے اندرونی حالات اور ہندو مسلم اختلافات و فسادات کی وجہ سے پریشان تھے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے مارچ 1924ء کو ازخود ترکی میں خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ترکی میں خلافت ختم کرنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا کہ :۔

> "خلافت کا مطلب صاحب اقتدار ہونا ہے اور چونکہ خلافت کے باقی رہنے سے ترکی کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں خلیفہ کی دخل اندازی کا راستہ ہموار ہوتا تھا۔ اسلیئے انہوں نے اس فتنہ کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا ہے۔"[123]

محمد علی ترکی کو خلافت کی جو قابل تعظیم اور بلند ذمہ داری سونپنا چاہتے تھے، اسکو مصطفیٰ کمال پاشا نے ترک قوم کے کندھوں سے اتار پھینکا۔ دراصل یہ قوم زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد انتہائی بے حال اور پریشان ہو چکی تھی۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی تقاریر کے مجموعہ "نطق" میں بیان کیا ہے کہ :۔

"---اس قسم کی بھاری ذمہ داری ترک قوم کو تفویض کرنے سے پہلے کیا یہ سوچنا ضروری نہیں تھا کہ یہ قوم اسکی متحمل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ قوم اسکو قبول کر نہیں سکتی۔ ترکی کے عوام اسقدر عظیم ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنی غیر منطقیانہ اور عجیب و غریب ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔"[124]

مصطفیٰ کمال پاشا کے ترکی میں خلافت کے خاتمے سے مسلمانانِ ہند اور خصوصاً محمد علی کو شدید دھچکا لگا۔ انکی حالی و تحفظ خلافت کے سلسلے میں تمام کوششیں، مالی قربانیاں اور آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ اس فیصلہ و اعلان سے تحریک خلافت کی بقا کا جواز ختم ہو گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی شاندار اسلامی ادارے کا قلع قمع ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ لوگوں نے محمد علی پر یہ الزام عائد کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو اندھیرے میں رکھا اور گمراہ کیا ہے۔ حالانکہ محمد علی کی خواہش تو یہ تھی کہ ترکی پھر سے ایک عظیم اسلامی طاقت بن جائے تاکہ جسطرح برطانیہ اور فرانس سلطنت ترکیہ میں اقلیتوں کے ذریعے بے چینی پھیلاتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر کے انگریز حکومت پر اپنا دباؤ بڑھائیں۔ انہیں کامل یقین تھا کہ ترکی کی مضبوطی سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان دوستی و تعاون کا پل تعمیر ہو گا۔ اور اس سے تقویت پا کر وہ اپنی آزادی کی جدوجہد میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد اسلامی عنصر میں کمی پر انہیں شدید دکھ اور مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے خلاف تھے۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے سے وہ اپنی آزادی کی جنگ میں ایک مؤثر ہتھیار سے محروم ہو گئے۔

شروع میں محمد علی کو اس خبر کا یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ وہ اس خبر کو انگریزوں کی ایک چال قرار دے رہے تھے۔ لیکن جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو گویا ان پر بجلی گر پڑی۔ محمد علی نے جامع مسجد علی گڑھ میں اس سلسلے میں درد انگیز تقریر کی۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ترکوں نے ہمیں میلے رومال کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا ہے۔ محمد علی نے 18 مارچ 1924ء کو علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"خلافت اسلام کی روح ہے۔ مجھے اس بات سے اور زیادہ صدمہ پہنچا کہ اسلام کو اسکے تاریخی علمبرداروں نے زک پہنچائی۔"[125]

تاہم انہوں نے اپنی تقریر میں زبردست احتیاط سے کام لیا اور بے جا تنقید نہ کی۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ برطانیہ اس واقعہ کو اچھال کر مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیکر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کا یہ کہنا کہ محمد علی نے اپنی خفت چھپانے کیلئے مصطفیٰ کمال کو تار بھیجے اور درخواست کی کہ وہ ان سے خلافت کے مسئلہ پر گفتگو کریں۔[126] بے بنیاد ہے۔ کیونکہ مصطفیٰ کمال کے بیانات اور اقدامات کے بعد ادارہ خلافت کی بحالی کا جواز ہی ختم ہو گیا تھا۔ اور محمد علی اس

حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔

مجموعی جائزہ

تحریک خلافت جو بین الاقوامی اسلامی مسئلہ کے حل کیلئے شروع کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں بعض حضرات تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس تحریک کو شروع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ترکی کا مسئلہ ایک غیر ملکی مسئلہ تھا۔ ایسی بات اگر غیر مسلم کہیں تو پھر بھی گوارا ہے۔ لیکن کسی مسلمان کی زبان سے ایسی بات کا ادا ہونا انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ کیا انکے نزدیک یہ فرمان کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ :۔

انما المومنون اخوۃ

ترجمہ:۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اسلام میں تو زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ اس میں عرب، ترک، ہندوستانی، پاکستانی، انڈونیشی کی کوئی قید نہیں ہے۔ جو مسلمان ہے وہ اس عالمگیر برادری کا رکن ہے۔ اگر مسلمانوں میں پہلے ہی اس عالمگیر رشتے کا احساس پیدا ہو جاتا تو مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کا غلام نہ بننا پڑتا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عہد نبوی، خلافت راشدہ وغیرہ میں جنگیں خالصتاً جذبہ جہاد کے تحت لڑی گئی تھیں۔ عراق و ایران اور روم و شام کی فتوحات اسی عالمگیر رشتے کے احساس اور جذبہ جہاد کا نتیجہ تھیں۔ اور پھر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف جو سلطان ترکی کے ماتحت تھے، کیا انپر صرف ترکوں کا حق تھا؟ بحیثیت مسلمان یہ مقدس جگہیں سب کیلئے برابر اہمیت کی حامل تھیں۔ اور سب پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ انہیں غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے سے روکیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب مسلمانانِ ہند ترکی کی بلاواسطہ یا بالواسطہ مدد کرتے۔ حضور ﷺ کی یہ وصیت کہ حرمین کی حدود میں غیر مسلم داخل نہ ہوں اور سورۃ توبہ میں آتا ہے کہ :۔

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا

ترجمہ:۔ بے شک مشرکین تو ناپاک و نجس ہیں۔ سو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک بھی نہ آئیں۔

مسلمانوں پر تو جہاد کا فریضہ عائد ہو گیا تھا۔ انہوں نے تحریک چلا کر کسی پر احسان نہیں کیا تھا۔ جہاد کے بارے میں آیت مبارکہ میں ہے کہ :۔

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہٖ

ترجمہ:۔ اور اللہ کی راہ میں اسطرح جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

کتب علیکم القتال و ھو کرہ لکمہ وعسیٰ ان تکرھوا شیأ و ھو غیر لکم و عسی ان تحبوٗا شیأ و ھو شر لکم و اللہ یعلمہ و انتم لا تعلمون ٥

ترجمہ:۔ مسلمانو تم پر اللہ کے راستے میں لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری

لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور (ان باتوں کو) اللہ (ہی بہتر) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (216-2)

مسلمانوں پر یہ فرض تو اسی وقت عائد ہو گیا تھا جب انگریزوں اور اتحادیوں نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف طبلِ جنگ بجایا تھا۔ تحریک خلافت ہی کی بدولت برصغیر کے مختلف علاقوں کے درمیان رشتۂ اخوت مضبوط ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے وجود کو عالم اسلام کا جزو سمجھنے لگے۔ مسلمانوں کے اندر عالمگیر برادری ہونے کا احساس اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ جس سے پان اسلام ازم کا احیاء ہوا۔ تحریک کے دوران مسلمانوں کا جوش و خروش فی الحقیقت اسلامی قومیت کے جذبہ کا بھرپور مظاہرہ تھا۔

نیازی برکس اور پروفیسر بایور (Bayur) نے تحریک کو منفی رنگ دیتے ہوئے عجیب منطق پیش کی ہے کہ تحریک خلافت اور ترکی کی تحریک آزادی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ تحریک خلافت کی وجہ سے ترکی کے خلاف برطانیہ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ ترکوں کی جنگِ آزادی کی بنا پر ہندوستانی عوام کا حوصلہ بلند ہوا۔ اور انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ بایور نے یہ رائے قائم کی ہے کہ۔

"ترکی کی جنگِ آزادی نہ لڑی جاتی تو یہ واقعات (برصغیر میں انگریزوں کے خلاف کی جانے والی جدوجہد) یا تو بالکل نہیں ہوتے یا انکی نوعیت بہت معمولی ہوتی۔ اس لحاظ سے برطانوی سلطنت پر بہت معمولی دباؤ پڑتا۔"[127]

اگر بایور کا یہ بے بنیاد الزام مان بھی لیا جائے کہ دونوں ملکوں میں آزادی کی تحریکیں ایک دوسرے سے الگ شروع ہوئیں۔ تو یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے۔ کہ ترکی جیسے دور دراز ملک میں ترک قوم کی کامیابی و کامرانی سے برصغیر میں انگریزی حکومت کو نقصان پہنچا۔ اور اس لحاظ سے وہاں کے عوام کو تقویت ملی۔ پروفیسر گون گور نے پروفیسر بایور اور نیازی برکس کے اس الزام کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ :-

"چونکہ یہ تحریکات اپنے ابتدائی برسوں میں مغرب کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر شروع ہوئیں۔ اس وجہ سے قومیت، اتحاد اسلام یا خلافت کی حمایت جیسے خیالات و افکار میں کوئی تصادم نہیں۔ بلکہ ان سب میں اشتراک و تعاون کے امکانات پیدا ہوئے۔"[128]

بقول محمد صادق

"ان دونوں تحریکوں میں بڑی ہم آہنگی اور گہرا تعاون موجود تھا۔"[129]

بقول پی۔ ہارڈی

"گویا بظاہر یہ دونوں تحریکیں الگ الگ صورتوں میں شروع ہوئیں۔ یعنی ایک کا مقصد اتحاد اسلام اور دوسری کا قومیت تھا۔ لیکن بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہ تھا۔"[130]

"ترکی میں ماڈرن اسلام" کے مصنف نیازی برکس، پروفیسر بایور، پروفیسر Robinson اور محمد مجیب نے تحریک خلافت کے

حوالے سے محمد علی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے محمد علی کو شر پسند، قدامت پسند، بنیاد پرست، لالچی، اور سازشی قرار دیتے ہوئے تحریک خلافت کو انگریزوں کی حمایت میں "سازش" کا نام دیا ہے۔[131] بقول نیازی بر کس

"ہندوستان میں مسلمانوں کی وطن پرستی، خلافت کے نام پر چلائی جانے والی تصوراتی تحریک خلافتِ ہند کو انگریزوں کے مفاد کی خاطر، گاندھی کی نیشنل کانگریس کی تحریک سے الگ کرنا ضروری ہے۔"[132]

دراصل یہ وہ حضرات ہیں۔ جو مذہب و سیاست کو الگ الگ دھاروں میں دیکھتے ہیں۔ وہ سیکولر نظریات کے پروردہ، مذہب کو نجی معاملہ قرار دیکر اسکے حکومت و سیاست میں مداخلت کے قطعی خلاف ہیں۔ اسلیئے انہوں نے محمد علی کے نظریہ مذہب و سیاست کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ خلافت تحریک ایسی انتہا پسندانہ تحریک تھی۔ جسکا مقصد عوام کو دھوکا دینا اور انگریزوں کو خوش کرنا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس تحریک کو قومی زمرے سے خارج قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ محمد علی کی اس تحریک کی بدولت ہندوستانیوں میں آزادی و حریت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ترکی کی تحریک آزادی کی بدولت انہوں نے اسکے اثرات کو قبول کیا۔

حالانکہ تحریکِ خلافت نے مسلمانانِ ہند کو فکری اور تنظیمی اعتبار سے مستعد اور فعال بنایا۔ انکے اندر اپنے حقوق کے حصول کیلیئے جدوجہد کا عزم بیدار کیا۔ اور بین الاقوامی سطح پر اس حقیقت کا ثبوت فراہم کیا کہ مسلمان روئے زمین کے کسی خطے میں آباد ہوں۔ انکا دل ہمیشہ ایک دوسرے کیلیئے دھڑکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر تحریک خلافت کا ہندوستان کی سیاست سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن جہاں اس تحریک کے آغاز سے ترکی میں سامراجی قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے ترک مسلمانوں کو حوصلہ ملا۔ وہاں برصغیر کے مسلمانوں کو بھی سامراجی اقتدار اور ہندو سیاست کی منافقانہ روش کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

دوسری اہم چیز جو اس تحریک کے دوران سامنے آئی وہ ہندو مسلم اتحاد تھا۔ جس کا آغاز محمد علی جناح کی کوششوں سے میثاقِ لکھنؤ 1916ء میں ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد وقت کی اہم سیاسی ضرورت تھی۔ ملک کے سیاسی حالات الجھتے ہی جارہے تھے۔ مانٹیگو چمفسورڈ اصلاحات 1919ء کی آمد، جنگِ عظیم اول میں ترکوں کے ساتھ سلوک، قانون تحفظ کا نفاذ، ہندو مسلم راہنماؤں کی گرفتاریاں، پریس ایکٹ کے تحت زبان بندی کا اقدام وغیرہ۔ یہ ایسے مصائب و مسائل تھے۔ جنکا تعلق ہندوستان کے تمام فرقوں سے تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو رولٹ ایکٹ 1919ء آگیا۔ اس ایکٹ کے خلاف احتجاج پنجاب میں مارشل لاء کا سبب ثابت ہوا۔ مارشل لاء کے دوران ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے۔ وہ ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان حالات میں ضرورت اس امر کی تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب، انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو جائیں۔ گاندھی کی "ستیہ گرہ" تحریک اس سلسلے میں تمہید بن چکی تھی۔ مسئلہ خلافت کی وجہ سے مسلمانوں میں شدید اضطراب پیدا ہوا۔ یہ وہ عناصر تھے جنکی بدولت ہندو مسلم متحدہ محاذ کی صورت میں انگریزوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ تحریک خلافت اگرچہ مذہبی تحریک تھی۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر ہندوؤں سے اتحاد ناگزیر تھا۔ ہندو اکثریت میں تھے۔ اکثریت کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کی

آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ جہاں تک گاندھی کی ذات کا تعلق ہے۔ وہ ہندوؤں کے مسلمہ لیڈر تھے۔ انکی تحریک میں شرکت پوری ہندو قوم کی شرکت تھی۔ ان حالات میں محمد علی یا دیگر مسلم لیڈر گاندھی یا ہندوؤں کی تائید کو ٹھکرا دیتے تو غیر دانشمندی ہوتی۔ ناگزیر حالات میں تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی سمجھوتے کی اجازت دی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ :۔

لا يتخذ المومنون الكفرين اولياء من دون المومنين و من يفعل ذالك فليس من الله في شي الا ان تتقوا منهم تقةً ٥

ترجمہ:۔ مومنوں کو چاہیے کہ مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا۔ اس سے اللہ کا کچھ عہد نہیں۔ ہاں اگر اس طریق سے تم ان (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو (تو مضائقہ نہیں)۔ (3-28)

لیکن اعتدال کی بجائے انتہائی راستہ اختیار کرنا بھی غلط تھا۔ فرمان نبوی ﷺ ہے :۔

ترجمہ :۔ میانہ روی اختیار کرو۔

لیکن یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محمد علی اور انکے رفقاء کار نے ہوش کی بجائے جوش سے کام لیتے ہوئے گاندھی اور ہندوؤں پر بے جا اعتماد کیا۔ جس سے ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا۔ اپنے آپکو مضبوط کیا۔ مسلمان جو اب تک کانگریس سے الگ رہے تھے، تحریک کے دوران اس میں شامل ہو کر اسے ایک عوامی جماعت بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر عابد کر

"کانگریس کو حقیقتاً عظیم اور طاقتور بنانے والے ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے۔"[133]

ہندو مسلم اتحاد کے پردے میں گاندھی اور انکے حواریوں نے جسطرح فائدہ اٹھایا۔ جلد ہی اس کی قلعی کھل گی۔ تحریک خلافت کی ناکامی اور ہندو مسلم فسادات نے اسکے تمام پردے چاک کر دیے۔

اگر خالصتاً سیاسی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو تحریک کا یہ سارا دور اپنی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود بے نتیجہ سیاسی بحران کا باعث ثابت ہوا۔ جسکا سراسر نقصان مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اس عظیم نقصان کی وجہ بلاشرط اشتراکِ عمل تھا۔ سوراجیہ کے "امام" اور ہندوؤں کے مقبول و محبوب لیڈر لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک نے یکم مئی 1916ء کو بلگام میں ہوم رول پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

> "آخر ہم کیا مطالبہ کرتے ہیں ؟ کیا ہم انگریزی گورنمنٹ کو نکالنا چاہتے ہیں ؟
> ---انگریزی حکومت برقرار رہے گی۔ شہنشاہ معظم بدستور ہمارے حاکم رہیں
> گے۔ فرق یہ صرف یہ ہوگا کہ بجائے گورے ملازموں کے بادشاہ کے کارکن کالے
> آدمی ہونگے۔"[134]

اسی انتہا پسند ہندو لیڈر (مسٹر تلک) نے اکتوبر 1917 کو الہ آباد میں ہوم رول کے خلاف اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

> "ہوم رول کے خلاف ایک اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ اگر آپکو ہوم رول دیدیا
> گیا۔ تو آپ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے۔ لیکن یہ بالکل وہم ہے۔

> ہندوستانیوں کو تو انگریزوں کے انگریزی انسٹی ٹوشنوں اور انگریزی سلطنت کی ضرورت ہے وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا اندرونی انتظام ہندوستان کے زیرِ نگرانی رہے۔"[135]

مسٹر تلک کی ہندوستانیوں سے مراد تمام ہندوستانی نہیں بلکہ صرف ہندو قوم تھی اس قسم کے بیانات کے بعد بھی کیا اس مغالطے کی گنجائش رہ جاتی تھی کہ ہندو جو انتہائی متعصب اور مسلم دشمنی میں سر فہرست ہیں، ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں یا انگریزوں کو ملک سے نکالنے میں مسلمانوں کی مدد کریں گے۔ جب ملک کی آزادی کا خیال ہی مٹ گیا تو اس دلیل کا کیا وزن رہ گیا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جہاں تک تقسیم اقتدار کا سوال تھا یہ رزمی نہیں آئینی مسئلہ تھا۔ ایسے معاملات کا حل جنگ کے میدانوں میں نہیں سیاست کے ایوانوں میں ہوتا ہے۔ انہیں جوش سے نہیں بلکہ ٹھنڈے دل ودماغ سے طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی محمد علی میں بھی کمی تھی۔

جہاں تک تحریک ہجرت کا تعلق ہے یہ ایک جذباتی اور غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ تحریک کے دروان تمام مکاتیبِ فکر کے علماء بھی ایک پلیٹ فارم پر متحد نہ تھے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا اشرف علی تھانوی اور فرنگی محل کے کچھ علماء تحریک ہجرت اور عدمِ تعاون کے سخت خلاف تھے۔ لیکن اسکے داعیوں نے جن میں محمد علی بھی پیش پیش تھے۔ قرآن وسنت کے حوالوں سے اپنے اقدامات کو صحیح ثابت کیا۔ لیکن دوسرا پہلو، کہ وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق اجتہاد کی بھی گنجائش ہوتی ہے یکسر نظر انداز کر دیا۔ ترکِ موالات یا عدمِ تعاون ہی کو لیجیے مسلمانوں کے پاس اسکا نعم البدل کیا تھا۔ جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے اسکے داعیوں نے اس کے تانے بانے ہجرت مدینہ سے بنے۔ حالانکہ طریقۂ کار اور حالات وواقعات کے لحاظ سے اس وقت اور اب کے وقت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ تحریکِ ہجرت جسکو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس سے مسلمانوں کو کس قدر شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا جس سے تحریک خلافت کو شدید جھٹکا لگا۔

جہاں تک خلافت تحریک کا تعلق ہے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ یہ اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام ہوئی یا بے نتیجہ کیوں رہی؟ دراصل جس مقصد کے لیے تحریک شروع کی گئی تھی۔ وہ مسلمانانِ ہند کا اندرونی مسئلہ نہیں تھا جس پر انہیں مکمل اختیار ہوتا۔ اس کا تعلق اسلامی ملک ترکی سے تھا۔ جو اپنے اندرنی معاملات میں آزاد اور خود مختار تھا۔ جب ترکی نے خود ہی ادارہ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ تو تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی۔ بے نتیجہ اسلیئے رہی کہ تحریک کیلیئے مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہندوؤں کا پروگرام ہوتا تھا۔ ہندو ہی اسکے رہنما تھے۔ اگرچہ محمد علی اور دیگر رہنما سرگرم عمل تھے۔ لیکن وہ ہندو رہنماؤں کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ مبادا نفاق پیدا ہو جائے اور تحریک کو نقصان پہنچے۔ حالانکہ مستقبل قریب میں وہی ہو کر رہا جسکا ڈر تھا۔ ہندوؤں نے اسوقت تک مسلمانوں سے کام لیا جب تک انکی ضرورت تھی۔ اور اس وقت اس تحریک کو ختم کر دیا۔ جب انکی ضرورت پوری ہو گئی۔ چورا چوری کے معمولی سے واقعہ کو جواز بنا کر تحریک کو ختم کر دینا سراسر زیادتی تھی۔ جبکہ محمد علی اور دیگر مسلم لیڈر جیل جا چکے تھے۔ اور تحریک کی کمان گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ جس نے مسلمانوں کو اتنی قربانیوں کے بعد یہ حق بھی نہ دیا کہ وہ تحریک کو جاری

رکھنے یا ختم کرنے کا مشورہ دے سکیں۔ یہ تحریک "خلافت" کے استحکام کیلئے شروع کی گئی تھی۔ اس کا رخ بغیر کسی مؤثر تنظیم اور لائحہ عمل کے "ترک تعاون یا عدمِ تعاون" کی طرف موڑ دینا مناسب نہ تھا۔ بلا شبہ مسلمانانِ ہند کو مسئلہ خلافت کی مذہبی حیثیت سے دلچسپی تھی۔ لیکن "عدمِ تعاون" کی تحریک مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ ایک غلام اور محکوم قوم کے پاس اسکا متبادل کیا تھا۔ اسلام نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ناگزیر حالات میں ترکِ موالات یا ترک تعاون کی صورت میں اصول و ضوابط اور شرائط مقرر کی ہیں۔ کیا مسلمان معاشی طور اتنے مستحکم تھے کہ وہ سرکاری ملازمتوں کو ترک کر کے خوشحال زندگی بسر کر سکتے، یا متبادل معاشی نظام قائم کر لیتے؟ کیا سرکاری و نیم سرکاری تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر فوری اپنا آزادانہ تعلیم نظام قائم کر سکتے تھے۔ عدالتوں سے تعلق ختم کر کے غیر مسلموں سے حق و انصاف کی توقع رکھ سکتے تھے؟ قطعاً نہیں۔ محمد علی اور انکے رفقاء نے صرف ایک پہلو پر غور کیا۔ لیکن دوسرے تلخ پہلو کو یکسر فراموش کر دیا۔ مسلمان انتظامی و قانونی کونسلوں سے باہر رہ کر صرف پروپیگنڈہ سے اپنے آئینی و سیاسی حقوق حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسکے لیئے کونسلوں کے اندر جا کر آئینی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ بلکہ مسلمانوں نے کونسلوں کا بائیکاٹ کر کے ہندوؤں کیلئے راہیں مزید ہموار کر دیں۔ اور میدان خالی چھوڑ دیا۔ پھر انگریز حکومت سے گلہ کیسا؟ بالغ نظری سے دیکھا جائے تو ترک تعاون کی تحریک خالصتاً سیاسی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ جس سے ہندوؤں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ خلافت کی بحالی کیلئے تو جدوجہد میں مسلمان حق بجانب تھے، کہ انکے آگے کوئی منزل مقصود تو تھی۔ گو اسکے حصول میں ناکامی ہوئی۔ لیکن ترک تعاون کی تحریک کا کیا مقصد متعین کیا گیا تھا، ہندوستان کی آزادی؟ یا سیاسی اقتدار کا حصول؟ اول الذکر مقصد اس وقت محض ایک خواب تھا۔ اور ثانی الذکر مقصد صرف "شرائط تعاون" کی بنیادوں پر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن خلافت تحریک کے ذمہ دار لیڈروں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور جذبات کی رو میں بہہ کر صرف مذہبی پہلو کو پیش نظر رکھا، جو جوش و جذبائیت سے مزئین تھا۔ سیاسی پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ محمد علی جنگی شرکت نے تحریک میں شدید جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ وہ سیاسی سے زیادہ مذہبی آدمی تھے۔ محمد علی اس نظریہ کے حامی تھے کہ سیاست و مذہب لازم و ملزوم ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن قومی تنظیم کے بغیر محض مذہبی جوش و خروش کے بل بوتے پر کسی بھی مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ 1830ء کے بعد جب سے مذہبی گروہ نے ہندوستان کی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ کسی بھی سیاسی مسئلہ کو محض مذہبی جوش جذبہ کے تحت کوششِ تکمیل کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ سیاستِ ہند میں مذہبی گروہ کی عملی ابتداء سید احمد بریلوی سے شروع ہوئی۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ وہ مذہبی اعتبار سے تو ضروری سمجھا گیا۔ لیکن سیاسی حیثیت سے نہایت تباہ کن ثابت ہوا۔ سکھوں کے خلاف ناکام جہاد کے بعد انگریزوں کے خلاف مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر 1857ء میں مسلمانانِ ہند میدان عمل میں آئے۔ جسکا دردناک انجام تاریخِ ہندوستان میں محفوظ ہے۔ 1919ء میں پھر مذہبی بنیادوں پر مسئلہ خلافت سے متعلق تحریک کا آغاز ہوا۔ انجام کار ناکامی اور نقصان مسلمانوں ہی کا ہوا۔ بلا شبہ مذہب کو زندگی میں اولیت حاصل ہے۔ لیکن جب مذہب و سیاست کو آپس میں ملا دیا جائے تو قومی تنظیم از حد ضروری ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز صحیح معنوں میں آزاد ملک میں ہی ممکن العمل ہو سکتی تھی نہ کہ غلام ملک ہندوستان میں۔ بغیر قومی تنظیم کے جب بھی مذہبی بنیادوں پر کوششیں کی گئیں، نتیجہ ناکامی رہا۔ اور پھر مذہب کا تعلق دل سے اور

سیاست کا دماغ سے ہے۔ اور دل کے اعمال میں دماغ کو ماؤف رکھکر سیاست کی گتھیوں کو سلجھانا ممکن نہیں رہتا۔ محمد علی بھی تحریک خلافت کے دوران مذہبی جوش وخروش اور دینی حمیت کے جذبہ سے معمور ہر قدم دل کی روشنی میں اٹھاتے رہے۔

لیکن اس تحریک کا روشن پہلو بھی ہے کہ اگر طلباء کی سیاسی آبیاری نہ کی ہوتی۔ تو وہ تحریک پاکستان کے دوران کسطرح ہراول دستے کا کام دیتے اور مسٹر جناح علی گڑھ کو تحریک پاکستان کا اسلحہ خانہ کیسے کہتے ؟ مسلمانوں میں آزاد قومی تعلیم کا شعور اسی تحریک کی بدولت پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی تعلیمی درسگاہ جامعہ ملیہ دہلی اس کی واضح مثال ہے۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ برِ عظیم میں جو سینکڑوں مدارس قائم ہوئے۔ ان مدارس میں اسلامیہ کالج کلکتہ، نیشنل کالج پٹنہ اور قومی سکول دہلی خاص طور پر مشہور ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ترکِ موالات کے زمانے میں ابتدائی مدارس کی سطح سے جامعہ ملیہ تک 1921ء اور 1922ء میں تقریباً 1340 قومی اسکول اور کالج قائم کیئے گئے۔ جن میں تقریباً 98182 طلباء زیرِ تعلیم تھے۔[136]

یہی وہ تحریک ہے جس نے مسلمانوں کے "انتہا پسند "اور" وفادار طبقہ " کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ بقول کے۔ کے عزیز

> "بظاہر محمد علی، سر آغا خان، یا سید امیر علی اور ڈاکٹر انصاری میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ لیکن "وفادار طبقہ "اگر اخبار " ٹائمز" میں خلافت سے متعلق مضامین لکھتا تھا تو "انتہا پسند طبقہ " سیاسی ایجی ٹیشن کر رہا تھا۔ دونوں کے مقاصد یکساں اور مشترک تھے۔"[137]

اس تحریک نے مسلمانوں کو تحریک پاکستان کیلئے تیار کیا۔ تحریک پاکستان کے صف اول وصف دوم کے تمام لیڈر تحریک خلافت سے وابستہ تھے۔ ان میں شوکت علی، نواب اسمٰعیل خان (1883ء -1959ء)، حسرت موہانی، چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا اکرم خان، سردار عبدالرب نشتر، سر عبداللہ ہارون (1872ء-1942ء)، سید رؤف شاہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[138]

تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں نے جس جذبہ ملی اور جوش قومی کا مظاہرہ کیا اور جس دار فتگی وسر شاری کے ساتھ اس راہ میں اپنی جاں اور مال کی قربانیاں پیش کیں، ایک زریں باب ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ اولین تحریک تھی۔ جس نے حقیقتاً ملک میں بیداری پیدا کر دی۔ اور ہندوستانیوں کو سر فروشی کی راہ بتادی۔ یقیناً اس امتیاز اولیت کے ساتھ یہ چیز تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ رہے گی۔ جدید وقدیم مسلم طبقات میں مفاہمت، اتحاد بین المسلمین کا جذبہ، خود اعتمادی وخود انحصاری اور سیاسی تربیت اسی تحریک کی بدولت ہوئی۔ یہ چیزیں تحریک پاکستان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر اس وقت یہ تحریک شروع نہ ہوئی ہوتی تو مسلمانانِ ہند کو آزادی، اتحاد عالم اسلام، خود اعتمادی اور سیاسی شعور کے لحاظ سے بیدار ہونے میں مزید طویل عرصہ درکار ہوتا۔ آزادی یا تحریک پاکستان کا عمل تیزی کے ساتھ شروع نہ ہو سکتا۔ تحریک خلافت جس کے روح رواں محمد علی تھے، پہلی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کو من حیث القوم آزادی کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اب تک جو کوششیں ہوئی تھیں۔ وہ مسلمانوں کے مخصوص طبقوں تک محدود تھیں۔ اس تحریک نے قوم کو ایک رنگ میں رنگ دیا۔ خواہ علامتی طاقت سے ہو، یا اخلاقی حمایت واثر ورسوخ کے ذریعے سے، تحریک خلافت

نے ایک غلام اور غیر ملکیوں کے پنجے میں جکڑے ہوئے معاشرے میں آزادی و حریت کی روح پھونکنے کا اہم فریضہ سرانجام دیا۔ اور معاشرتی حرکت پیدا کی۔ اس نے قومی نصب العین کے حصول میں ایک زینے کا کام دیا۔ محمد علی جناح نے اپنی کامیاب جدو جہد اسی بنیاد پر کی۔ دراصل یہ تحریک، تحریکِ پاکستان کا لازمی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس اعتبار سے نہ محمد علی ناکام رہے اور نہ ان کی تحریک۔

حوالہ جات

1 - I غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص ص.47-48

II - سید حسن ریاض : پاکستان نا گزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.78

-III C.H. Philips : ***The Evolution of India and Pakistan 1858-1947.*** (London-1962) P-211

عارضی صلح نامہ کی شرائط:۔

1. درہ دانیال، باسفورس اور انکے علاوہ وہ قلعے جو ان پر ہیں، سب خالی کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔
2. تمام ترک فوج غیر مسلح کر دی جائے۔
3. تمام جہاز اتحادیوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔
4. اتحادیوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ فوجی نقطہ نظر سے جو بھی مقام اہم سمجھیں اسپر قبضہ کر لیں۔
5. ترکی کی ریلوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔
6. تمام ترکی بندرگاہیں اتحادیوں کے لیے کھول دی جائیں گی۔
7. تمام تار کی لائین اتحادیوں کے قبضے میں دے دی جائیں گی۔
8. ترک فوج کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ سب قید رہیں گے۔
9. ترکی کی افواج جو حجاز اور طرابلس میں ہیں۔ انکو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا۔
10. اتحادی فوجوں کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں، وہ فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔

- 2 K.K Aziz : ***The Indian Khilafate Movement 1915-1933.*** A Documentery Record (Karachi-1972) PP-51-55

-II Sharif uddin Pirzada : ***The Evolution of Pakistan.*** (Karachi-1963) P-142

-III عبدالسلام خورشید/روشن آراء راؤ : تاریخ تحریک پاکستان۔ حصہ اول۔ (اسلام آباد-1993ء) ص.170

IV - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.85

-3 Choudhry Khaliquzzaman : ***Path way to Pakistan.*** (Lahore-1993) P-42

II - میم کمال اوکے : تحریک خلافت۔ (کراچی-1991ء) ص.80

- 4 Shan Mohammad : ***The Indian Muslims.*** Vol-6 PP-4-5

-5 I.H. Qureshi : ***Ulama in Politics.*** (Karachi-1972) P-69

- 6 Mushirul Hasan : (Ed) ***Mohammad Ali in Indian Politics-1917-1919*** (Karachi-1985) PP-221-31

-II Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-138-41

- 7 Ibid., ... PP-241-44

-II پرتھوی راج لاجپت رائے وساہن : **مولانا محمد علی۔** (لاہور-1962ء) ص.120

- 8 Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-247-50

- II خواجہ سید عزیز حسن نقشبندی : **حالات علی برادران۔** (دہلی-1942ء) ص ص.72-75

- 9 چودھری خلیق الزماں : **شاہراہ پاکستان۔** (کراچی-1967ء) ص.340

-II مرزا ابوالحسن لکھنوی : **مسٹر محمد علی۔** (نظر ہند چھندواڑہ) سوانح عمری اور خدمات۔ (کلکتہ-1952ء) ص.80

-III خواجہ احمد عباس : **مختصر سوانحِ حیات شہید ملت رئیس الاحرار مولانا محمدعلی مرحوم۔** (دہلی-1936) ص.64

-10 میم کمال او کے : **بحوالہ سابقہ۔** ص ص.80-81

نوٹ:۔

مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ جو 1918ء میں شائع ہوئی۔ وہ یوپی کے ایک ائی۔ سی۔ ایس آفیسر سر ولیم میرس کی تیار کردہ تھی۔ یہ رپورٹ انگریزی زبان کا شاہکار تھی۔ جسکے صلے میں سر ولیم میرس صوبہ یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر بن گئے تھے۔

11 - سید حسن ریاض : **بحوالہ سابقہ۔** ص.78

-II Subhas Chander Bose : ***The Indian Striggle.*** (London-1959) PP-103-105

12 - غلام حسین ذوالفقار : **جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام اور مظالم پنجاب۔** (لاہور-1996ء) ص.29

نوٹ:۔

ترمیم کے حق میں ووٹ دینے والے ہندوستانی ارکان کے نام

.1	سر گنگادھر چتنولیس	.2	بابو سریندر ناتھ بیزجی
.3	راجہ آف محمود آباد (علی محمد)	.4	ڈاکٹر تیج بہادر سپرو
.5	پنڈت مدن موہن مالویہ	-6	سری نواس شاستری
-7	ٹی۔ این۔ شرما	-8	میر اسد علی خان بہادر
-9	وی۔ جے۔ پٹیل	-10	محمد علی جناح
-11	سر فضل بھائی کریم بھائی	-12	رائے سیتاناتھ رائے بہادر
-13	راجہ سر رام پال سنگھ	-14	رائے کرشنا سائے بہادر
-15	راجہ آف رانیکا	-16	مظہر الحق
-17	میاں محمد شفیع خان بہادر	-18	خان ذوالفقار علی خان بہادر

19- جی۔ایس۔کھاپردے 20- رائے۔بی۔ڈی۔شکل بہادر

21- کے۔کے چندا 22- ماڈنگ باہتو

13 - محمد مرزا دہلوی : مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی ۔ (دہلی-1940ء) ص.82

II - غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی ۔ (لاہور-1996ء) ص.48

III- Ram Gopal : ***Indian Muslims-1857-1947.*** (London-1959) PP-159-61

رولٹ ایکٹ کی جابرانہ دفعات :۔

1- حکام کو اختیار دے دیا گیا کہ جس شخص سے چاہیں، ضمانت و مچلکہ یا صرف ضمانت طلب کریں۔

2- جس شخص کو بھی چاہیں حکم دیکر نظر بند کر دیں۔

3- بعض معمولی معاملات میں بھی حکام حکم امتناعی جاری کرنے کے مجاز قرار دیئے۔ مثلاً اخبار نویسی، پرچے تقسیم کرنا، جلوس یا جلسوں میں شریک ہونا۔

4- حکام کسی بھی شخص کو حکم دے سکتے تھے کہ وہ اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس میں اوقات معینہ پر درج کرائے۔

5- حکام جسکو چاہیں عدالت کی سزا کے بغیر قید میں رکھیں۔

6- حکام جسے چاہیں بلا وارانٹ اور بغیر جرم بتائے گرفتار کریں۔

7- بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کا ملک کے اندر داخلہ ممنوع قرار دے دیں۔

8- اگر کسی کے قبضے میں کوئی ضبط شدہ کتاب یا مضمون پایا جائے۔ خواہ وہ اسے نشر کرنے یا چھپنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو، سزوار ہوگا۔

14 - غلام حسن ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص.49

II- مہاتما گاندھی : تلاشِ حق۔ (لاہور-1993ء) ص ص.10-607

15 - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.86

16- Gail Minault : ***The Khilafate Movement.*** (Bombay-1982) P-68

II- Mushirul Hasan : ***Muslims and Congress*** select correspondence of Dr. M.A.Ansari,1919-1935 (Delhi-1979) PP-71.79

III- Ram Gopal : ***Indian Muslims.*** (London-1959) PP-170-72

17 - چوہدری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.337

18- ایضاً ص.338

19 - غلام حسین ذوالفقار : جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور مظالم پنجاب۔ (لاہور-1996ء) ص ص. 140-42

II- Choudhry Khaliquzzaman : *Op. cit.,* PP.45-46

20 - میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص. 85

Syed Sharifudden Pirzada : ***Foundations of Pakistan : All India Muslim***

League Documents 1906-1947. (Karachi-1970) PP-33-44

III - طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.361-360

21 - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.205

22 - Indulal Yajnik : *Gandhi as I Know Him.* (Delhi-1943) P-60

II - غلام حسن ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص .101

23 - غلام حسن ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص.53

II - قاضی محمد عدیل عباسی : تحریک خلافت۔ (لاہور-1986ء) ص ص.96-95

داعیان کانفرنس:۔

1-	آنریبل نواب ذالفقار علی خان (لاہور)	.2	آغا محمد صفدر (سیالکوٹ)
3-	مولوی غلام محی الدین (قصور)	4-	مولانا ابوالوفا محمد ثناء اللہ (امرتسر)
5-	آنریبل نواب سرفراز حسین خان (پٹنہ)	6-	آنریبل خواجہ محمد نور (گیا)
7-	آنریبل سید نورالحسن (بانکی پور)	8-	سرفضل بھائی کریم بھائی (بمبئی)
9-	حاجی جان محمد چھوٹانی (بمبئی)	.10	سیٹھ عبداللہ ہارون (کراچی)
11-	سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر (پونا)	12-	سراسد علی خان (مدراس)
13-	محمد عبدالقدوس (مدراس)	14-	مولوی فضل الحق (کلکتہ)
15-	مولوی ابوالقاسم (بردوان)	16-	مولوی مجیب الرحمٰن (کلکتہ)
17-	ڈاکٹر مختار احمد انصاری (دہلی)	.18	سید رضا علی (الہ اباد)
19-	مولوی محمد فائق (فیض آباد)	20-	مولوی محمد یعقوب (مرادآباد)
21-	سید آل نبی (آگرہ)	22-	تصدق احمد شیروانی بیرسٹر (علی گڑھ)
23-	شیخ عبداللہ وکیل (علی گڑھ)	24-	حافظ محمد علی حلیم (کانپور)
25-	حافظ ہدایت حسین (کانپور)	.26	مولوی فضل الرحمٰن وکیل (کانپور)
27-	شیخ شاہد حسین۔ تعلقدار گدیہ (بارہ بنکی)	28-	منشی نواب علی وکیل (بارہ بنکی)
29-	مولوی سید نبی اللہ بیرسٹر (لکھنو)	30-	منشی محمد نسیم ایڈووکیٹ (لکھنو)
31-	منشی احتشام علی کاکوری (لکھنو)	32-	چودھری نعمت اللہ وکیل (لکھنو)
33-	ڈاکٹر محمد نعیم انصاری (لکھنو)	34-	شیخ محمد علی حیدر خان (لکھنو)
35-	سید ظہور احمد وکیل (لکھنو) (آنریری سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ)		

24 - میم کمال او۔ کے : بحوالہ سابقہ۔ ص.87

25 - محمد امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.145

26 - M.A Gandhi : *Story of my Experiences with Truth.* (Ahmad Abad-1976) PP.540-41

Mushirul Hasan : ***Nationalism and Communal Politics in India.*** - II
(Delhi-1979) PP-35-41

S.Ghosh : ***Political Ideas and Movement in India.*** (Bombay-1975) -III
PP-27-30

27 - مرزا محمد رحیم دہلوی : جواہر لال نہرو کی کہانی۔ (دہلی-س ن) ص.39

II - طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص.526

28 - سید نور احمد : مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ (لاہور-1966ء) ص.25

29 - شیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی : خطبہ جمعتہ المبارک۔ (ذی قعدہ 1418ھ) بمقام مسجد نبویؐ سعودی عربیہ

30 - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.87

II- مہاتما گاندھی : تلاشِ حق۔ (لاہور-1993ء) ص ص.38-635

Choudhry Khaliquzzaman : *Op. cit.,* P-50 -III

31 - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.77-76

II- محمد طفیل : نقوش۔ آپ بیتی نمبر۔ جلد اول۔ (لاہور-1964ء) ص ص.69-368
(مسٹر گاندھی کی آپ بیتی۔ ترجمہ : ڈاکٹر سید عابد حسین۔ تلخیص : خورشید مصطفٰی رضوی)

32- حفیظ الرحمٰن واصف : جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ۔ (دہلی-1969ء) ص ص.27-25

II- : مقالات یوم جوہر۔ (لکھنو-1983ء) ص ص.19-11

33 - محمد میاں : جمعیت العلماء کیا ہے۔ (دہلی-1946ء) ص ص.52-49

II- پروین روزینہ (مرتبہ) : جمعیت العلماء ہند : دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے 1919ء-1945ء
جلد اول۔ (اسلام آباد-1980ء) ص ص.33-30

34- سید اسعد گیلانی : برصغیر میں بیداری ملت کی تحریکیں۔ (لاہور-س ن) ص ص.95-92

II- عبیداللہ قدوسی : آزادی کی تحریکیں۔ (لاہور-1988ء) ص.132

35 - عبدالماجد دریابادی : محمد علی :ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ جلد اول۔ (اعظم گڑھ-1952ء)
ص ص.116-115

II- سید محمود احمد آزاد : حیات جوہر۔ (روالپنڈی-1979ء) ص.42-41

III- عبدالمجید سالک : یارانِ کہن۔ (لاہور-1955ء) ص.10

36 - غلام رسول مہر : مطالب بانگ درا۔ (لاہور-1976ء) ص.303

II- علامہ محمد اقبال : کلیاتِ اقبال۔ اردو۔ (لاہور-1975) ص.253
(بانگ درا۔ نظم "اسیری")

III- ابو سلمان شاہجہانپوری : علامہ اقبال اور مولانا محمد علی۔ (کراچی-1984ء) ص.44

37 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص.261

-II Shan Mohammad : *Op. cit.,* Vol.VII Section 10 PP-69-80

-38 Shan Mohammad : *Op cit.,* Vol.VIII Section 11 PP-52-57

-39 سید اسعد گیلانی : **بحوالہ سابقہ۔** ص.93

-II سید حسن ریاض : **بحوالہ سابقہ۔** ص.88

40 - رئیس احمد جعفری : **علی برادران۔** (لاہور-1963ء) ص.634

-II . . . . : **سیرت محمدعلی۔** (دہلی-1932ء) ص ص.79-278

-III I.H. Qurashi : ***The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent.*** (Hage-1962) P-266

-IV میم کمال او کے : **بحوالہ سابقہ۔** ص.99

-V : **سول اینڈ ملٹری گزٹ ۔** 25جون-1920

وفد خلافت کے خاص ممبران کے نام درج ذیل تھے :۔

1. مسٹر گاندھی
2. سیٹھ چھوٹانی
3. مولانا ثناء اللہ امرتسری
4. ابو الکلام آزاد
5. مولانا ایم اے (محمد علی) امیر جماعت احمدیہ لاہور
6. ممتاز حسین بیرسٹر لکھنو
7. مولانا کفایت اللہ
8. مولانا حسرت موہانی
9. مسٹر سید حسین ایڈیٹر انڈی پینڈنٹ
10. مولانا شوکت علی
11. مولانا عبدالباری فرنگی محل
12. حکیم اجمل خان
13. ڈاکٹر سیف الدین کچلو
14. ڈاکٹر مختار احمد انصاری
15. مولانا عبدالماجد دریابادی
16. سید ظہور احمد سیکریڑی آل انڈیا مسلم لیگ
17. مولانا فاخر الہ آبادی
18. مولانا سید سلیمان ندوی
19. آغا محمد صفدر قزلباش
20. راجہ صاحب محمود آباد
21. راجہ صاحب جہانگیر آباد۔

مسٹر محمد علی جناح اور پنڈت موتی لال نہرو وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے تھے۔ انہوں نے بذریعہ تار اپنے کامل اتفاق کا اظہار کر دیا تھا۔ بعد ازاں مسٹر جناح اور مسٹر نہرو نے تحریکِ خلافت اور اسکے طریقہ کار سے اختلاف کیا۔ غالب گمان یہی ہے کہ اسی وجہ سے انہوں نے وفد میں شرکت نہ کی۔

- 40 K.K Aziz : ***The Indian Khilafate Movement.*** (Karachi-1972) PP-92-95

-II عبیداللہ قدوسی : **بحوالہ سابقہ۔** ص.150

-III Allah Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1984) P-11-14

وفد خلافت کے ارکان اور ذمہ داریاں:۔

1. محمد علی جوہر :۔ رئیس وفد

2. حسن محمد حیات (لارڈ حیات، علی گڑھ کے کھلنڈرے) :۔ سیکریٹری۔ علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے، پنجاب کے رہنے والے اور محمد علی کے قریبی ساتھی۔ ان دنوں بھوپال میں ملازمت کرتے تھے۔

3. سید حسین :۔ یہ 1913ء میں بھی محمد علی کے ساتھ سانحہ کانپور کے سلسلے میں انگلستان گئے تھے۔ اس زمانے میں وہ "انڈی پینڈنٹ" احمد آباد کے ایڈیٹر تھے۔

4. مولانا سید سلیمان ندوی :۔ حسب موقع و محل مسئلہ خلافت کی مذہبی حیثیت کی وضاحت کیلئے گئے تھے۔ کیونکہ انہیں عربی زبان پر عبور تھا۔

5. ابوالقاسم :۔ بردوان کے رہنے والے بنگال کے سیاسی رہنما، وفد کے ساتھ روانہ نہ ہو سکے تھے۔ بعد میں جا کر وفد سے مل گئے تھے۔

Shan Mohammad : ***Op. cit.***, Vol.6 PP-164-177 - 41

M.N. Qurashi : ***Khilafate Delegation to Europe.*** feb-October-1920 (Karachi-1980) PP.71-75 -II

M.N. Qurashi : ***The Khilafate Movement in India*** 1919-1924. (London-1973) PP-50-51 -III
(مقالہ پی۔ایچ۔ڈی۔ لندن یونیورسٹی۔1973ء)

M.N. Qurashi : ***Khilafate Delegation to Europe.*** feb-October-1920 (Karachi-1980) P-49 - 42

K.K Aziz : ***The Indian Khilafate Movement.*** (Karachi-1972) P-116 -II

Reading : ***Rufus Isaacs, First Marquers of Reading.***(London-1945) Vol-2 P-226 -III

Daily : ***Times.*** 9,March-1922 -IV

V- روزنامہ : جنگ۔ لندن۔ 17 اکتوبر 1977ء (شفیق بریلوی : مولانا محمد علی جدوجہد آزادی کے نامور مجاہد) ص.3

Shan Mohammad : ***Op. cit.***, vol-6 PP.185-202 - 43

II - سید دربار علی شاہ : ہجرتِ افغانستان۔ (لاہور-1977ء) ص ص.12-11

III- سید سلیمان ندوی : بریدِ فرنگ۔ (کراچی-1956ء) ص ص.49-48

44- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص.105

II- سہ ماہی : الزبیر۔ بھاولپور اپریل 1991ء ص ص.16-111

45 - سید صباح الدین عبدالرحمٰن : مولانا محمد علی کی یادمیں۔ (اعظم گڑھ-1982ء) ص ص.85-80

II- روزنامہ : جنگ۔ کراچی۔ 18 دسمبر 1978ء (محمد صدیق۔ مولانا محمد علی جوہر)

46 - اسٹینلے لین پول : سلاطین ترکیہ تا خاتمہ خلافت عثمانیہ۔ (مترجم: نصیب اختر)

(کراچی-1975ء) ص ص.94-491

47 - سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحواله سابقه۔ ص.86

48 - محمد امین زبیری : بحواله سابقه۔ ص.171

II- Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979)PP-90-91

49 - Ibid.,..PP-208-09

50 - B.M. Tanik : ***Non-Co-Operation Movemant in Indian Politics.*** 1919-1924
A Historical Study. (Delhi-1978) PP-24-40

II- Khalid Bin Saeed : ***Pakistan : The Formative Phase.*** (Karachi-1960) P-49

III- Abdul Hamid : ***Muslim Seperation in India.*** (A brief sarvey)
(O.U.P-1967) P-147

IV- M.N. Qurashi : ***Khilafate Delegation to Europe.*** (Karachi-1980) P-60

V- ایچ۔بی۔خان : برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار۔(اسلام آباد-1985ء)
ص ص.63-162

51 - اسٹینلے لین پول : بحواله سابقه۔ ص ص.01-500

II- Lord Everaley : ***The Turkish Empire.*** (Lahore-1952) P-219

III- K.K Aziz : ***The Indian Khilafate Movement.*** (Karachi-1972) PP-149-65

IV- عبدالسلام خورشید/روشن آراء راؤ : تاریخ تحریک پاکستان۔ حصہ اول۔ (اسلام آباد-1993ء)
ص.171

معاہدہ سیورے کی شرائط:۔

1. سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کی سرپرستی میں حکومت کرے گا۔
2. استنبول اور آبنائے کے مشرقی و مغربی سواحل اور تمام بندرگاہیں اتحادیوں کے قبضے میں رہیں گی۔
3. ایک ایسا آرمینیا وجود میں لایا جائے گا جس میں مشرقی اناطولیہ، ارض روم، وان، بطلس، طرابزون اور ارزنجان شامل ہونگے۔

اس ریاست کی حدود امریکہ کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔

4. ترکی کو عرب ممالک سے دستبردار ہونا پڑے گا۔
5. شام کی حکمبرداری فرانس کو، عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی۔
6. عدلیہ اٹلی کو، سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو دیا جائے گا۔

52 - رئیس احمد جعفری : اوراق گم گشته ۔ (لاہور-1968ء) ص ص.56-55

II- ابو سلمان شاہجہانپوری : تحریکات ملی۔ (مجلہ علم و آگہی) (کراچی-1978ء) ص.293

III- رئیس احمد جعفری : خطبات محمد علی ۔ (کراچی-1950ء) ص ص.84-57

53- رئیس احمد جعفری : اوراق گم گشتہ۔ (لاہور-1968ء) ص.59
II- مولوی عبدالحق : چند ہم عصر۔ (کراچی-1970ء) ص ص.152-56
III- مجلہ : نوائے آزادی۔ بمبئی نمبر 8 جامعہ نگر دہلی-1958ء ص ص.173-78

54 - Indulal Yajnik : *Op. cit.,* P-124

II- Tara Chand : ***History of the Freedom Movement.***(Lahore-1972) PP-493-96

55 - غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص ص.64-65
56 - مہاتما گاندھی : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.597-99

57 - Manabendra Nath Roy : ***One year of Non-Cooperation.*** (Delhi-1923) PP-60-61

58 - چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.369-70
59 - ایم۔اے۔گاندھی : تلاشِ حق۔ جلد دوم۔ (مترجم : سید عابد حسین) (جامعہ ملیہ دہلی-1938) ص ص332-33
60- جواہر لعل نہرو : میری کہانی۔ جلد اول۔ (لاہور-1996ء) ص.82

II- Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment .*** (Lahore-1942) P-37

III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.28-29
61 - غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص ص.71-74

II - Tara Chand : ***History of the Freedom Movement.*** (Lahore-1972) P-497

62 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.576
II- رئیس احمد جعفری : خطبات محمد علی۔ (کراچی-1950ء) ص ص.88-96
63 - سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.115
II- رضی احمد : مطالعہ تاریخِ پاکستان۔ (کراچی-1985ء) ص.79
64 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.318
65 - مولانا محمد علی : خطبہ صدارت۔ دہلی واجمیر میواڑ دوسری پولیٹکل کانفرنس۔ ص.6
II- رئیس احمد جعفری : خطبات محمد علی۔ (کراچی-1950ء) ص ص.145-65
66 - رئیس احمد جعفری : تقاریر مولانا محمد علی۔ حصہ دوم۔ (لاہور-1954ء) ص ص.14-17
67 - عشرت رحمانی : پاکستان سے پاکستان تک۔ (لاہور-1985ء) ص.149

- II Allah Bakhsh Yusufi : *Op. cit.,* PP-95-100

- III Dr. Mohammad Arif : ***Journey to Freedom.*** (Lahore-1985) P.95

- IV Choudhry Khaliqazzaman : *Op. cit.,* PP.55-56

68 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.314

- II ماہنامہ : نگار پاکستان۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر۔ حصہ دوم۔ مئی-1979ء
ص ص.9-12

- 69 Abdul Hamid : ***Muslim Sepertion in India.*** (O.U.P-1967) PP-154-55

- 70 Syed Sharifuddin Pirzada : ***The Evolution of Pakistan.*** (Karachi-1963) PP50-51

- II S.Moinual Haq : (Ed) ***A History of the Freedom movement in india.*** Vol.3 (Karachi-1979) PP-266-67

- III A.C. Niemeijer : ***The Khilafate Movement in India 1919-1924.*** (London-1972) PP-92-97

- 71 ولی مظہر : ہماری تحریکیں۔ (ملتان-1991ء) ص.610

- 72 نورالرحمٰن : انتخاب مضامین جوہر۔ (علی گڑھ-23-1922ء) ص ص.87-77

-II Percived Spear : ***India : A Modren History.*** (Ann Harbor-1961) P-363

- 73 محمد جلال الدین قادری : ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست۔ (لاہور-1980ء) ص.35

- 74 Percival Spear : ***India : A Modren History.*** (Ann Harbor-1961) PP-369-70

-75 Ibid.,..PP-371-73

- 76 شاہ عبدالعزیز دہلوی : فتاوٰی عزیزی۔ جلد اول۔ متعلق دارالحرب 1239ھ (بحوالہ اوراق گم گشتہ۔ ص .192)

- 77 احمد رضا خان بریلوی : اعلام الا علام بان ہندوستان دارالا اسلام۔ (بریلی-1306ھ)
ص ص.7-2

- II محمد اشرف علی تھانوی : تحذیر الاخوان عن الربوافی الھندوستان۔ (تھانہ بھون-س ن) ص.8

-III چوہدری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.377

- 78 محمد عدیل عباسی : تحریکِ خلافت۔ (لاہور-1986ء) ص.132

- 79 غلام رسول مہر : تبرکات آزاد۔ (لاہور-1975ء) ص.203

-II محمد جلال الدین قادری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.38-37

-III غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص.63

-IV Percival Spear : ***India : A Modren History.*** (Ann Harbor-1961) P-376

- 80 اللہ بخش یوسفی : سرحد اور جد و جہد آزادی۔ (لاہور-1968ء) ص.213

- II ظفر حسن ایبک : آپ بیتی۔ (حصہ اول) (لاہور-س ن) ص.209

-III رئیس احمد جعفری : اوراق گم گشتہ۔ (لاہور-1968ء) ص.782

- IV روزنامہ : پیسہ۔ لاہور۔ (28اپریل-1920ء)

-V روزنامہ : خلافت۔ دہلی۔ یکم مئی1920ء
81 - قاضی محمد عدیل عباسی : بحواله سابقه۔ ص.137
82- محمد جلال الدین قادری :بحواله سابقه۔ ص.39
II- غلام حسین ذوالفقار : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء) ص.63
-III Percived Spear : ***India : A Modren History.*** (Ann Harbor-1961) P-365
83 - اللہ بخش یوسفی : بحواله سابقه۔ ص.613
II- ولی مظہر : ہماری تحریکیں۔ (ملتان-1991ء) ص.619
III- ایچ۔بی۔خان : بحواله سابقه۔ ص ص.164-65
84 - اللہ بخش یوسفی : بحواله سابقه۔ ص.235
II- رئیس احمد جعفری : کاروانِ گم گشته۔ (کراچی-1971ء) ص.532
85 - قاضی عبدالغفار : حیات اجمل۔ (علی گڑھ-1950ء) ص.222
-86 Choudhry Khaliquzzaman : ***Op. cit.,*** P.57
87 - جانباز مرزا : حیات امیر شریعت۔ (لاہور-1976ء) ص ص.53-54
88 - روزنامہ : پیسه۔ لاہور۔ 12اگست1920ء ص.3
89- روزنامہ : زمیندار۔ لاہور۔ 21اگست1920ء ص.4
90- روزنامہ : اہل حدیث۔ امرتسر۔ 13اگست1920ء ص.14
II- ابو سلمان شاہجہانپوری : تحریك نظم جماعت۔ (کراچی-1986ء) ص.236
91- دربار علی شاہ : ہجرتِ افغانستان۔ (کراچی-1977ء) ص.13
92- راجا رشید محمود : تحریك ہجرت 1920ء۔ (لاہور-1986ء) ص.380-81
93- ایضاً . . . .
94- رشبرک ولیمس : مرقع ہند بابت 1920ء (مترجم عبدالماجد دریابادی) (لکھنو-1922ء) ص.60
95- راجا رشید محمود : بحواله سابقه۔ ص.387
96- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص ص.202-03
97- ایضاً ص.204
-II ***Collection of Malik Lal Khan :*** File-No.5 National Archives of IslamAbad. (MLK.F.5)
III- سید سلیمان ندوی : برید فرنگ۔ (کراچی-1956ء) ص ص.72-73
-98 Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali*** (Lahore-1979) P-256
- II S.M. Ikram : ***Modern Muslim India and The Birth of Pakistan.*** (Lahore-1977) P-160

III- راج موہن داس : مسلم افکار۔ (لاہور-1996ء) ص.167

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali*** (Lahore-1979) PP.264-71 -99

II- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.134-35

III- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص ص.-323-30

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-276 -100

Y.B. Mathur : ***Growth of Muslims Politics in India.*** (Lahore-1980) -II
PP-203-15

101- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.141-42

II- راج موہن داس : مسلم افکار۔ (لاہور-1996ء) ص.170

M.N. Qurashi : ***Some reflection on Moppilla Rebellion of 1921-1922*** -102
(essay) PP-1-10

نوٹ:۔ شائع کردہ : جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اپریل-1981ء)

II- راج موہن داس : بحوالہ سابقہ۔ ص.168

Indulal Yajnik : *Op. cit.,* P-227 -III

IV- ایچ۔بی۔خان : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.178-79

V - روزنامہ : علی گڑھ گزٹ۔ 29اگست-1921ء

VI- روزنامہ : مسلم ۔ 18نومبر-1921ء

J.M. Brown : ***Gandi's Role to Power Indian Politics.*** 1915-1922 -103
(Cambridge-1972) PP-175-77

Indulal Yajnik : *Op. cit.,* P-237 -II

Tara Chand : ***History of The Freedom Movement.*** (Lahore-1972) -III
PP-475-93

A.C. Niemeijer : ***The Khilafate Movement in India.*** (London-1972) -104
PP-103-05

II- محمد صادق قصوری : تحریک پاکستان اور علماء اکرام۔ (لاہور-1999ء) ص.57

Rafique Akhtar : ***(Ed) Historic Trial Moulana Mohammad Ali and*** -III
Others. (Karachi-1971) PP.53-78

K.K. Aziz : ***The Indian Khilafate Movement.*** (Karachi-1972) PP.183-84 -IV

V - عبدالرشید ارشد : مقدمہ کراچی وقول فیصل۔ مقدمات وبیانات اکابر (لاہور-1975ء)
ص ص.70-75

VI - میرزا عبدالقادر بیگ : مقدمہ کراچی۔ (لکھنؤ-1985ء) ص ص.52-46

105- عبیداللہ قدوسی : بحوالہ سابقہ۔ ص.176

II- مفتی انتظام اللہ شہابی : مشاہیر جنگ آزادی۔ (کراچی-1957) ص.285

106- حمیدہ ریاض : محمد علی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص ص.93-189

II- محمد سرور : مسلمان و غیر مسلم حکومت۔ (لاہور-1947ء) ص ص.19-114

III- Lanka Sundaram : *The last Political Testment of the late Moulana Mohammad Ali.* (Delhi-1944) PP-175-90

IV- منشی مشتاق احمد : بیان مولانا محمدعلی۔ (میرٹھ-س ن) ص.23

107- محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.187

II- خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.53-45

III- نشتر عوامی : حیات جوہر۔ (علی گڑھ-1931ء) ص.52

108- جواہر لعل نہرو : بحوالہ سابقہ۔ ص.142

II- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.400

III- Judith.M.Brown : *Gandhi, Rise to Power.* (C.U.P-1974) PP-67-69

109- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.135

II- مولانا اسد القادری : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1986ء) ص.96

110- محمد مرزا دہلوی : مسلمانان ہند کی حیات سیاسی۔ (دہلی-1940ء) ص.92

111- نسیم الظفر : شب چراغ: پاکستان کا پس منظر و پیش منظر۔ (لاہور-1954ء) ص.36

II- راجا رشید محمود : بحوالہ سابقہ۔ ص.402

112- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.356

113- Mohammad Mubjeeb : *The Indian Muslims.* (London-1967) P-538

114- R.B. Mowat : *A History of the European Diplomancy.* (London-1922) PP-298-308

معاہدہ صلح لوزان 1923ء:-

لوزاں میں کئی ماہ صلح کانفرنس جاری رہی۔ آخر 24 جولائی 1923ء کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔ عصمت پاشا نے جو قوم پرور حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ انہوں نے صلح کانفرنس میں ترکی کے مقاصد کی بڑی قوت و قابلیت کے ساتھ حفاظت کی۔ اس معاہدے کی شرائط درج ذیل تھیں۔

1. میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق اور اردن) اور فلسطین ترکی سے لے لئے جائیں گے۔ (بعد میں یہ علاقے برطانیہ کے

زیر تسلط دے دیئے گئے۔)

2. شام کو ترکی سے آزاد قرار دے کر فرانس کو دے دیا گیا۔
3. عرب کیلئے طے پایا کہ وہ خود مختار رہے گا۔
4. یورپ میں ترکی کے جتنے مقبوضات تھے سوائے مشرقی تھریس کے، سب اس سے لے لئے جائیں گے۔
5. جزائر ڈاڈی کنیز، روڈز اور کیسٹیلو ریزو اٹلی کو دے دیئے جائیں گے۔
6. بحیرہ ایجین کے دیگر جزائر یونان کو دینے کا وعدہ کیا گیا۔
7. لیبیا، مصر اور سوڈان کی سیادت سے ترکی، دستبردار ہو گا۔
8. قبرص برطانیہ کو ملے گا۔
9. ترکی میں اقلیتوں کا تحفظ کیا جائے گا۔
10. ترکی میں غیر ملکی عدالتیں توڑ دی جائیں گی۔
11. ترکی سے کوئی تاوان جنگ نہیں لیا جائے گا۔
12. ترکی کی بری یا بحری فوج پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔
13. درۂ دانیال، بحیرہ مارمورہ اور باسفورس تمام اقوام کیلئے کھلے رہیں گے۔ انکا انتظام جمعیت اقوام کے اسٹریٹس کمیشن کے سپرد ہو گا۔
14. آبنایوں کے ساحل غیر مسلح کئے جائیں گے۔ لیکن ان پر اقتدار ترکی کا ہو گا۔
15. یونان اور ترکی کے درمیان تبادلہ آبادی ہو گا۔ آرتھوڈوکس مذہب کے یونانیوں کا لازمی طور پر ترکی قوم کے ان لوگوں سے تبادلہ ہو گا جو مسلمان ہیں اور یونانی علاقے میں رہتے ہیں۔

114- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.5-404

II- روزنامہ : علی گڑھ گزٹ۔ 13اکتوبر 1924ء

III- سہ ماہی : الزبیر۔ بھاولپور۔ تحریک آزادی نمبر۔ 1970ء ص ص.99-96

IV- Brigadier Gulzar Ahmad : ***Turkey Rebirth of a Nation.*** (Karachi-1961) PP-171-79

115- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.407-406

II- Jawahar Lal Nehru : ***An Autobiography.*** (Delhi-1962) PP.82-83

III- R.C.Majumdar : ***History of the Freedom Movement in India.*** (Lahore-1981) PP-122-25

III- Tara Chand : ***History of the Freedom Movement.***(Lahore-1972) PP-500-01

116- Moulana Abul Kalam Azad : ***India wins Freedom.*** (Bombay-1964) PP-64-66

II- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945) ص ص.18-517

Laj Pat Rai : ***Un- Happy India.*** (Calcutta-1928) PP-86-88 -III

Jawahar Lal Nehru : ***Op. cit.,*** PP-96-98 -117

Presidential Address of Moulana Mohammad Ali. Cocanada.26,Dec-1928 -II

III - شیخ محمد اکرام : موج کوثر - (لاہور-1984ء) ص.123

IV- محمد علی جوہر : ہندوستان کی سیاسی الجھنیں۔ (مترجم : شاہین فاروقی)

(حیدرآباد دکن-1947ء) ص ص.92-89

118 - قاضی عبدالغفار : حیات اجمل - (علی گڑھ-1950ء) ص.235

II - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی - (دہلی-1931ء) ص.53

III - عبدالماجد دریابادی : محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ جلد اول۔

(اعظم گڑھ-1952ء) ص.127

119- ایضاً . . . . ص ص.39-137

II - معین الدین عقیل : مسلمانوں کی جدو جہد آزادی۔ (لاہور-1981ء) ص.107

III- عبدالمجید سالک : یارانِ کہن۔ (لاہور-1955) ص.13

IV - شریف الدین پیرزادہ : پاکستان منزل بہ منزل - (کراچی-1965ء) ص ص.41-128

Sautimoy Roy : ***Role of Indian Muslims in the Freedom Movement.*** -V

(Lahore-1978) PP-122-23

120- اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاك و ہندکی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1967ء) ص ص.68-364

Allah Bakhsh Yusufi : ***Op. cit.,*** PP-205-09 -II

121- عبدلماجد دریابادی : بحوالہ سابقہ۔ ص.136

122- ایضاً ص.167

II- ضیاء الدین برنی : عظمت رفتہ۔ (کراچی-1961ء) ص.59-48

III- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.139

123- ابو رحمت عبدالرحمٰن : معرکہ سیاست و خلافت۔ (امرتسر-س ن) ص ص.97-294

Brigadier Gulzar Ahmad : ***Turkey Rebirth of a Nation.*** (Karachi-1961) -II

PP-88-102

III- روزنامہ : ہمدرد۔ یکم دسمبر-1926ء

Mohammad Sadiq : ***The Turkish Revolution and Freedom Movement.*** -IV

(Delhi-1983) P-120

Brigadier Gulzar Ahmad : ***Turkey Rebirth of a Nation.*** (Karachi-1961) -124

PP-180-197

II- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص.209

Syed Sharif-ud-Pirzada : ***Foundations of Pakistan.*** Vol-2 (Karachi-1970) -III
P-712

125- ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار سیاسی۔ (کراچی-1978ء) ص.195

K.K.Aziz : ***The Indian Kilafate Movement.*** (Karachi-1972) PP-289-91 -II

III- سید سلیمان ندوی : یاد رفتگاں۔ (کراچی-1983ء) ص ص.38-133

IV- سید دربار علی شاہ : ہجرتِ افغانستان۔ (کراچی-1977) ص.20

126- میم کمال اوکے : بحوالہ سابقہ۔ ص.204

Mohammad Mubjeeb : ***The Indian Muslims.*** (London-1967) P.538 -II

127- پروفیسر بایور : بیسویں صدی میں ترکی کی تاریخ اور عالمی سیاست پر چھوڑے ہوئے اثرات۔
(انقرہ-1974) ص.369

G. Gungor : ***Islam in Bugunku Meseldcri.*** (اسلام کے موجودہ مسائل) -128
(Istanbul-1966) P-155

Mohammad Sadiq : ***The Turish Revolution and The Freedom Movement.*** -129
(Delhi-1983) P-78

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-293-94 -II

P. Hardy : ***The Muslims of Birtish India.*** (Cambridge-1972) PP-179-80 -130

Y.H Bayur : ***Hindistan Tariki C.I.*** (Ankara-1946) P-127 -131

Mohammad Mujeeb : ***The Indian Muslims.*** (Londra-1967) P-235 -II

Niyazi Berkes :***Turkiye, d Cagdaslasma.*** (Istanbul-1978) (ترکی میں ماڈرن اسلام) -132
PP-466-505

Niyazi Berkes : ***Ataturk Ve Devrimle.*** (Istanbul-1982) (اتاترک اور اصلاحات) -II
P-190

Niyazi Berkes : ***Development of Secularism in Turkey.*** (McGill-1964) -III
PP-210-15

A.B. Rajput : ***Muslim League Yestarday & today.*** (Lahore-1948) P.53 -133

II- عبدالوحید خاں : تقسیم ہند۔ (لاہور-1969ء) ص ص.121-100

134- محمد مرزا دہلوی : مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی۔ (دہلی-1940ء) ص.98

135- ایضاً ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ص.102

136- مجلہ۔ علم وآگہی : تحریکات ملی۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کا مضمون تعلیم اور ترکِ موالات

ص.394

K.K. Aziz : ***The Making of Pakistan.*** (London-1967) PP-113-14 -137

138- سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.146

باب چہارم

ہندو مسلم تعلقات اور محمد علی کا کردار

1924ء - 1931ء

1924ء فرقہ وارانہ تحریکوں کیلئے شباب کا زمانہ تھا۔ ہندو مسلم فسادات کا ایک طویل اور خوفناک سلسلہ چل نکلا۔ جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی مزید بڑھ گئی۔ ہندو مسلم تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ 1923ء میں گیارہ، 1924ء میں اٹھارہ، 1925ء میں سولہ، 1926ء میں پینتیس اور نومبر 1927ء تک تقریباً 37 ہندو مسلم فسادات ہوئے۔[1] ہندو مسلم تعلقات کو خراب کرنے کی ابتداء ہندوؤں کی جانب سے ہوئی۔ جنہوں نے پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے اور شردھانند کی زیرِ قیادت شگھٹن اور شدھی تحریکیں شروع کیں۔ ان دونوں تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنا تھا۔ ان ہندو تنظیموں کے مقابلے میں مسلمانوں نے بھی ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور میر غلام بھیک نیرنگ کی زیرِ قیادت تنظیم اور تبلیغ کے نام سے دو جماعتیں قائم کرلیں۔ حالات اس حد تک تشویش ناک ہوچکے تھے کہ وزیرِ امورِ ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہا کہ :-

> "سب سے بڑی تشویش جس سے آج ہندوستان کو سابقہ ہے۔ وہ فرقہ وارانہ اختلاف ہے۔ اگر انگریز آج ہندوستان سے چلے جائیں۔ تو اسکا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔"[2]

سارے بگاڑ اور فساد کی وجہ یہ تھی کہ اب انکے سامنے کوئی واضح اور معین پروگرام نہیں تھا۔ جس پر عمل پیرا ہو کر وہ صحیح جانب قدم اٹھا سکتے۔ یہی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوئی۔ محمد علی کے لئے یہ دور بہت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا۔ وہ ترکی میں خلافت کے خاتمے کی وجہ سے شدید دکھ کا شکار تھے کہ خانگی مسائل نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ ان کی عمر کا یہ حصہ بہت سخت گذرا۔ 11 مارچ 1924ء کو محمد علی کی چھوٹی صاحبزادی آمنہ بعارضۂ دق انتقال کر گئیں۔ اس سال 12-13 نومبر کی درمیانی شب بی اماں، جو محمد علی کیلئے ڈھال تھیں، داغِ مفارقت دے گئیں۔ انکی صحت جو برسوں سے خراب چلی آرہی تھی۔ تیزی سے بگڑتی چلی گئی۔ اسپر طرہ یہ کہ معاشی پریشانیوں میں گھرے رہے۔ اگرچہ انہوں نے 31 اکتوبر 1924ء کو دہلی سے "کامریڈ" اور 8 نومبر 1924 کو "ہمدرد" کا دوبارہ اجراء کر دیا۔[3] لیکن سیاسی مصروفیات کی وجہ سے انہیں وقت نہ دے سکے۔ آمدنی کا ذریعہ صرف اخبار "ہمدرد" اور اسکا پریس تھا۔ جو عموماً خسارے میں چلتا رہا۔ پھر محمد علی جو خرچ پورا کرنے کیلئے کفایت شعاری کی حدود کے پابند نہ تھے، انہیں قرض یا احباب کی مدد پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن انہوں نے ان تمام حالات کا غیر معمولی استقامت اور نہایت ہمت کے ساتھ

مقابلہ کیا۔ اگر وہ چاہتے تو تبلیغ میں شامل ہو کر، کانگریس کی مخالفت کر کے اپنا سیاسی قد بڑھا سکتے تھے۔ لیکن محمد علی نے رائے عامہ اور عام میلان کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ قوم کیلئے جو علاج بہترین سمجھتے تھے اس کا تجربہ قوم پر کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ موتی لال نہرو نے چیمبر پریکٹس شروع کر دی۔ سی۔آر۔داس سوراج پارٹی کے تاجدار بن گئے۔[4] دوسری طرف علماء کا گروہ تنظیم و تبلیغ قائم کر کے پورے طور پر الگ ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نثار احمد کانپوری اور دوسرے اہم بزرگ و رہنما خلافت سے بیزار ہو کر "تنظیم" کے رکن بن چکے تھے۔[5] غرض مسلمانوں میں مختلف گروہوں یا ٹولیوں نے جنم لیا۔ جن میں نیشنلسٹ مسلمان، کانگریسی مسلمان، انجمن احرار، خدائی خدمت گار وغیرہ سرِ فہرست تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے ان جماعتوں پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے کہ :۔

> "یہ جماعتیں اور پارٹیاں اس قسم کی ہیں۔ جیسے جنگِ پلاسی میں مسلمانوں کی قوت ٹوٹنے کے بعد بہت سے سرداروں نے اپنے اپنے جتھے بنا لئے تھے۔ خود انکا کوئی مقصد اور مطمحِ نظر نہ تھا۔ جو روپیہ دیتا تھا اسی کی طرف سے جنگ لڑنے لگتے تھے۔"[6]

جمعیت العلمائے ہند نے مولانا عبدالباری فرنگی محل کے زیرِ اثر الگ سیاسی پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل کر لی۔ بحیثیتِ مجموعی اس پورے دور میں مسلم سیاست انتشار کا شکار رہی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے مسلم قوم کے الگ تشخص کو مٹانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں انہیں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل ہو جاتی تھی۔

محمد علی بھی اگر چاہتے تو مسٹر تانبے، سریندر ناتھ بنرجی، بپن چندر پال وغیرہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حکومت کے حلقہ میں اثر و رسوخ حاصل کر سکتے تھے۔ ہندوؤں کو معتوب کر کے مسلمانوں میں اپنا اقتدار بحال کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ملکی حالات کے بارے میں محمد علی اپنے تاثرات کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

> "---- حکومت کے گرگے اور وہ لوگ جنکی "لیڈریاں" اس عجیب و غریب ہنگامے میں ماند پڑ گئی تھیں نکلے، اور عوام کو انکے صحیح رہنماؤں سے جو قید و بند میں گرفتار تھے۔ بد ظن کرنا اور انہیں گمراہ کرنا شروع کیا۔ ایک طرف شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ دوسری طرف تبلیغ و تنظیم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور زیادہ تر وہ لوگ سربر آوردہ نظر آنے لگے جو آزمائش کے وقت گوشۂ عافیت سے کبھی باہر نہ نکلے تھے۔ اب یہی سب سے بڑے قائد تھے ----"[7]

محمد علی کو ان حالات کا شدید رنج تھا کہ جس فرقہ واریت اور مذہبی تعصب کو انہوں نے ٹھنڈا کیا تھا۔ اسے دوبارہ بھڑکا دیا ہے اور صرف زبانی کلامی وطن پرستی اور ملت شکنی کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ اس تشویش ناک اور مایوس کن صورتحال پر اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ :۔

> ؎ یہ حالت ہو گئی ہے، ایک ساقی کے نہ ہونے سے
> کہ خم کے خم بھرے ہیں، مئے سے اور میخانہ خالی ہے

ہوا تھا قید فصلِ گل میں جو مرغ اسکو گلشن میں
قفس سے چھٹتے ہی صیدِ غم، جورِ خزاں پایا

محمد علی نے وضاحت کی کہ مجھ پر تفرقہ پردازی، فرقہ وارانہ بغض و تمہد اور مذہبی دلی تعصبات کے الزامات عائد کرنے والے اپنے گریبانوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے لگائے ہوئے چمنِ اتحاد کو ہمارے قید و بند کے زمانے میں آخر کس نے ویران کیا۔ حالانکہ میں نے تو قید سے آزاد ہوتے ہی پھر اس تفرقہ پردازی تک کا خاتمہ کرانا چاہا۔ جسکی علت و العلل موتی لال نہرو اور ہمارے رفقائے کار میں بہت سے مسلمان تھے۔

کوہاٹ کا فساد وہ پہلا واقعہ ہے جس سے محمد علی اور گاندھی میں اختلافِ رائے پیدا ہوا۔ کیونکہ گاندھی فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دے رہے تھے۔ یہی وہ دن ہے جب سے ہندوؤں بالخصوص ہندو پریس نے محمد علی کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ اس کے باوجود محمد علی ہندوؤں اور مسلمانوں کو مفاہمت و مصالحت کی راہ پر گامزن کرنے میں کوشاں رہے۔ مختصر یوں کہ فساداتِ کوہاٹ 1924ء میں ہندوؤں کو گلہ تھا کہ مسلمانوں نے زیادتی کی ہے اور مسلمانوں کو شکایت تھی کہ ابتداء ہندوؤں کی طرف سے ہوئی ہے۔ حالانکہ فسادات کا اصل سبب وہ اشتعال انگیز نظم تھی جو ایک ہندو نے مسلمانوں کے خلاف لکھی۔ جس کی وجہ سے 9 اور 10 ستمبر 1924 کو شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار ہوتی رہی۔ کوہاٹ کے فسادات کی تحقیقات کے لیے کانگریس نے مولانا شوکت علی اور گاندھی پر مشتمل ایک وفد بھیجا۔ وفد نے راولپنڈی میں قیام کیا اور کوہاٹ کے ہندو اور مسلمانوں کو وہیں طلب کیا۔ آخر تحقیقاتی رپورٹ میں گاندھی نے جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا۔ جس سے مولانا شوکت علی اور گاندھی کے درمیان کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی احتجاجاً گاندھی نے 18 ستمبر 1924ء کو محمد علی ہی کے گھر پر دہلی میں 21 دن کا مرن برت رکھ لیا۔[8] محمد علی نے گاندھی کی جان بچانے کیلئے سب جماعتوں اور مذہبی نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس طلب کی۔ بقول راجندر پرشاد

"اس میں کانگریس کے علاوہ ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، پارسی، سب جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری کلکتہ کے لارڈ بشپ بھی کانفرنس میں آئے۔ کئی دنوں تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر میں جھگڑوں کے جو اسباب ہوا کرتے تھے مثلاً شدھی، گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب ہی باتوں پر تجویزیں منظور ہوئیں۔ گاندھی جی کو اس سے اطمینان ہوا تو انہوں نے اُپنا برت ختم کر لیا۔"[9]

مقامِ افسوس کہ چند مقامات پر ہندو مسلم تنازعات سے متاثر ہو کر گاندھی نے فساداتِ کوہاٹ کو جواز بنا کر مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے، بغیر محمد علی سے مشورہ کیے انکے مکان پر 21 دن کا برت رکھا لیا۔ مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم قرار دینا شروع کر دیا۔ تجزیاتی طور پر دیکھا جائے تو گاندھی نے یہ برت روحانی مقصد کے تحت نہیں بلکہ سیاسی مقصد کے حصول کیلئے رکھا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد انکی غیر مقبولیت اور محمد علی کی بے پناہ مقبولیت نے اس سیاسی مقصد کو جنم دیا۔ آخر یہ برت محمد علی کے سیاسی قتل کا مظہر بن گیا۔ گاندھی نے "ہندو مہا سبھا" اور "شدھی" اور سنگھٹن کی کھلی فرقہ پردازی کے خلاف سدِ راہ بننے کی بجائے انہیں نشوونما ارتقاء پانے اور قدم جمانے کا موقعہ دیا۔ یہی کام سوراج پارٹی کے قائد

موتی لال نہرو اور انکے ہم خیال دوسرے دائروں میں کر رہے تھے۔ لیکن محمد علی ہندو مسلم اتحاد کی ناکام کوششوں میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ مسٹر نہرو بھی ہندو مسلم تنازعات اور فرقہ وارانہ کشمکش کو ختم کرنے کے سلسلے میں محمد علی کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

"صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں بارہا کوششیں اسکی ہوئیں کہ گفت وشنید، بحث و مباحثہ کے ذریعے سے کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو۔ ان جلسوں کا نام اتحاد کانفرنس ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃالآرا کانفرنس وہ تھی۔ جو 1924ء میں مولانا محمد علی صدر کانگریس کی دعوت پر دہلی میں ہوئی تھی۔ اسوقت جبکہ گاندھی اپنا اکیس (21) دن کا مشہور برت رکھے ہوئے تھے۔"[10]

محمد علی کا کہنا تھا کہ اگر ہر لیڈر اپنی قوم کو بے قصور کہے گا تو اس سے اختلافات اور زیادہ بڑھیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر لیڈر اپنی قوم کی غلطیوں پر اسے سرزنش کرے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے اپنے اختلافات ختم کر کے آزادی کی منزل کی طرف قدم بڑھائیں۔ فسادات کوہاٹ کے بعد محمد علی نے پنجاب پراونشل خلافت کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے۔ بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے۔ اسلیئے کوہاٹ کے فسادات کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے۔ میں انہیں ملامت کرتا ہوں۔"[11]

یہ وہ دور تھا جب پنجاب میں ایک مضبوط گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا۔ جسکا کہنا تھا کہ میثاقِ لکھنو 1916ء سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمان قطعی نقصان میں رہے۔ کیونکہ پنجاب میں اکثریت کے باوجود انکو صرف پچاس فیصد نمائندگی ملی اور بنگال میں ترپین فیصد (53%) کی بجائے صرف چالیس فیصد (40%) نمائندگی ملی۔ مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیت میں رہے۔ جہاں تک مسلم اقلیتوں کا سوال ہے، وہ تو کمزور ہی رہیں۔ محمد علی بھی "پاسنگ" کے اصول سے قطعی غیر مطمئن تھے۔ انکا کہنا تھا کہ :۔

"مسلم لیگی لیڈروں نے اکثریت کی اہمیت کو نہیں دیکھا۔ بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو کھو کر دوسرے صوبوں میں اپنی اقلیتوں کی سطح کو بلند کر دیا۔ اور ہر صوبہ میں ہنود کی سطح کو "سطحِ مرتفع" اور مسلم سطح کو "سطحِ اسفل" بنا دیا۔"[12]

لہذا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور 1924ء کو محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ اسمیں چودھری خلیق الزماں کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی۔ کہ تمام صوبوں کو انکی تعداد کے اعتبار سے نمائندگی دی جائے۔ محمد علی نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی۔ سبجیکٹ کمیٹی کی تھوڑی بہت مخالفت کے بعد یہ تجویز پاس ہو گئی۔ مگر پھر راتوں رات الٹ پھیر کے بعد لکھنؤ پیکٹ کو زندہ رکھنے کی کوشش شروع ہو گئیں۔ دراصل پارٹی بازی چل رہی تھی۔ خلافتی اور غیر خلافتی تفریق حائل ہو چکی تھی۔ محمد علی نے اس تجویز کو منوانے کیلیئے دلائل و براہین اور قوت گفتار کا شاندار مظاہرہ کیا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ اس موقع پر میاں سر فضل حسین نے بھی اپنا تمام اثر محمد علی اور انکے گروپ کو ہرانے کیلیئے استعمال کیا۔ محمد علی گروپ کو 83 اور دوسرے

گروپ کو 126 ووٹ ملے یعنی وہ 43 ووٹوں سے ہار گئے۔[13]

جہاں محمد علی مسلم معاملات کو سلجھانے اور مسلمانوں کے حقوق کیلئے کوشاں تھے۔ وہاں محمد علی کی خواہش بلکہ کوشش یہ تھی کہ ہر کام میں ہندو اور مسلمان ملکر چلیں اور اپنا مقصدِ آزادی حاصل کریں۔ محمد علی اتحاد کی کوششوں میں مصروف تھے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد میں سرگرداں۔ لیکن یہ سب محض بیکار تھا۔ اسلیئے کہ آل پارٹیز یا اتحاد کانفرنسیں اس وقت کامیاب ہو سکتی تھیں۔ جب انکے لئے ملک میں فضا سازگار ہوتی اور دونوں فریق دل سے اتحاد کے خواہاں ہوتے۔ لیکن اس وقت صورتحال یہ تھی کہ ہندو کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ حالانکہ 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے ہندو مسلم سمجھوتہ کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے اس معاہدے کی تکمیل کے بعد کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ پنڈت مالویہ اور لالہ لاجپت رائے تو اس معاہدے کے شدید خلاف تھے۔[14] خصوصاً جداگانہ انتخاب اور کونسلوں کی مسلم نشستوں میں "پاسنگ" انکے لئے قابل اعتراض دفعات تھیں۔ وہ مسلمانوں کے فائدے کو کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ 1925ء میں موتی لال نہرو نے اسمبلی کے اندر صوبہ سرحد کو مساوی حقوق دینے سے اختلاف کیا۔[15] کانگریس کا ایک گروپ ترک موالات کی مخالفت کرتے ہوئے الگ ہو گیا تھا اور انہوں نے اسمبلیوں میں جانا منظور کر لیا تھا۔ گاندھی کی دی ہوئی پالیسی پر مزید چلنے کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔ اسلیئے کہ ہندو اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو معاشی و سیاسی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا اور خود بازی لے گئے۔ لیکن محمد علی نے اس سمت سوچنے کی کوشش نہ کی کے مسلمانوں کے نقصان و نفاق اور ہندوؤں کی کامیابی کے کیا عوامل ہیں؟ وہ تو ہر چیز اور ہر مسئلے کا حل ہندو مسلم اتحاد کو سمجھتے تھے۔ اپنے اس نظریئے ہی کی بنا پر انکا موتی لال نہرو سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ جسکی وجہ یوں بیان کرتے ہیں کہ :-

> "میرا انکا سارا اختلاف اس باعث ہے کہ اول تو انہوں نے مہاتما گاندھی کے قید و بند کے زمانے میں انکے خلاف بغاوت کی اور کانگریس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ دوسرا انہوں نے ایک اور باغی لالہ لاجپت رائے کی امداد حاصل کرنے کی امید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں نے مسلمانوں کی حق تلفی کو گوارا کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔"[16]

اتحاد کانفرنس دہلی

اس زمانے میں لکھنؤ میں بھی شدید فساد ہوا۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اتحاد کانفرنس دہلی منعقد کی گی۔ جس میں اعتدال پسند ہندو مسلمانوں کے متفقہ اور مسلمہ زعماء نے صلح و امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تمام باتوں کے باوجود یہ کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔[17] اس کانفرنس میں محمد علی نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ کوئی ایسا حل نکل آئے، جس سے فساد پسند عنصر راضی ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ محمد علی نے تو اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ :-

> "اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں

اٹھاؤنگا۔ میری ماں کو قتل کردے جب بھی میں عدالت میں مقدمہ نہیں لیجاؤنگا۔
لیکن اب اس بدترین صورتحال کا علاج ہونا چاہیئے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہم تلواریں
میان سے نہ نکال لیا کریں۔ ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور ہوتے جائیں گے۔
اور اغیار برابر ہمارا مضحکہ اڑائیں گے اور ہم پر زبانِ طعن دراز کریں گے۔" [18]

ہندوؤں پر تو اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن مسلمان مخالفین نے محمد علی کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں انکی اس تقریر کو اچھالنا شروع کردیا۔ اس تقریر کو اسلام دشمنی نہیں، محمد علی کی بے جا رواداری، جذباتیت اور انتہا پسندی کہنا چاہیئے۔ انتہا کسی چیز میں بھی اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن محمد علی ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں واقعی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود محمد علی نے کوششیں جاری رکھیں۔ گوشۂ عافیت اختیار نہیں کی، نہ خاموشی اختیار کی، نہ فساد پسند عناصر کو ابھارا۔ بلکہ مسلسل دورے کئے، تقاریر کیں، مضامین لکھے [19] مختلف رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، جلسے کئے اور گاندھی کا سکوت توڑنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

شملہ اتحاد کانفرنس میں محمد علی کوششیں

فسادات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ گاندھی تو بڑی ہوشیاری سے یہ کہکر کہ "اب میری بات کوئی نہیں سنتا"۔ اپنے آشرم میں معتکف ہو گئے [20] کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو یہ کہنے کو موقع ملے، کہ ہندو اپنے باپو کی بات نہیں مانتے۔ گاندھی انہیں منع بھی کیوں کرتے، ہندو سب کچھ تو اپنی قوم کے مفاد میں کررہے تھے۔ محمد علی، گاندھی کی اس سیاسی چال کو کبھی بھی نہ سمجھ سکے۔ وہ گاندھی کو مسلمانوں کیلئے مخلص ترین سمجھتے ہوئے تمام اختلافات و ترکِ عدم تعاون کا ذمہ دار نہرو اور انکے رفقاء کار کو گردانتے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گاندھی کے برعکس ان لوگوں نے دوہری پالیسی اختیار کرنے کی بجائے اپنا ظاہر و باطن واضح کردیا۔ محمد علی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ مسٹر جناح کی صدارت میں شملہ کے مقام پر ایک یونٹی کانفرنس منعقد کرائی۔ [21] لیکن یہ بھی مؤثر ثابت نہ ہوئی۔ محمد علی نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے جتنی کوششیں کیں، کسی اور لیڈر نے نہ کی ہونگیں۔ تجویزوں کا مسودہ تیار کرنے، معاملات کو سلجھانے اور لوگوں کو ایک نقطۂ نظر پر لانے میں محمد علی نے اپنی قابلیت اور محنت صرف کردی۔ کہ کسی طرح افتراق و انتشار کا خاتمہ ہو جائے۔ محمد علی شملہ میں ہندو مسلم اتحاد کی گرہ کشائی میں مصروف تھے اور دہلی میں انکا عزیز ترین بھتیجا شاہد علی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ محمد علی کی ملک و قوم کے ساتھ وابستگی اور خلوص کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ مختلف قوموں کو ایک مرکز پر لانے میں مصروف رہے اور بھتیجے کے جنازے میں شرکت تک نہ کرسکے۔ [22]

مسئلہ حجاز اور محمد علی

اس بحرانی دور میں ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ حجاز میں غیر معمولی سیاسی صورتحال پیدا ہوگئی۔ جنگِ عظیم اول

کے بعد حکومتِ برطانیہ کی سرپرستی میں وہاں شریف حسین کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ جو آل رسول ﷺ سے تھے۔ لیکن انگریزوں کے وفادار تھے۔ اسلیئے عالم اسلام میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اسکے باوجود شریف حسین خلیفہ بننے کی فکر میں تھے۔ لیکن انکے اقدامات انتہائی منفی تھے۔ حاجیوں کو تنگ کرنے، بے گناہ مسلمانوں اور حجازیوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ مسلمانوں سے زبردستی بیعت لیتے۔ شریف حسین نے انگریزوں کی مدد سے پورے جزیرۃ العرب کا بادشاہ بننے کی بھی کوشش کی تھی۔[23] انہوں نے اپنے بیٹے امیر فیصل کو انگریزوں کے تعاون سے عراق کا حکمران بنوایا۔ اور دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کو شرقِ اردن کا حکمران تسلیم کرالیا۔ نجد کے سلطان ابن سعود سے شریف حسین کی پرانی عداوت تھی۔ اسلیئے شریف حسین نے اہل نجد کو حج سے روک دیا۔ جس سے بالآخر دونوں فریقوں میں باضابطہ جنگ چھڑ گئی۔ ستمبر 1924ء میں نجدی فوجیں طائف میں داخل ہوگیں۔ وہاں شریف حسین کے بیٹے امیر علی حکمران تھے۔ وہ طائف چھوڑ کر مکہ معظمہ بھاگ گئے۔ لیکن نجدی فوجیں مکہ معظمہ کی طرف بڑھیں تو شریف حسین اور امیر علی دونوں جدہ چلے گئے۔ وہاں شریف حسین نے خود تو حکومت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن امیر علی کو ملک الحجاز بنا دیا۔[24] اس کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا تھا، جو شریف حسین کی اس لیے حمایت کر رہا تھا کہ وہ آل رسول ﷺ اور نجیب الطرفین سید ہیں۔ لہذا اقتدار کے اصل حقدار وہی ہیں۔ انہوں نے ابن سعود کو "وہابی" قرار دیتے ہوئے انکے خلاف پروپیگنڈہ شروع کردیا۔ حالانکہ یہ طبقہ شریف حسین کے افعال واعمال سے نالاں بھی تھا۔ مسلمان قوم کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اس نے فروعی اختلافات کا شکار ہوکر ہمیشہ اپنا ہی نقصان کیا۔ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صحیح کو صحیح غلط کو غلط کہنے کی بجائے تنقید برائے تنقید یا تقلید برائے تقلید کی روش اختیار کرکے اغیار کو مضبوط ہونے کا موقع فراہم کیا۔

محمد علی جو حجاز کی صورتحال سے سخت پریشان تھے۔ انہوں نے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں 18 دسمبر 1924ء کو حجاز روانہ کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالقادر قصوری وفد کے ارکان تھے۔[25] جدہ میں شریف حسین کے بیٹے امیر علی کی حکومت تھی۔ وفد نے امیر علی اور انکے وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ حجاز میں جمہوری حکومت قائم ہونا ناممکن اور موتمرِ اسلامی کا انعقاد بے سود ہے۔ جنگ جاری تھی۔ وفد کو جدہ سے آگے جاکر ابن سعود سے ملاقات کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ ابن سعود کو قائل کریں گے کہ امیر علی کو حجاز کا اصل بادشاہ تسلیم کرلیں۔ یہ شرط وفد کیلیئے قابلِ قبول نہ تھی۔[26] لہذا وفد جدہ ہی سے واپس آگیا۔ دورانِ جنگ ابن سعود نے یہ اعلان کیا کہ :-

> "میں حجاز پر اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں جارہا ہوں۔ بلکہ میں تو اس ارض پاک کو شریفوں کے پنجۂ ظلم و ستم سے نجات دلانے کو اٹھا ہوں۔ ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور انکا کام۔ وہ جسے چاہیں، اپنا حکمران منتخب کرلیں گے۔"[27]

اس اعلان سے محمد علی کو یوں محسوس ہوا، جیسے انکی مدتوں کی خواہش پوری ہوتی نظر آرہی ہے، کہ ترکی کا نعم البدل اب حجاز میں مل جائے گا۔ اسلیئے وہ سلطان ابن سعود کے طرفدار ہوگئے۔ لیکن جلد ہی اخباروں میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ ابن سعود کی

فوج نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے گولہ باری کی اور مسجد نبویؐ کے ان گنبدوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ جہاں رسول ﷺ کا روضہ مبارک ہے۔ اس سے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن محمد علی نے اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل اور انکے ہم خیال ابن سعود کے سخت مخالف ہو گئے۔[28] محمد علی کیلئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ انہیں ابن سعود کی حمایت کر کے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ابن سعود نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کو مسمار کرنا شروع کیا۔ تو اس سے مسلمانوں میں اور بھی زیادہ اشتعال پیدا ہوا۔ لیکن محمد علی ابن سعود کے ان تمام اقدامات کو اسلیئے نظر انداز کرتے رہے کہ انکے ذریعے حجاز میں ایک شرعی جمہوریت قائم ہو گی۔ لیکن ایسی شرعی جمہوریت کا کیا فائدہ، جسے قائم کرنے والے اسکے قیام سے پہلے ہی مسلمانوں کو ذہنی کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیں۔ ایسے شخص سے حقیقی شرعی جمہوریت کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ محمد علی کے مخالفین انہیں "وہابی" اور "قبہ شکن" کہنے لگے۔ ان پر اپنے مرشد سے اختلاف کی بنا پر آئینِ طریقیت کی رو سے کفر کا الزام لگایا۔ لیکن محمد علی خلافت کے قیام کی خواہش میں اس انتہا کو پہنچ گئے تھے کہ انہوں نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ابن سعود نے خلافت تک پہنچنے کے لیے منفی راستے کا انتخاب کیا ہے۔ در حقیقت ابن سعود کے نزدیک خلافت کا قیام نہیں، بلکہ اقتدار کا مقصود تھا۔

محمد علی نے اپنے سیاسی خیالات و نظریات اور مرشد کے احترام کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔ انہوں نے حجاز کے صحیح حالات معلوم کرنے کیلئے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد بہار کے مشہور لیڈر مولوی محمد شفیع داؤدی (1879ء -1949ء) کی سربراہی میں بھیجا۔ جسکے ارکان میں مولوی قمر احمد، مولانا عرفان، شیخ عبدالمجید (1889ء -1978ء سندھ)، حافظ عثمان اور مولانا عبدالحکیم صدیقی (جمعیت العلماء) تھے۔[29] وفد نے ابن سعود کو مسلمانانِ ہند کے جذبات سے آگاہ کیا۔ ابن سعود نے وعدہ کیا کہ شہید کی گئی مساجد، مزار اور قبریں دوبارہ بنوائیں گے۔ ابن سعود کا یہ وعدہ کہ وہ ان مقامات کو دوبارہ بنوائیں گے اس بات کا ثبوت تھا کہ انہوں نے ہی انہیں مسمار کیا ہے۔ اسکے باوجود محمد علی ابن سعود کے طرفدار رہے، صرف قیامِ خلافت کی آس پر۔ محمد علی نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایسی خلافت کا کیا فائدہ جسکے قائم کرنے والا اسکی اہلیت و قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ برائے نام یا رسمی ادارۂ خلافت کا کیا فائدہ تھا۔

محمد علی یا ابن سعود کا مخالف گروہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر پروپیگنڈے کا رنگ دے رہا تھا۔ 22 اگست 1925ء کو اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ نجدیوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے مسجد نبویؐ اور مزار اطہر کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ سیدنا حمزہؓ کی قبر شہید کر دی ہے وغیرہ وغیرہ۔[30] لیکن حقیقت حال معلوم کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ان خبروں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ حجاز میں جنگ کے اختتام پر جب جمہوریت کے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا تو محمد علی نے سید سلمان ندوی کی سربراہی میں ایک وفد مرتب کیا۔ جسکے ارکان میں مولانا عرفان، مولانا ظفر علی خان، سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی، اور شعیب قریشی تھے۔ یہ وفد اکتوبر 1925ء کو حجاز گیا۔[31] لیکن ارکان وفد میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خان (1872ء -1956ء)، ابن سعود کے حامی ہو گئے۔ جو ارکان کو پسند نہ تھا۔[32] وفد ابھی حجاز ہی میں تھا کہ ابن سعود نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا اور شاہ حجاز بننے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ یہ حالات جان کر محمد علی کو صدمہ ہوا۔ وہ تو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ابن سعود کے ذریعے حجاز میں ملوکیت ختم ہو کر جمہوری اور شرعی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس مسئلے پر اپنے مرشد

اور محسنوں سے اختلاف بھی مول لیا۔ جسکے لیے انہیں تین محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑا۔ ایک تو جمہور مسلمین کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قبر پرستی کے جذبات فاسد کو دور کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے انکے بڑے گہرے دوست اور بزرگ مولانا عبدالباری فرنگی محل جو انکا قوت بازو تھے، جنھیں وہ امت مسلمہ کیلئے بے حد مفید قرار دیتے تھے اور تحریک خلافت میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان سے بھی اختلاف مول لیا۔ تیسرے محسنوں سے اختلاف اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کیلئے جدوجہد کرنا پڑی۔ اپنے شریکِ کار، معتمدِ خاص مخلص دوست مولانا عبدالماجد بدایونی(1898ء-1970ء)، اپنے رفیقِ زنداں مولانا نثار احمد کانپوری اور مہاراجہ محمود آباد (1878ء-1931ء) کی مخالفت کرتے ہوئے انکے عقائد کو باطل قرار دیا۔[33] اپنے دعویٰ کو دلائل سے صحیح ثابت کیا اور انکے ادعا کو دلائل سے پارہ پارہ۔ ان کا قلم، زبان اور اخبار اس مقصد کی تعلیم کیلئے وقف تھے۔ مخالفین کی طرف سے سب وشتم کیا گیا۔ ذلت و رسوائی برداشت کی۔ مگر ڈٹے رہے اس عقیدے کے ساتھ کہ :-

ؔ توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

دراصل محمد علی کا ایمان تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کیلئے کر رہے ہیں۔

محمد علی اگر قبہ پرست نہیں تھے تو ابن سعود کی کوششوں کے حامی بھی نہیں تھے۔ انکا کہنا تھا کہ حجاز مقدس بالخصوص کعبۃ اللہ پر شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، مالکی اور شافعی وغیرہ سب کا برابر حق ہے۔ اسلیئے مختلف فیہ مسائل میں حکومت کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ اگر آج ابن سعود کی حکومت اپنے عقیدے کی بنا پر قبور کو منہدم کر سکتی ہے تو کل اگر وہاں شیعوں کی حکومت قائم ہو جائے تو مزارِ رسول ﷺ سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے جسد پاک اپنے عقد کے مطابق الگ بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ایسی مختلف فیہ چیزوں میں مداخلت ہی نہیں کرنی چاہیے، جنکا تعلق اور جنکے جواز کا پہلو فقہیہ و تفنفیہ سے کچھ بھی نکلتا ہو۔ اسلیئے وہ "ہدمِ قبور و مقابر" کے خلاف تھے۔[34]

محمد علی نے خلافت کانفرنس میں بصدارت ابوالکلام آزاد، خلافت کمیٹی سے یہ تجویزیں منظور کرائیں کہ حجاز میں ملوکیت نہ ہو۔ اور موتمرِ اسلام کا انعقاد ہو۔ جس میں عالم اسلام کے نمائندے شریک ہوں۔ اور اگر وہ فیصلہ کر دیں کہ مسمار شدہ مقابر کی مرمت کی جائے تو اسکی تعمیل ابن سعود پر لازم ہو گی۔[35] ابن سعود نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ ایسی حرکتیں انکے حکم کے بغیر داخلہ کے وقت فوج سے اضطراباً سرزد ہو گیں۔ لیکن یہ جواز بے معنی تھا۔ اگر فوج نے اپنی مرضی سے ایسا کیا تھا تو اسکے خلاف کاروائی کیوں نہ کی گئی۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پھر ابنِ سعود اتنے کمزور تھے کہ فوج انکے کنٹرول سے باہر تھی۔ لیکن ابن سعود کی خاموشی کا مقصد رضامندی نہ سہی لیکن نیم رضامندی ضرور تھا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محل سے اس معاملے میں محمد علی کا اختلاف نظریاتی تھا ذاتی نہیں۔ اگرچہ وہ انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ اس میں بھی محمد علی کے جذباتی پہلو کا زیادہ دخل تھا۔ جنوری 1926ء میں محمد علی نے ہمدرد میں مولانا عبدالباری

سے قطع تعلق کا اعلان بھی شائع کر دیا۔ اس اعلان کے چار روز بعد 19 اور 20 جنوری کی درمیانی شب مولانا عبدالباری کا انتقال ہو گیا۔ شومئی قسمت جس دن محمد علی کا یہ اعلان شائع ہوا اسی روز ابن سعود نے بادشاہت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

محمد علی اور اجلاس مسلم لیگ علی گڑھ 1925ء

دسمبر 1925ء میں مسلم لیگ کا سترھواں سالانہ اجلاس سر عبدالرحیم کی صدارت میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا۔ جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ حکومتِ برطانیہ ایک رائل کمیشن مقرر کرے۔ ہندوستان کے حالات کی تحقیق کر کے ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جو بتدریج ہندوستان کو لامحالہ ذمہ دار حکومت کی حیثیت تک پہنچادے۔ جس میں مسلم اقلیت کیلئے کافی تحفظات ہوں۔ محمد علی نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی کہ "سوراج "جو ہمارا پیدائشی حق ہے۔ وہ موجود حکومت کے دستور سے ہمیں حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ، حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ تمام ہندوستانی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کی ایک کانفرنس طلب کرے۔ جو فروری 1924 کی مرکزی اسمبلی کے مطالبے کے مطابق ایک دستور "سوراج" گورنمنٹ کا بنادے۔[36] اگر غور سے دیکھا جائے تو نفسِ مفہوم میں تجویز اور ترمیم میں یہ فرق تھا۔ کہ تجویز میں ایک شاہی کمیشن کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور ترمیم میں ایک گول میز کانفرنس کا۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ سر عبدالرحیم نے ترمیم کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ایک مستقل تجویز ہے۔ جسکو ترمیم نہیں کہا جاسکتا۔ درحقیقت خلافتی اور لیگی جھگڑے ذہنوں میں اب تک خلفشار پیدا کئے ہوئے تھے۔ جو انہیں مخالف دھاروں میں چلا رہے تھے۔ حالانکہ سقوط خلافت کے بعد محمد علی اور دیگر خلافتی خود ہی مسلم لیگ میں شریک ہونے لگے تھے۔ لیکن مسلم لیگ کے کارپردازوں نے مخالفت کی رو میں بہہ کر اسکا دامن بہت تنگ کر دیا تھا۔ اسکے باوجود محمد علی نے ہمت نہ ہاری وہ مسلم لیگ کے ہر اجلاس میں شریک ہوتے اور اسکی کاروائی میں عملی حصہ لیتے رہے۔

محمد علی کی موتمر اسلامی میں شرکت

1926ء میں ابن مسعود نے ایک "بلاغِ عام" کے ذریعے مؤتمر کے انعقاد کا اعلان کیا۔ محمد علی نے مشاہدے کی غرض سے اپنی افلاس کے باوجود موتمر میں جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اور خلافت کمیٹی پر اپنے خرچ کا بوجھ ڈالنا مناسب نا سمجھا۔ محمد علی کی آمادگی کے بعد ایک وفد حجاز بھیجا گیا۔ جسکے سربراہ سید سلمان ندوی، ارکان میں علی برادران اور سیکریٹری مسٹر شعیب قریشی تھے۔[37] محمد علی نے ابن سعود کے جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کے باوجود موتمر میں پورے جوش سے ابن سعود کو مخاطب کر کے کہا کہ :۔

> " یہ ملوکیت کیسی، اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے۔ تم کتاب وسنت کے تمسک کے داعی ہو۔ پھر یہ

قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں۔"[38]

مخالفتوں اور سازشوں نے محمد علی کا کہیں بھی پیچھا نہ چھوڑا، واقعہ کچھ یوں ہے کہ اس زمانے میں مصری محمل کا قضیہ پیش آیا۔ محمد علی مصری کمانڈر سے ملے۔ غالباً ان سے محمد علی کی شناسائی تھی۔ اگر شناسائی نہ بھی ہوتی تو ایک مسلم حکومت کے مسلم عہدہ دار سے ملنا کوئی اخلاقی، قانونی، یا شرعی جرم نا تھا۔ لیکن اس ملاقات کو غلط رنگ دیا گیا۔ اور ہندوستان میں یہ مشہور کیا گیا کہ محمد علی نے مصری کمانڈر کو ترغیب دی کہ وہ اسلامی فوج کے ایک حصے پر گولیاں چلائے۔ اس سلسلے میں مفتی کفایت، مولانا احمد سعید، مولانا عرفان اور مولانا عبدالحلیم (1876ء-1953ء) کو دھمکی دی گئی کہ وہ محمد علی کے خلاف بیان دیں۔ مگر ان صاحبان نے مخالفین کی بات ماننے کی بجائے جرأتمندی سے الزام کی تردید کر دی۔ اور اس واقعہ سے قطعاً لاعلمی اور بے تعلقی کا بیان دیا تو تلاطم کچھ کم ہوا۔[39]

اسپیشل خلافت کانفرنس

مئی 1926ء کو دہلی میں بصدارت سید سلیمان ندوی اسپیشل خلافت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کی ہر تجویز معتدل، معقول اور اس خواہش سے لبریز تھی کہ ملک میں پھر امن و امان قائم ہو۔ ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں کہ فسادات کا خاتمہ ہو جائے اور ہندو مسلمان نہایت اطمینان و شرافت سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اسکے باوجود کانگرس اور ہندوؤں نے اس کانفرنس سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا اور مخالفت پر اتر آئے۔[40] وہی ہندو جو محمد علی کی شان میں رطب اللسان ہوتے تھے۔ اس کانفرنس کے بعد انہوں نے محمد علی پر الزام عائد کرنا شروع کر دیے۔ گو ان چیزوں کا آغاز تو عرصہ سے ہو چکا تھا مگر اب ان میں شدت آگئی۔ اس کے باوجود محمد علی مفاہمت کے لیے کوشاں رہے۔ کانفرنس کے بعد انہوں نے وفدِ حجاز کے ساتھ جانے سے پہلے مسلمانوں سے یوں خطاب کیا کہ :۔

> "یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے۔ نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں، میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"[41]

مقام حیرت ہے کہ محمد علی یہ الفاظ اس وقت ادا کر رہے تھے جب مہا سبھائی کیمپ سے انہیں غدارِ وطن کا خطاب مل چکا تھا۔ اور محمد علی مسلمانوں کو انتہائی عاجزی کی تاکید کرتے رہے۔ اور وہ بھی ایسی قوم کے لیے جن کے نزدیک مسلمانوں کی رواداری، مہر و محبت اور مفاہمت پسندی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ بھی واضح الفاظ میں بتا رہے ہیں کہ مسلمانو تم مشرکین کو عداوت میں بہت شدید پاؤ گے۔

لتجدن اشدالناس عداوة للذين امنوا اليهود والذين اشركوا ٥

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ محمد علی ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو نیچا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تو سب کچھ مسلمانوں ہی کی خاطر کر رہے تھے۔ کہ شاید مسلمانوں کی رواداری ہندو انتہا پسندی میں لچک پیدا کر دے۔ اور دونوں قومیں باہم شیر و شکر

ہو جائیں۔

دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہندو زعماء کانگریس نے شدھی و سنگھٹن کی مخالفت کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ تحریکیں امن وامان کیلئے سمِ قاتل تھیں۔ ہندو لیڈروں نے سوامی شردھانند، لالہ ہردیال، بھائی پرمانند، پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے کو آزاد چھوڑ دیا۔ اور خود خاموشی اختیار کر لی۔ سنگھٹن جماعت نے آل پارٹیز کانفرنسوں کو ناکام بنا دیا۔ یونٹی کانفرنسوں کو ملتوی کرایا۔ اتحاد و اتفاق کا خاتمہ کر دیا۔[42] پھر بھی انکے خلاف کانگریسی حلقہ سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اسلیئے کہ انتخابات کا زمانہ قریب آرہا تھا اور انہیں ووٹ حاصل کرنے کیلئے جدو جہد کرنی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود محمد علی نے صلح کی کوششیں جاری رکھیں۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے راہنماؤں کے ساتھ کانپور کانفرنس کے موقع پر گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اپنا "قفلِ خاموشی" کھولیں اور مخالف فضا کا خاتمہ کر کے اچھی فضا قائم کرنے کی کوشش کریں۔ محمد علی نے اس سلسلے میں دیگر راہنماؤں سے بھی ملاقاتیں کیں۔[43] مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ جب تک محمد علی مسلم لیڈروں کی غلط باتوں کی پردہ دری اور گمراہ راہنماؤں کی مخالفت کرتے رہے۔ اسوقت تک وہ کانگریس میں محبوب رہے۔ جب انہوں نے مالوی جی، لاجپت رائے، ہردیال اور مونجے کی پردہ دری کی تو مہاسبھا حتیٰ کہ خود کانگرس کے حلقوں میں معتوب ٹھہرائے گئے۔

محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی معرکہ آرائی

محمد علی کا آخری دور انتہائی ابتلاء و آزمائش میں گذرا اس دور میں محمد علی اور خواجہ حسن نظامی (1878ء -1955ء) میں قلمی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کی بنیاد خواجہ صاحب کا وہ خط تھا، جو انہوں نے 12 اگست 1918ء کو ہاپوڑ کے ضیاء الحق کے نام لکھا تھا۔[44] جس میں خواجہ صاحب کے حکومتِ وقت کے ساتھ تعلقات، پان اسلام ازم سے آگاہ کرنے اور جاسوسی کے واضح ثبوت تھے۔ جب ضیاء الحق ہاپوڑی اور خواجہ حسن نظامی میں کشیدگی ہو گئی تو ہاپوڑی صاحب نے یہی خط اکتوبر 1926ء میں محمد علی اور انکے ساتھیوں کو دہلی میں دکھا دیا۔ محمد علی ایسے معاملات میں بھلا کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ جب خواجہ صاحب کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے 16 نومبر 1926ء کو ایک خط کے ذریعے محمد علی کو اس قضیے سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔[45] لیکن محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا کہ :۔

> "میں ایک اخبار نویس ہوں اور اس پیشہ کے باعث چند فرائض میرے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ ان سے کسطرح سبکدوش ہو سکتا ہوں؟ رہی ان صاحب کی شخصیت، سو یہ معاملہ ان صاحب کی شخصیت کا نہیں ہے۔ بلکہ خود آپکی شخصیت کا ہے اور جو کاروائی آپ خود اقبال فرماتے ہیں کہ آپ نے کی ہے وہ ان صاحب کی شخصیت سے بے نیاز ہے اور اسقدر اہم ہے کہ میں اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔"[46]

جب محمد علی نے انکار کر دیا تو خواجہ حسن نظامی نے محمد علی اور انکے حامیوں کو اپنے روزنامہ "غریبوں کا اخبار" میں بدنام کرنا شروع کر دیا۔[47] یہ منفی حربہ محمد علی کیلئے نقصان کا باعث ثابت ہوا۔ محمد علی پر رقابت کا سنگین الزام لگایا کہ وہ

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا ابو الکلام آزاد حتی کہ اپنے پیرو مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محل سے بھی "رقابت" رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری نے محمد علی کو آخری عمر میں "مردودِ طریقیت" کر کے "عاق" کر دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ محمد علی نے انکے الزامات کا انتہائی مدلل جواب دیا اور حوالے کے طور پر خواجہ حسن نظامی کا وہ سپاسنامہ جو انہوں نے محمد علی کی مؤتمر سے واپسی پر انکے اعزاز میں جامع مسجد دہلی میں پڑھا تھا، پیش کر دیا۔ 22 اگست 1926ء کے روزنامچہ میں خواجہ صاحب نے محمد علی کے بارے میں تحریر کیا تھا کہ :۔

> " میرا اعتماد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں۔ پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو انہوں نے محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کیونکہ انکو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے۔ اور قبہ شکنی کی خبریں مبالغہ آمیز اور غلط ہیں اور اس معاملہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد مولانا عبدالباری سے بھی موافقت پر راضی نہ ہوئے۔ لیکن جب انہوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں۔" [48]

محمد علی نے خواجہ صاحب کی مخالفت کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ در حقیقت میں نے جب انکی خامیوں کا پردہ چاک کیا، تو میری تمام خوبیاں اب خامیوں میں بدل گئیں ہیں۔ جو شخص خود ہی دوسروں کے بارے میں رائے دینے کے سلسلے میں تضاد کا شکار ہے۔ اسکی اپنی شخصیت کیا ہو سکتی ہے۔ دراصل محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کی حکومت پرستی اور غلط سرگرمیوں کو بے نقاب کر کے مسلمانوں کو باخبر کیا تھا۔ مگر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا طریقہ محمد علی کو بہت منہگا پڑا۔ دراصل محمد علی تحمل کی بجائے جوش میں آجاتے تھے۔ جس سے فریق ثانی کو اعتراضات کا موقع مل جاتا تھا۔ یہی معاملہ خواجہ صاحب کے ساتھ قلمی جنگ میں ہوا۔ جہاں یہ جوش اور انتہا پسندی محمد علی کیلئے پریشانی کا باعث ہوئی۔ وہاں اس سے انہیں ایک بڑا سیاسی دھچکا بھی لگا۔

"انڈین نیشنل یونین" کی مخالفت

1926ء کے وسط میں پنڈت موتی لال نہرو اور ابو الکلام آزاد نے مل کر "انڈین نیشنل یونین" کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔ جسکا مطلب یہ تھا کہ جو اسکا رکن ہو گا وہ ایسے فرقہ وارانہ نظام کا ممبر نہ ہو سکے گا۔ جسے "یونین" قومیتِ ہند کو نقصان پہنچانے والا قرار دے دے۔[49] محمد علی نے اس یونین کے وجود کو متحدہ قومیت اور ملت کے منافی قرار دیا۔ جب ان کے پاس اس یونین کا دعوت نامہ آیا تو انہوں نے 6-7 اکتوبر 1926ء کے "ہمدرد" کی اشاعت میں یونین کے خلاف لکھا کہ :۔

> "---- مگر 31 جولائی کے اعلان میں اسقدر تعمیم تھی کہ ہر وہ شخص جو کچھ بھی مذہبی اور ملی احساس رکھتا تھا۔ اپنی اپنی جگہ پر خائف ہو گیا اور سمجھنے لگا کہ یہ نئی مجلس

> ہندوستان میں وجود قومیت کی خواہاں نہیں، بلکہ مذہب وملت کی دشمن ہے۔ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اسکا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اسکے دروازے پر کنداں ہے جو شخص اسمیں داخل ہو، امید کو باہر چھوڑ آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنی چاہی ہے۔ جسکے دروازے پر کنداں ہو کہ جو اسمیں داخل ہونا چاہے وہ ملت و مذہب کو باہر چھوڑ آئے۔"[50]

محمد علی جو مذہب وسیاست کو لازم وملزوم قرار دیتے تھے۔ وہ ایسی سیکولر تنظیم کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اس پر شدید تنقید کی۔ محمد علی کی خواہش تھی کہ آئے دن تنظیم یا جماعتیں بنانے کی بجائے ہندو اور مسلمان آپس کے اختلافات کو ختم کریں۔

25 نومبر 1926ء کے اخبار "ہمدرد" میں محمد علی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے تحریر کیا کہ:۔

> "ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جب تک چاہیں مسجد کے سامنے ڈھول تاشے پیٹا کریں اور سنکھ اور قرنا پھونکا کریں۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان بھی آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جسطرح سجا کر جس سڑک سے جہاں چاہیں لے جائیں اور انکا گوشت چاہے ڈھکا لے جائیں چاہے کھلا لے جائیں۔ کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو۔ چند دنوں میں دونوں ملتیں ایک دوسرے کی ضد پر اپنے اپنے مذہبی فرائض ادا کرنا چھوڑ دیں گی۔ اور شرافت کی زندگی کی طرف عود کریں گی۔ اور حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنالیں گی۔ ----آج دونوں طرف سے ضد کا مظاہرہ ہو رہا ہے اور خواہ مخواہ مذہب کو اس میں لپیٹا جا رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو، حکومت اس تماشا کو دیکھ رہی ہے۔ خود آج کسی سے مرعوب نہیں، اور دونوں کو مرعوب کیئے ہوئے ہے۔ یہ ایک سیاسی جنگ ہے، میں نہ اسکو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں نہ اسکو چاہ سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم ہوں۔"[51]

بعض اوقات محمد علی رواداری میں بہت آگے نکل جاتے تھے۔ لیکن وہ اس رواداری میں ہندوؤں کو بھی ویسا ہی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ دراصل ہنود اکثریت میں تھے اور ہمیشہ اکثریت اقلیت پر غالب آجاتی ہے۔ محمد علی کا خیال تھا کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے اتحاد کی کوشش نہیں کرتے تو اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے، ہندوؤں کا نہیں۔ کیونکہ انہیں تو اکثریتی قوم ہونے کا زعم تھا۔ اکثریت کے لیے اقلیت کو جھکانا یا دبانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ جب ہندو مسلمانوں کے معاہد ہونگے تو کم از کم معاہدے یا اتحاد کا پاس کرتے ہوئے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے گریز کریں گے۔

ہندوؤں کی مخالفت اور فرقہ وارانہ مقاصد کی تکمیل میں جو چیز مانع تھی۔ وہ جداگانہ انتخاب تھے۔[52] جب سے سوراج پارٹی نے مجالس قانون ساز میں شرکت کی۔ اسکے بعد سے کانگریس اور ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ شروع ہو گیا۔ کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں۔ دراصل جداگانہ انتخاب میں اسکے سوا اور کوئی برائی نہ تھی۔ کہ ہندو اپنی اکثریت کی قوت سے مسلمانوں کو انکے حقِ نیابت سے محروم نہیں کر سکتے تھے۔ اور مسلمان جس کو چاہتے اپنا نمائندہ منتخب کر کے نیابتی اداروں میں بھیج سکتے تھے۔ مگر ہندوؤں کیلئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ تو ہندوستان میں صرف ہندو کی آواز اور ہندو کی مرضی چاہتے تھے۔ لہذا مخلوط انتخاب پر مصر تھے۔ تاکہ مجالسِ قانون ساز میں صرف ہندو منتخب ہو کر جائیں۔ ہندوؤں کی طرف سے بھی اور مسلمانوں کی طرف سے بھی۔ مخلوط انتخاب میں نشستوں کا تعین تو وہ منظور کر ہی لیتے تھے۔ خواہ ناگواری کے ساتھ ہی سہی۔ کیونکہ انکو یہ اطمینان تھا کہ ہندوؤں کی کثرتِ رائے سے جو مسلمان منتخب ہونگے۔ ان کو آئندہ الیکشن کے دباؤ میں ہندوؤں کی مرضی کے تابع ہی رہنا پڑے گا۔

محمد علی پر خلافت کمیٹی کے غبن کا الزام

اس کے علاوہ ہندوؤں کا ایک مقصد مسلمانوں میں باہمی نفاق پیدا کرنا بھی تھا۔ ان کی کوششیں رنگ لائیں۔ مسلمانوں میں گروپ بندی پیدا کر دی اور انہیں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ مسلمان بھی اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ہندوؤں کے ہاتھوں کھلونا بنتے رہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ پر بھی غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ انہیں ہمیشہ زوال آپس کے نفاق کی وجہ سے آیا ہے۔ اور انہوں نے اس خدائی حکم کو بھی نظر انداز کر دیا کہ :۔

واطیعو اللہ و رسولہ و لا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم و اصبروا ٥

(الانفال : 46)

ترجمہ:۔ اور اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو۔

واقعی مسلمان غیر دانشمندانہ روش اختیار کرتے ہوئے آپس میں نفاق و انتشار کا شکار رہے۔ محمد علی پر خلافت فنڈ کے غبن کا الزام لگایا گیا۔ اور بلاوجہ اسے خوب اچھالا گیا۔[53] خلافت کمیٹی کے غبن سے متعلق واقعہ کچھ یوں ہے کہ یہ غبن اس وقت ہوا جب محمد علی جیل میں تھے یہ غبن اتفاقی طور پر ہوا تھا۔ سیٹھ چھٹانی پر سب اعتماد کرتے تھے۔ وہ خلافت کمیٹی کے خزانچی تھے۔ جب تحریک پورے عروج پر تھی۔ تمام راہنما تیزی سے گرفتار ہو رہے تھے۔ جس تیزی سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ اسی تیزی سے چندہ بھی جمع ہو رہا تھا۔ سیٹھ چھٹانی نے کسی اور صحیح مصرف پر یہ روپیہ خرچ کرنے کی بجائے اپنے کاروبار میں لگا دیا۔ اور شومئی قسمت کہ کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جس وجہ سے وہ روپیہ وقت پر مجلس خلافت کو ادا نہ کر سکے۔ لیکن انہوں نے اپنے چند کارخانے جو انکے بیان کے مطابق تقریباً سترہ اٹھارہ لاکھ ملکیت کے تھے، روپے کی بجائے وہ خلافت کمیٹی کے حوالے کر دیے۔ لیکن جب سازوسامان کی جانچ پڑتال ہوئی تو وہ مطلوبہ رقم سے بہت کم نکلا۔[54] خلافت کمیٹی

کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ قانونی اعتبار سے کوئی چارہ جوئی بھی نہیں کر سکتی تھی اور نہ "ان رجسٹرڈباڈی" ہونے کی وجہ سے مقدمہ چل سکتا تھا۔ علی برادران جیل ہی میں تھے کہ یہ راز فاش ہوگیا۔ ان حالات میں محمد علی پر غبن کا الزام لگانا انتہائی غلط اور حقیقت سے انکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں محمد علی رقمطراز ہیں کہ :۔

> "---- یہ سچ ہے کہ ہم نے خلافت کے خزانہ میں فقط تین لاکھ چھوڑے تھے اور ہمارے پیچھے چالیس پینتالیس لاکھ روپیہ ہماری والدہ، میری اہلیہ اور ہم سے محبت رکھنے والے بھائی بہنوں نے جمع کیا تھا۔ لیکن اگر یہ بڑی اور محیر العقول رقم ہم نے جمع نہیں کی تھی تو اسکی ایک پائی ہم نے خرچ بھی نہیں کی۔ سیٹھ چھٹانی نے جو کچھ کیا اسکے جوابدہ وہ خود ہیں اور پھر وہ حضرات جو قید وبند سے آزاد تھے۔ نہ کہ ہم، جنھیں خود اپنے ایک پیسہ پر بھی تصرف کی اجازت نہ تھی۔ اگر ہماری رہائی پر ہمیں خلافت کا خزانہ خالی ملا اور سیٹھ چھٹانی کے سوا اسکے تمام کارکنوں کی پوری دیانتداری اور سخت محنت وکوشش کے باوجود خلافت کی ساخت بگڑی ہوئی ملی۔ تو اسکی جوابدہی ہم پر نہیں بلکہ سبکسارانِ ساحل پر ہے۔"[55]

آل پارٹیز صلح کانفرنس دہلی 1927ء میں محمد علی کی کوششیں

محمد علی مخالفت والزامات کے باوجود اتحاد کیلئے کوشاں رہے لیکن سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی توانہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمان چند اہم باتوں پر متفق ہو جائیں اور اسکے بعد کانگرس سے منوانے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے 20 مارچ 1927 کو محمد علی جناح کی صدارت میں بمقام دہلی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے شرکاء میں راجہ آف محمود آباد، مولوی شفیع داؤدی، نواب اسمٰعیل خان، سر عبدالرحیم، محمد علی، سر عبدالقادر، عبدالمتین چودھری (1859ء-1948ء)، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خان، مولوی محمد یعقوب، سید آل نبی، انوار العظیم، ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور راجہ غضنفر علی خان شامل تھے۔[56] طویل بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد یہ طے پایا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے دیگر مطالبات تسلیم کرلیں۔ تو مسلمان جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اور مخلوط انتخاب قبول کرلیں گے۔ بشرطیکہ

1. سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے جداگانہ صوبے کی حیثیت دے دی جائے۔
2. دیگر صوبوں کی مانند صوبہ سرحد وبلوچستان میں بھی مجالس قانون ساز قائم کی جائیں اور آئینی اصلاحات کا نفاذ ہو۔
3. پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کی نمائندگی تناسب سے ہونی چاہیے۔
4. مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کوایک تھائی نمائندگی دی جائے۔

محمد علی میثاقِ لکھنؤ 1916ء "پاسنگ" کے اصول سے قطعی غیر مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں

نے اکثریت کی اہمیت کو نہیں دیکھا۔ بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو کھو کر دوسرے صوبوں میں اپنی اقلیتوں کی سطح کو بلند کر دیا۔ لہذا محمد علی نے تجاویز دہلی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"20 مارچ 1927ء کو اس غلط کاروائی کی اصلاح اسطرح کرانا تجویز کیا گیا کہ ہندو اور مسلمانوں کے تناسب کو پھر اسی طرح ناہموار کر دیا جائے۔ جسطرح قدرت نے اسے ناہموار کیا ہے۔ اور یہ نہ کیا جائے کہ خدا کے عالی بنائے ہوئے کو سافل اور سافل بنائے ہوئے کو عالی کر دیا جائے اور خدا کی طرح شیاق لکھنؤ بنانے والے ہی کہیں "فجعلنا عالیها سافلها وامطرنا علیهم حجارة من سجیل" اور مسلمانوں کو ہر جگہ اقلیت میں رکھوا کر انکو کچل ڈالیں۔ بلکہ جہاں وہ عالی ہیں انکو عالی ہی چھوڑ دیا جائے۔"[57]

محمد علی جو مختلف فرقوں میں افتراق و انتشار کے خاتمے کیلئے کوشاں تھے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمارے سامنے صرف یہی مسئلہ نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کو واجبی نیابت دلوائیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہیں آپس میں شیر و شکر کریں۔ کہ مختلف امیدوار کو صرف اسلیئے ووٹ دیے جائیں۔ کہ وہ فلاں ملت کے رکن ہیں۔ بلکہ اسلیئے ووٹ دیے جائیں کہ وہ سیاسی اصول میں ہمارے ہم خیال ہیں۔ تاکہ نہ انتخاب کے وقت اور نہ کامیابی کے بعد، کونسلوں میں ملتوں کی جنگ و جدل جاری رہے۔ بلکہ سیاسی اصولوں کی جنگ ہوا کرے۔ اور سب ایک مشترکہ قومیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

محمد علی نے تجاویز دہلی کو مقبول عام بنانے میں انتہائی جدوجہد کی۔ کانگریس سے منظور کرایا۔ پھر کلکتہ کانگریس سے منوایا۔ اسکے بعد محمد علی نے ہندو مہاسبھا کے حضرات کو اس نقطہ نظر پر لانے اور اپنا ہمنوا بنانے میں قوت صرف کی۔ مدراس کانگرس میں ان تجاویز کی توثیق و تصدیق کے بعد جب مالوی جی نے بھی ان کی تائید کر دی تو محمد علی نے دفور جذبات سے مالوی جی کے قدم پکڑ لیے اور کہا کہ :۔

"تم اگر ایسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہہ رہے ہو تو ہم تمہیں اقلیتوں کا امین بناتے ہیں۔"[58]

محمد علی نے اس دور میں جب کہ مخالفتوں کا طوفان بپا تھا، ان تجاویز کو کانگریس سے منظور کرایا۔ اگر محمد علی اور دیگر مسلم رہنما ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی راہ اختیار نہ کرتے۔ تو یقیناً وہ جن چند چیزوں کے لیے راضی ہوئے تھے، ان کے لیے بھی راضی نہ ہوتے۔ محمد علی حالات کی نزاکت کو محسوس کر چکے تھے اور تقاضاہائے وقت کے مطابق کام کرنے کی کوششوں میں تھے۔ لیکن مقام افسوس کہ ہندو ایک وقت میں جن چیزوں کو مان لیتے تھے دوسرے ہی وقت ان سے منحرف بھی ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے تجاویز دہلی کے سلسلے میں کیا۔ کہ اگر مسلمان جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں تو انکے باقی مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے۔ مسلمانوں نے کشیدگی ختم کرنے کیلئے ایسا ہی کیا۔ حالانکہ ایسا کرنے سے مسلم لیگ میں انتشار پیدا ہو گیا۔[59] اور وہ جناح لیگ اور شفیع لیگ میں بٹ گئی۔ کیوں کے سر محمد شفیع کسی حالت میں بھی جداگانہ انتخاب چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ وہ اسے مسلمانوں کی حیات کے لیے ناگزیر قرار دیتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کی بدعہدی ملاحظہ

ہو کہ انہوں نے نہرو رپورٹ میں تمام منظور شدہ باتوں کو رد کر دیا۔ اور مسلمانوں کی مخالفت پر کمربانده لی۔ جب کسی طور ہندوؤں کی مخالفت کم نہ ہوئی۔ تو محمد علی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :۔

"یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اتنی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو کہ صدیوں سے سب ہنود نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ سب ہندو ایک مندر تک میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ نہ سب جگہ سب کے لیے عام سڑکیں ہی کھلی ہوتی ہیں۔ جو جاتی اس درجہ خود غرضی کا شکار ہو، اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں؟ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، اسقدر فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے۔ جسقدر کہ ہنود کی فرقہ بندی خود اسکا سبب بنی۔"[60]

محمد علی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جداگانہ انتخاب کے خلاف تھے بے جا ہے۔ وہ تو اسکے حق میں تھے۔ اگر وہ مجبوراً دہلی تجاویز میں جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہوئے۔ تو صرف اس شرط پر کہ مسلمانوں کے دیگر مطالبات مان لیے جائیں اور ہندو مسلم مفاہمت کی صورت پیدا ہو جائے۔ محمد علی نے جداگانہ نیابت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"جب تک پانچ صوبوں میں ہماری اکثریت متعین نہ ہو، ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہرگز دستبردار نہیں سمجھے جا سکتے ---- جن سربرآوردہ مسلمانوں نے ان تجاویز پر اتفاق کیا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ اگر یہ منظور نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اس وقت متعدد حضرات نے کہا کہ تب تو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قائم رکھا جائے۔ مگر ڈاکٹر انصاری اور انکے ساتھ دو تین مسلمان سوراجیوں نے جو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ارکان تھے۔ فرمایا کہ اس حالت میں بھی مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کرا دینا چاہیے۔ میں نے اس وقت بھی اسی طرح اس سے اختلاف کیا تھا۔ جسطرح 1927ء تک برابر کرتا رہا تھا۔ ----ڈاکٹر انصاری اور چند سوراجیہ ارکان اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے اسطرح بلا شرط مخلوط انتخاب قبول کرنے پر میں نے اور غالبًا نواب اسمٰعیل خان نے اسکی مخالفت کی ----"[61]

خلافت والوں نے کبھی بھی مخلوط انتخاب کو بلا شرط اس وقت تک قبول نہیں کیا تھا۔ وہ محمد علی کے فارمولے کو مخلوط انتخاب قرار دیتے تھے۔ جس میں ہر امیدوار کو خواہ ہندو ہو یا مسلم، ایک متعدبہ تعداد یعنی پندرہ فیصدی ووٹ دوسری قوم کے لینے لازمی تھے۔ اور اس قسم کے مخلوط انتخاب کو کانگریس نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ محمد علی مخلوط انتخاب کو اس شرط کے ساتھ مانتے تھے کہ ہر امیدوار کو اپنے حلقہ ہائے نیابت میں کم از کم 3/4 ووٹ اپنے فرقے (یعنی مسلمان کو مسلمانوں سے اور ہندو کو ہندوؤں سے) سے حاصل کرنا چاہیے۔ اور 1/4 دوسرے فرقوں سے، حقیقتاً اس میں جداگانہ انتخاب ہی کی ایک ادا

پائی جاتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل کا حل تلاش کیا جا رہا تھا۔ بقول علامہ اقبال

"یہ حل With in India ہی تلاش کیا جا رہا تھا۔"[62]

جداگانہ انتخاب کے حامی ہونے کے باوجود محمد علی نے سیاسی انتشار کے خاتمے اور ہندو مسلم اتحاد کیلئے نا صرف مخلوط انتخاب کو خود قبول کیا۔ بلکہ وہ مسلمان زعماء جو اسکے مخالف تھے۔ انہیں بھی قائل کیا۔ اس سلسلے میں محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"---- میں خوش ہوں کہ میری اس تجویز کو مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مسز بیسنٹ، مالوی جی، مسٹر جینا (جناح) اور مسٹر چھاگلہ نے بھی قبول فرمایا۔ لیکن میں اسکا ادعا کرتا ہوں کہ جن شرائط کے ساتھ بھی مخلوط انتخابات کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی ایک وقیع جماعت نے قبول کیا۔ ان کو ان انتخابات کو قبول کرانے والا حقیقتاً صرف ایک شخص تھا اور اسکا نام محمد علی ہے۔ مسلم لیگ صوبہ جات متحدہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت اسکا ایک عضو بھی نہ تھا، اور کلکتہ میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا ----"[63]

مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ

اس اجلاس کی صدارت محمد علی جناح نے کرنی تھی۔ لیکن انکی عدم موجودگی کے باعث سے فوری فیصلہ کے مطابق سر محمد یعقوب علی نے صدارت کی۔ 20 مارچ 1927ء والے اجلاس کی تجاویز کو اس اجلاس میں منظور کیا گیا۔ جداگانہ یا مخلوط انتخاب کے مسئلہ پر مسلم لیگ دو دھڑوں میں مٹ گئی تھی۔ ایک کی قیادت محمد علی جناح اور دوسرے دھڑے کی قیادت سر محمد شفیع کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے اس اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ سر محمد شفیع کو الگ لیگ بنانے کی بنا پر مسلم لیگ سے خارج کر دیا جائے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ محمد علی نے اس اصولی موقف یا تجویز کی بھرپور حمایت کی۔[64] حالانکہ مولانا ظفر علی خان، محمد علی کے مخالفین میں سے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محمد علی بے جا مخالفت یا حمایت کی بجائے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہتے تھے۔ دوستوں یا دشمنوں کی انکے نزدیک کوئی قید نہ تھی۔

سائمن کمیشن 1927ء

8 نومبر 1927ء میں سر جان سائمن کی سربراہی میں لیبر گورنمنٹ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جسکے احاطہ تحقیق میں یہ بات داخل تھی کہ وہ اس امر کی تفتیش کرے کہ گذشتہ اصلاحات سے اسوقت تک ہندوستان نے کتنی ترقی کی ہے۔ تاکہ اسکے مطابق جدید اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جا سکے۔ یہ کمیشن 1929ء میں تشکیل دیا جانا تھا۔ لیکن ہندوستان میں بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی کے پیش نظر حکومت نے مقرر وقت سے دو سال قبل ہی کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔[65] مگر حیرت کی بات ہے کہ اس کمیشن کے ممبران میں کوئی بھی ہندوستانی نہیں تھا۔ جسے ہندوستان کے حالات سے واقفیت ہوتی۔

اس لیے ہندوستان کی اکثریت نے اس کمیشن کی مخالفت کی۔ محمد علی نے بھی محمد علی جناح کے ساتھ ملکر سائمن کمیشن کے خلاف ملکی فضاء تیار کی۔ اور پیہم جدوجہد سے اسمیں کامیاب ہوئے۔ لیکن پنجاب کی شفیع لیگ جس کے سرکردہ لیڈروں میں علامہ محمد اقبال بھی تھے، انہوں نے کمیشن کے ساتھ تعاون کیا۔ یہ چیز محمد علی اور علامہ محمد اقبال کے درمیان مزید اختلاف کا باعث ثابت ہوئی۔ اس پیشتر 1927ء ہی میں ایک اور مسئلے پر محمد علی کا علامہ اقبال سے اختلاف ہو چکا تھا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ 3-4 مئی 1927ء کو لاہور میں شیواجی کی برسی کے موقع پر جو ہندو مسلم فساد ہوا۔ اسکی تحقیقات جاری تھیں۔ کہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کا شملہ میں اجلاس منعقد ہوا۔ علامہ اقبال اسمبلی کے رکن تھے۔ اسمبلی میں ایک سکھ ممبر سردار اجل سنگھ نے سرکاری ملازمتوں کو مقابلے کے امتحان سے پُر کرنے کی قرارداد پیش کی۔ اور کہا کہ جہاں انتخاب ممکن نہ ہو وہاں سب سے زیادہ مستند امیدوار کو بلا لحاظ قوم، مذہب اور رنگ منتخب کیا جائے۔ لیکن علامہ اقبال نے اس قرارداد پر دلائل سے بحث کرتے ہوئے مخالفت کی اور کہا کہ :۔

"---اگر برٹش آفیسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اسکا خیر مقدم کرونگا---"[66]

جب محمد علی کو اس بارے میں علم ہوا تو انہوں نے اپنے اخبار میں تحریر کیا کہ "شمع و شاعر" کے مصنف انگریزوں کی چال کو نہیں سمجھ رہے۔ اور لندن ٹائمز اور اسکے موکلوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ اور اپنے رویے سے حکومتِ برطانیہ کو فائدہ پہنچا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ محمد علی نے اکھٹے پانچ مقالے علامہ اقبال کے خلاف لکھ ڈالے۔ سائمن کمیشن کے معاملے میں یہ کشیدگی اور بڑھ گئی۔ کیونکہ علامہ اقبال، سر محمد شفیع کے ساتھ تھے۔ اور وہ کمیشن سے تعاون کر رہے تھے۔ محمد علی کی کوششوں سے پنجاب کی شفیع لیگ کے علاوہ ہندوستان کی تمام قابلِ ذکر جماعتوں نے کمیشن کے ساتھ کوئی تعاون نہ کیا۔ محمد علی نے سائمن کمیشن کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"حقیقتاً برطانوی پالیمینٹ کو نہ ازروئے اخلاق ہماری قسمت کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیے، نہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہے۔ یہ جماعت ہندوستان سے متعلق محض جاہلوں کی ایک جماعت ہے۔ ان تقریباً سات سو (ممبران پارلیمنٹ) برطانویوں میں سے ستر بھی مشکل سے ایسے نکلیں گے جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتے ہونگے۔"[67]

محمد علی نے سائمن کمیشن کی مخالفت کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو اپنے قوت بازو پر انحصار کرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ اور واضح کیا کہ جرأت مند اقوام کبھی بھی دوسروں پر انحصار نہیں کرتیں۔ بقول محمد علی

"ہندوستان کے لیے برکن ہیڈ، ریڈنگ اور سائمن جیسے ماہرین بھی مناسب اور موزوں دستور وضع نہیں فرما سکتے۔ ہماری قسمت کا فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ جب تک ہم فاترالعقل نہ ثابت ہو جائیں۔ اپنے بیوی بچے کا انتظام ہمیں کو کرنا پڑے گا۔ کوئی دوسرا یہ کہہ کر ہمارے خانگی امور کی دیکھ بھال اپنے ذمہ نہیں لے سکتا کہ میں اس دیکھ بھال کی تم سے زیادہ اہلیت رکھتا ہوں۔"[68]

پولیٹکل کانفرنس یوپی میں محمد علی کی شرکت

علی گڑھ کی اس کانفرنس (دسمبر 1927ء) میں ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کی تجویزیں تھیں۔ کہ :۔

1. آیا انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط؟
2. پنجاب اور بنگال جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ہندوؤں کی نمائندگی کتنی ہو؟
3. سرحد بلوچستان کو اصلاحات دی جائیں یا کہ نہیں؟
4. بمبئی کو سندھ سے الگ کیا جائے کہ نہیں؟

تمام مطالبات جائز تھے۔ لیکن ان میں زیادہ تر کا تعلق مسلمانوں کے مفادات سے تھا۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت و مصالحت کیلئے تیار نہ تھے۔[69] لہٰذا اختلافات میں کمی کی بجائے شدت پیدا ہوگئی۔ محمد علی جنھوں نے اپنا سب کچھ ہندو مسلم اتحاد کے لئے داؤ پر لگادیا تھا۔ اس کانفرنس میں کشیدگی کو دیکھ کر سخت بددل ہوئے۔ دراصل محمد علی ایسے اتحاد کی کوشش کر رہے تھے جو ملک کی آزادی کی کلید ثابت ہو۔ جس میں ہندو اور مسلمان برابر شریک ہوں۔ آزادی کے ثمرات سے برابر مستفیذ ہوں۔ لیکن ہندو قطعاً ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو اندرونی خود مختاری چاہتے تھے۔ جس میں اختیار و اقتدار ہندوؤں کے پاس ہو۔ اور وہ اقلیتی فرقوں پر راج کر سکیں۔ جب عزائم یہ ہوں تو وہ کیونکر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد میں مخلص ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اکثریتی فرقے کو ساتھ ملائے بغیر آئینی حقوق حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ اسمبلیوں کے اندر اور باہر ہر جگہ اکثریت غالب آجاتی تھی۔ محمد علی بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسلیئے اختلافات، الزامات اور ناکامیوں کے باوجود کوششیں جاری رکھیں۔

آل پارٹیز کانفرنس دہلی 1928ء

سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ برکن ہیڈ ہندو مسلم سیاسی چپقلش سے سخت نالاں تھے۔ انہوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر جھنجھلا کر اوائل 1928ء میں ہندوستانیوں کو چیلنج دیا کہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ اسکیم پیش کریں۔[70] برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو ہندوستان کے سیاسی لیڈروں نے کو قبول کر لیا۔ اور دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کا ایک اجلاس 12 فروری 1928ء کو منعقد ہوا۔ جس میں نیشنل لبرل فیڈریشن، ہندو مہاسبھا، آل انڈیا مسلم لیگ، مرکزی خلافت کمیٹی، سینٹرل سکھ لیگ، ہوم رول لیگ، نیشنلسٹ پارٹی اور دیگر جماعتوں نے شرکت کی۔ اسکے پہلے اجلاس میں تین سو سے زائد مندوبین شریک ہوئے۔ جن میں محمد علی، مسٹر جناح، نواب اسمٰعیل خان، شعیب قریشی، حسرت موہانی، شفیع داؤدی، عبداللہ ہارون، راجہ آف محمودآباد، موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ، مونجے، تیج بہادر سپرو، اور مسز نائیڈو وغیرہ شامل تھے۔[71] اجلاس میں ہندوستانی دستور کے مطمع نظر پر غور و خوض کیا گیا۔ اس مسئلہ پر رائے عامہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ یعنی مکمل آزادی یا نوآبادیاتی طرز حکومت۔ بالآخر

درجہ مستعمرات Dominion Status کے حق میں فیصلہ کیا گیا۔ بنیادی حقوق، رائے حق دہی، ہندوستانی ریاستوں اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل ہونے سے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے 22 فروری 1928ء کو ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ 8 مارچ 1928ء کے اجلاس میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، جداگانہ انتخاب اور نشستوں سے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائے جانے والے اختلافات کے حل کیلئے رپورٹ پیش کرنے کیلئے 11 مارچ 1928ء کو دو ذیلی کمیٹیوں Sub.Committees کا تقرر عمل میں آیا۔[72]

اختلاف رائے کی بنا پر آل پارٹیز کانفرنس ملتوی ہوگئی۔ تو طے پایا کہ مئی کے آخری ہفتے میں یہ کانفرنس بمبئی میں طلب کی جائے گی۔ لیکن انتہا پسند ہندوؤں کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے اکثر انجمنوں نے مزید کاروائی جاری رکھنے سے اختلاف کیا۔ کیونکہ ہندوؤں کے جارحانہ رویہ کی وجہ سے ہر کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہو رہی تھی۔ آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں مسلمانوں میں مسلم لیگ، مسلم فیڈریشن اور دوسری جماعتوں نے اپنے نمائندے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اور کسی نے شخصی طور پر بھی شرکت کیلئے آمادگی ظاہر نہ کی۔ ہندوؤں میں ہندو مہا سبھا اور اسکی ہم خیال جماعتوں نے بھی شرکت سے انکار کر دیا۔ شخصی طور پر بھی مالوی جی، لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے اور مسٹر جیکر وغیرہ نے شرکت نہ کی۔[73] آل پارٹیز کانفرنس میں قابلِ ذکر لوگ گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی اور مسز اینی بیسنٹ تھے۔ شرکاء کی تعداد کم ہونے کے پیش نظر بعض نے مشورہ دیا کہ اسے برخاست کر دیا جائے۔ گاندھی نے یہ جواز پیش کیا کہ برخاست کرنے سے ملک میں مایوسی پھیلے گی۔ لہٰذا ایک کمیٹی بنادی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے، جس پر سارے طبقے متحد و متفق ہو جائیں۔ رپورٹ تیار ہونے پر آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس طلب کر لیا جائے۔ مولانا شوکت علی نے اس تجویز کی تائید کی۔[74]

نہرو رپورٹ 1928ء

گاندھی کی تجویز پر پنڈت موتی لال نہرو کی زیرِ قیادت ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ جس کے ارکان میں سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سوباش چندر بوس، سردار مینگل سنگھ وغیرہ تھے۔ کمیٹی کو حسب ضرورت ارکان کی تعداد میں اضافے کا اختیار بھی تھا۔ کمیٹی کے اجلاس "انند بھون" میں ہوتے تھے۔ رپورٹ کی تیاری کے بعد صدر کمیٹی نے لکھنو میں 28-29-30 اگست 1928ء کو اجلاس طلب کیا۔ جس میں نہرو کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ پیش کی گئی۔ رپورٹ میں ہندوستان کو کامل آزادی کی بجائے درجہ نوآبادیات دینے کی حکومت سے سفارش کی گئی۔ اور مسلمانوں کے تمام مطالبات کو مسترد کر دیا گیا۔[75] مسلمانوں سے متعلق نہرو رپورٹ کی چیدہ چیدہ سفارشات مندرجہ ذیل تھیں۔

1. مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ اس طریقہ انتخاب سے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مخلوط انتخاب کی سفارش کی گئی۔
2. آبادی کے لحاظ سے نشستوں کے تحفظ کے اصول کو ترک کر دیا جائے۔ تحفظِ نشست کا مطلب فرقہ واریت کو تسلیم کرنا

ہے جو اتنا ہی برا ہے جتنا جداگانہ انتخاب۔ پنجاب و بنگال میں آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ کیونکہ ان صوبوں میں مسلم اکثریت اپنے مفاد کی خوبی حفاظت کر سکتی ہے۔

3. مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے مطابق نمائندگی دینے کے لئے رضامندی ظاہر کی گئی لیکن آبادی کے تناسب سے زائد نشستیں دینے کے طریقِ کار کو ختم کر دیا گیا۔ جسے میثاقِ لکھنؤ 1916ء میں کانگرس نے تسلیم کیا تھا۔ اور قانون 1919ء کے تحت جاری کیا گیا تھا۔

4. مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دینے سے انکار کر دیا۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ ان کی آبادی کے لحاظ سے 25 فیصد نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔

5. مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔ نہرو رپورٹ میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ از سرِ نو تقسیم دو بنیادوں پر ہونی چاہیے اول زبان، دوسرے وہاں کے باشندے صوبے کے تمام اخراجات خود برداشت کریں۔ اگر سندھ ان دونوں شرائط کو پورا کرتا ہو تو اس صورت میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

6. صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کی سفارش کی گئی مگر اس سفارش میں بلوچستان کا کہیں ذکر نہ تھا اس کا یہ عذر پیش کیا گیا کہ یہ نام سہواً چھوٹ گیا تھا۔

7. ہندوستان کے لئے واحدانی طرزِ حکومت کی تجویز پیش کی گئی۔ جس کے تحت مرکز کو بے شمار اختیارات حاصل ہوں گے۔ غیر متذکرہ اختیارات بھی مرکز کے سپرد کئے گئے۔ اس طرح مضبوط مرکز کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔

8. مکمل آزادی کے بجائے درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کیا گیا۔ جس میں دفاع اور امور خارجہ انگریزوں کے ہاتھ میں رہیں گے۔

اجلاس میں ہندو مہا سبھا کے اقانیم ثلاثہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ اور ڈاکٹر مونجے نے شرکت کی۔ جو نہرو رپورٹ کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ جب کمیٹی کی رپورٹ تیار ہو کر منظر عام پر آئی تو اس میں کیا تھا اس بارے میں سوامی شنکر اچاریہ کہتے ہیں کہ :۔

> "صوبوں کو وہ آزادی بھی نہیں دی گئی تھی۔ جو اب حاصل ہے اور مرکز کو تمام اختیار عطا فرما دیے گئے تھے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ آزادی کامل کی بجائے "ڈومینین سٹیٹس" کا مطالبہ "درمیانی راستہ کے طور پر" منظور کر لیا گیا تھا۔" [76]

محمد علی جو یکم جون 1928ء کو بغرض علاج یورپ گئے تھے۔ لیکن ہندوستان سے انکا مسلسل رابطہ تھا۔ تمام سیاسی صورت حال سے آگاہ تھے۔ جب نہرو رپورٹ شائع ہوئی تو مسٹر شعیب قریشی (محمد علی کی بیٹی گلناز کے شوہر) نے محمد علی کو مسلمانوں اور ہندوستان کی حالتِ زار سے آگاہ کیا۔ محمد علی کی حب الوطنی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ بیقراری میں علاج وغیرہ چھوڑ کر دسمبر 1928ء میں ہندوستان واپس آگئے۔ محمد علی نے رپورٹ میں ترمیم کی ہر ممکن کوشش کی۔ تاکہ ہندوستان کے تمام طبقے خصوصاً مسلمان مطمئن ہو جائیں۔ لیکن ہندو اپنی ضد پر قائم رہے کہ نہرو رپورٹ میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ حتیٰ کہ گاندھی نے بھی اپنے آشرم میں معتکف ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور

نہرو رپورٹ کے حامی کی حیثیت سے میدان عمل میں آگئے۔[77]

آل پارٹیز مسلم کانفرنس پٹنہ میں محمد علی کی شرکت

محمد علی نے پٹنہ میں صوبہ بہار آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے نہرو رپورٹ کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب ایسٹ انڈیا کے عہد میں منادی کی جاتی تھی تو منادی والا پکارتا تھا کہ :۔

خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ لیکن نہرو رپورٹ کا ملخص یہ ہے کہ خلقت خدا کی، ملک وائسرائے کا اور حکم مہا سبھا کا۔

محمد علی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو حصولِ آزادی کے سلسلے میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ نہرو رپورٹ سے انہیں شدید دھچکا لگا۔ انہوں نے واضح کیا کے وہ ہندو جن پر انہیں بڑا اعتماد تھا، وہ بھی ہندوانہ ذہنیت کے ساتھ منظر عام پر آگئے ہیں۔ مثلاً گاندھی وغیرہ۔ محمد علی نے نہرو رپورٹ کو دائمی غلامی اور ہندو غلبہ سے تشبیہ دی۔[78]
28 دسمبر 1928ء کو خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے رپورٹ کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"ہماری آبادی 35 فیصد ہے اور تم ہمیں 33 فی صد نمائندگی نہیں دے سکتے۔ تم یہودی ہو بنیئے ہو۔"[79]

ڈاکٹر کے۔ کے۔ عزیز نے نہرو رپورٹ کے بارے میں خوبصورت الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ :۔

"تحریک خلافت کے خاتمے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مختصر ہنی مون Honey Moon ختم ہو گیا۔ اور مخالفت اور عناد نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ مگر اس مرتبہ اسکی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اور دونوں قوموں کے درمیان اتحاد کے امکانات یکسر ختم ہو گئے۔ نہرو رپورٹ نے اس کشیدگی پر مہر ثبت کر دی۔ اور ہندوستان میں امن ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔"[80]

پنجاب کے مسلم اخبارات روزنامہ انقلاب، سیاست، پیسہ اخبار اور مسلم آوٹ لک، وغیرہ بھی نہرو رپورٹ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ صرف محمد علی کا مخالف مولانا ظفر علی خان کا اخبار "زمیندار" نہرو رپورٹ کا حامی تھا۔[81] حالانکہ کانگریسی نکتہ نظر کی حامی جمعیت العلماء ہند نے بھی نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا۔[82]

کلکتہ کنونشن اور محمد علی

(کلکتہ کا ہنگامہ) کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت کیلئے پنڈت موتی لال نہرو کا انتخاب ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ اجلاس میں آزادی یا بالفاظ دیگر "ڈومینین اسٹیٹس" کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے حوصلہ

افزائی نہ ہونے کی صورت میں دوسرا اقدام اٹھایا جائے۔[83]

دسمبر 1928ء میں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی کلکتہ میں ہونا طے پایا اور صدارت کیلئے محمد علی کا انتخاب ہوا۔[84] انہی تاریخوں میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی کلکتہ میں رکھا گیا۔ اور مسٹر جناح جو مسلم لیگ کے مستقل صدر تھے، ان کی پر خلوص کوششوں سے مہاراجہ محمود آباد صدارت کیلئے منتخب ہوئے۔[85] صدر کانگریس مسٹر نہرو نے اجلاس میں ایک "اسپیشل کنونشن" کے انعقاد کا اعلان کیا۔ محمد علی کانگریس کے اجلاس میں تو شریک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے کنونشن میں شرکت کی۔ کیونکہ خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند کی طرف سے محمد علی کو نمائندہ کے طور پر کنونشن میں شریک ہونا پڑا تھا۔

کانگریس نے تو نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔ لیکن اس سلسلے میں کلکتہ کنونشن میں مباحثہ شروع ہو گیا۔ محمد علی جناح نے پنجاب کی تعین نشست اور دوسرے مسائل یعنی اقلیتوں کی نمائندگی کے مسئلے پر وضاحت سے تقریر کی اور کنونشن سے ان مطالبات کو تسلیم کرنے کیلئے کہا۔ سر تیج بہادر سپرو نے اپنی تقریر میں محمد علی جناح پر ذاتی حملہ کرتے ہوئے انہیں Spoil Child تک بھی کہا۔ محمد علی جوہر نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح کے موقف کی پرزور تائید کی۔ لیکن مسٹر جیکر نے مسلم مطالبات کے خلاف تقریر کرتے ہوئے ان کی شدید مخالفت کی۔[86]

ہندو مہا سبھا، انتہا پسند ہندو اور مسٹر سین گپتا اس اصول کے حامی تھے کہ "ڈومینین اسٹیٹس" کو قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر ایک تقریر بھی کی۔ لیکن محمد علی نے اپنی تقریر میں اس نظریہ کی مخالفت کی۔ جذبات کی رو میں محمد علی نے یہاں تک کہہ دیا کہ :-

> "جو لوگ کامل آزادی کے مخالف اور درجہ مستعمرات کے حامی ہیں۔ وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں۔ بلکہ "بزدل" Coward ہیں۔"[87]

محمد علی کا یہ کہنا تھا کہ شدید ہنگامہ شروع ہو گیا۔ فقرے کسے گئے۔ اس ہنگامہ آرائی میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ محمد علی نماز کیلئے گئے تو انکی عدم موجودگی میں درجہ مستعمرات پاس ہو گیا۔ محمد علی اسقدر مایوس ہوئے کہ پھر اصرار کے باوجود بھی کنونشن میں نہ گئے۔ محمد علی کے ساتھ کنونشن میں جو سلوک ہوا۔ نہرو رپورٹ کے بعد ان پر غداری، قوم فروشی، تلون مزاجی کے الزامات لگائے گئے۔ انکے خلاف اعلان جنگ ہوا۔ اس بارے میں محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ :-

> "---پٹنہ میں جس طرح لڑ جھگڑ کر سمجھا بجھا کر، منت سماجت کر کے، دلائل و براہین دے کر، ہنسا ہنسا کر، رلا رلا کر میں نے مخلوط انتخاب کی تجویز کو منظور کرایا۔ اس سے بعض وہ پرانے احباب اور رفقائے کار ناواقف نہیں۔ جو آج مخالفین ہی نہیں بلکہ اعداء کے زمرے میں نظر آرہے ہیں۔ اور مجھ پر تبراء بھیج رہے ہیں۔ پھر کلکتہ کی خلافت کانفرنس کا کیا ذکر کروں؟ لیکن ہمارے مخالفین سب اصولوں کے پابند، حق گو اور حق پرست ہیں۔ اور ہم غدار ہیں، ہم مکار ہیں اوباش ہیں، غنڈے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کے دشمن ہیں، حکومت پرست ہیں اور حکومت پرستوں کے زیر سایہ زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہندو اخبارات سے

> اور روزانہ "زمیندار" سے تو شکایت کرنا ہی فضول ہے، انکے ایمان اور عمل صالح کا قائل ہی کون تھا؟ مگر جب عمر بھر کی دوستیاں کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور ہوں تو سوائے اناللہ واناالیہ راجعون پڑھنے کے چارا ہی کیا ہے؟ شکر خدا کہ کم از کم اسپر آج بھی اسی طرح یقین ہے جس طرح پہلے تھا۔ کہ ہمارے ہی صبر و شکر کیلئے یہ صلہ مقرر فرمایا گیا ہے کہ اولیک علیھم صلوٰۃ من ربھم رحمۃ۔"[88]

ان سب کے باوجود محمد علی مایوس نہیں ہوئے۔ ہندوؤں سے متنفر نہیں ہوئے۔ مصالحت کی کوشش جاری رکھی۔ کیونکہ یہی پالیسی مسلمانوں کیلئے سود مند تھی۔ وہ بد ظن تھے تو صرف انگریز حکومت سے جس سے نجات کیلئے رات دن جدوجہد کرتے رہے۔ محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ :۔

> "میں انگریز حکومت سے بیزار ہوں، میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں۔ میں تو انگریزی حکومت سے اسقدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کرلونگا۔ میں اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس ہندوؤں پر بھاری ہوتا ہے۔ کیا جنگِ بدر اور احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی۔ لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو!، میری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تقریروں اور تحریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا حامی ہوں۔"[89]

محمد علی اور انکے رفقاء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ انہیں کونشن میں شریک ہو کر اپنے مطالبات ضرور پیش کرنے چاہیے تھے، اسلیئے کہ مطالبات منظور ہونے کی امید بھی تھی اور اختلاف و افتراق وہیں ختم ہو جاتا۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی وزن نہیں۔ اس سے پہلے محمد علی نے مسلمانوں کے مطالبات منوانے اور اختلافات کو دور کرنے میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے تو انتہائی کوششیں بھی کر دیکھیں۔ مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اب ایسی کونسی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ جن میں محمد علی کے پیش کردہ مطالبات کو تسلیم کرنے کی امید بر آئی تھی۔ اس قسم کے بلاوجہ اعتراضات کا مقصد محمد علی کی مخالفت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ محمد علی کے علاوہ کتنے تھے جنہوں نے ایسا کیا۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس کلکتہ تک نہرو رپورٹ کی مخالفت نہ کی۔ مسٹر جناح جو مسلم لیگ کی کونسل کے صدر تھے، خاموش تھے۔ مسٹر چھاگلہ لیگ کے سرگرم رکن، آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے نہرو رپورٹ کی حمایت میں سخت جدوجہد کی اور مسلمان قوم کی مخالفت مول لی۔ مہاراجہ محمود آباد نہرو رپورٹ اور مخلوط انتخاب کے زبردست حامی تھے۔

انہی کی کوششوں سے آل پارٹیز کانفرنس کا لکھنؤ میں شاندار جلسہ ہوا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر محمد علی کے مقابلے میں صرف اسلیئے فتح حاصل کی تھی کہ نہرو رپورٹ مسلمانوں سے منوا سکیں۔ سر علی امام (1869ء -1932ء) بھی نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔ انہوں نے رپورٹ کی حمایت کر کے مسلمانوں کی مخالفت بھی برداشت کی۔[90] صاف ظاہر تھا کہ نہرو رپورٹ ہندووانہ ذہنیت اور تعصب سے لبریز ہے۔ جسکا مطلب اکثریتی قوم کا اقلیتی قوم پر غالب آنا ہے۔ مسلمانوں نے جو جائز مطالبات کئے تھے۔ ہندوؤں نے نہرو رپورٹ میں ان سب کو رد کر دیا تھا۔ ایسے میں مسلم لیڈروں کا نہرو رپورٹ کی غیر مشروط حمایت کرنا خود غرضی اور بے حسی سے کم نہ تھا۔

کنونشن اور اسکے متعلقات کے بارے میں محمد علی کے تاثرات "روداد چمن" کے عنوان سے "ہمدرد" میں شائع ہوئے۔ جس میں وہ تمام اسباب ہیں جنکی وجہ سے محمد علی کنونشن سے بیزار اور کانگریس سے مایوس ہو کر بالآخر علیحدہ ہو گئے۔ اس شعر کی پیروی کرتے ہوئے کہ :-

ع   نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
    ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

محمد علی کی ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کے باہمی انتشار و افتراق کو ختم کرنے کیلئے کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے مسٹر نہرو تحریر کرتے ہیں کہ :-

"----ہندوستان کی آزادی کے وہ (محمد علی جوہر) دل سے شیدائی تھے۔ اس بنا پر اسکا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جاتا۔ جو دونوں فریقوں کو پسند ہوتا۔ سیاسی حیثیت سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ ورانہ مفاد کے علمبردار بنتے تھے، کوسوں دور تھے۔"[91]

وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ :-

"یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ وہ (محمد علی جوہر) 1928ء کی سرگرمیوں میں یورپ چلے گئے اور اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل حل کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے۔ لیکن انکے واپس آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ آئے تو ناچار انہیں مخالف گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔"[92]

مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں محمد علی کی شرکت

نہرو رپورٹ اور آپس کے اختلافات کے نقصان نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔ اور انہیں ایک مرکز پر جمع ہونے کا خیال آیا۔ جداگانہ انتخاب کے نظریہ کے حامی راجہ سلیم پور سید احمد علی خان (1891ء -1964ء)، نواب محمد یوسف، نواب چھتاری، مسلم زمینداروں اور تعلقداروں نے سر آغا خان کو دعوت دی کہ وہ 21 دسمبر 1928ء کو ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت کریں۔ یہ تاریخ خصوصاً اسلیئے متعین کی گئی تھی کہ مسلم لیگ اور آل پارٹیز کلکتہ

کنونشن کے لوگ بھی اس میں شریک ہو سکیں۔ اس جلسہ میں محمد علی، شوکت علی، نواب اسمٰعیل خاں اور دیگر غور و فکر کرنے والے اشخاص نے شرکت کی۔ مسلم لیگ، جمعیت العلماء ہند، اور خلافت کانفرنس کے نمائندے شامل ہوئے۔ اور سب نے ملکر نہرو رپورٹ کو رد کر دیا۔ اس کانفرنس میں چودہ نکاتی تجویز قبول کی گئی۔ جس میں تمام مسلم مطالبات کو شامل کیا گیا تھا۔[93]

1. حکومت ہند کا دستور وفاقی ہو گا۔
2. باقی ماندہ اختیارات صوبوں اور ریاستوں کے ہونگے۔
3. فرقہ وارانہ نوعیت کا کوئی ایسا بل پیش نہ ہو گا۔ جسکی تین چوتھائی ممبر مخالفت کریں۔
4. مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق قائم رہے گا۔ تاآنکہ وہ خود اس سے دستبردار نہ ہوں۔
5. مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی $33\frac{1}{4}$ فی صد (سوا تینتیس فی صد) ہو گی۔
6. مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں نمائندگی موجودہ بنیاد پر قائم رہے گی۔
7. کسی صوبے کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ اسکو مساوی بنایا جائے گا۔
8. بلوچستان اور صوبہ سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔
9. سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔
10. مسلمانوں کیلئے ملازمتوں میں نشستوں کا تعین کیا جائے۔
11. مسلمانوں کی ثقافت، زبان، مذہب، تعلیم، قوانین، اور اوقاف کا تحفظ ہو۔
12. حکومت کے محکمہ تعلیم میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔
13. ہندوستان کے دستور میں صوبوں کی منظوری کے بغیر کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔
14. ہندوستانی ریاستوں کی منظوری کے بغیر ہندوستان کے دستور میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

یہ کانفرنس کامیاب رہی۔ دراصل اسکی کامیابی کی وجہ جداگانہ نیابت کا مطالبہ تھا۔ بقول خلیق الزماں :۔

> "غدر کے بعد مسلمانوں نے اگر کوئی قیمتی حق انگریز سے پایا تو وہ صرف جداگانہ انتخاب تھا۔ جمہوریت ایک بیل کی طرح ہے جو پھیلتے پھیلتے تھوڑے ہی عرصے میں ہر سیاسی صنفِ زندگی کو گھیر لیتی ہے۔ اور اگر ایک مرتبہ مخلوط انتخاب آجاتا تو مسلمانوں کا سیاست میں کہیں پتہ نہ چلتا۔"[94]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلکتہ مسلم لیگ کے اجلاس نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے کو نامنظور کر دیا تھا۔ (جنوری 1929ء میں مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی بصدارت سر آغا خان منعقد ہوئی)

اجلاس مسلم لیگ دہلی مارچ 1929ء

سیاسی میدان میں مسلمانوں میں دھڑے بندی جاری تھی۔ جناح لیگ اور شفیع لیگ دو مخالف گروہوں کی

حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ محمد علی، مسٹر جناح کے ساتھ ملکر ان دونوں لیگوں کو متحد کرنے میں کوشاں رہے۔ مسٹر جناح نے اس سلسلے میں مارچ 1929ء کو مسلم لیگ کا اجلاس دہلی بلوایا۔ لیکن محمد علی جناح کو جلسے گاہ پہنچنے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ کیونکہ وہ جداگانہ انتخاب کے حامی لوگوں سے گفت و شنید کیلئے حکیم اجمل خان کے گھر چلے گئے تھے۔ اس اثناء میں چودھری خلیق الزماں گروپ یعنی نیشنلسٹ حضرات نے ڈاکٹر عالم کو صدر منتخب کر کے جلسہ کی کاروائی شروع کر دی۔ سر محمد یامین (1886ء -1966ء) نے اپنی کتاب "نامۂ اعمال" میں اس اجلاس کے واقعہ سے متعلق تمام کاروائی تفصیلاً تحریر کی ہے۔[95] تھوڑی دیر بعد محمد علی جناح نے آکر جلسہ کی صدارت سنبھال لی۔ جس میں آل پارٹیز دہلی کے تمام مطالبات من و عن مان لئے گئے۔ سوائے ایک ترمیم کے کہ اگر دیگر (تیرہ) مطالبات ہندو مان لیں۔ تو مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کو چھوڑ کر مخلوط انتخاب قبول کر لے گی۔ لیکن کانگریس، گاندھی، اور ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر مونجے وغیرہ نے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے حسبِ روایت ان تمام مطالبات کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے مسترد کر دیا۔ یہی وہ مطالبات تھے جو تاریخ میں مسٹر جناح کے "چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئے۔ جنھیں محمد علی جوہر کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

محمد علی کی کوششیں رنگ لائیں۔ آخر کار شفیع لیگ اور جناح لیگ نے دوبارہ یکجا ہو کر اپنے اختلافات ختم کر دیے۔ اور مشترکہ جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ نہرو رپورٹ کی یہ جوابی تجاویز مسلم قوم کے جذبات اور مطالبات کی آئینہ دار تھیں۔ لیکن کانگرس نے انہیں شرفِ قبولیت نہ بخشا۔ ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر مونجے نے ان نکات کو ہندوستانی قومیت کی روح کے منافی اور سندھ کی علیحدگی کو عیاشی قرار دیا۔ اور کہا کہ ہندو اس کو کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ ان نکات نے نہرو رپورٹ کا بھرم کھول دیا اور مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے نکال کر صحیح منزل کی طرف گامزن کر دیا۔ گویا یہ دونوں قوموں کے درمیان ہمیشہ کی علیحدگی کا نقطۂ آغاز تھا۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی کا قیام 1929ء اور محمد علی کی مخالفت

مسلم لیگ سے خارج ہونے والوں نے ایک علیحدہ پارٹی بنانے کا سوچا۔ موتی لال نہرو بھی چاہتے تھے کہ کوئی دوسری پارٹی بن جائے جو نہرو رپورٹ کی حمایت کرتی رہے۔ 5 جولائی 1929ء کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں چودھری خلیق الزماں اور دیگر لوگوں نے نئی پارٹی بنانے کا مشورہ دیا۔ لہذا جولائی 1929ء میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ طفیل احمد منگلوری کے مطابق اسکے صدر ابوالکلام آزاد اور سیکرٹری تصدق احمد خان شیروانی تھے۔[96] لیکن چودھری خلیق الزماں نے تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اس پارٹی کے صدر اور میں (خلیق الزماں) سیکریٹری تھا۔ بقول خلیق الزماں

> "طفیل احمد منگلوری نے عام کانگریسی ذہنیت کی تعمیل میں ہر جگہ میرا نام حذف کرنا اپنا تاریخی فرض سمجھا ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کس جرم کی پاداش میں اس سلوک کے مستحق ٹھہرے۔"[97]

محمد علی اس نئی پارٹی کے قیام کے شدید مخالف تھے۔ شفیع لیگ اور جناح لیگ کو متحد کرنے میں کامیاب ہوئے تو مسلم لیگ ہی

کے ناراض لوگوں نے فشاری گروپ یا پریشر گروپ کے طور پر مسلم نیشنلسٹ پارٹی قائم کر لی۔ یہ پارٹی ہر حال میں کانگریس کی ہم خیال و ہمنوا رہی۔ اسکے نمایاں اراکین میں مولانا آزاد اور شیروانی کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب، خان عبدالصمد خان، ڈاکٹر سید محمود، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، آصف علی، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم، مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر محمد عالم وغیرہ تھے۔[98] یہ تمام وہ حضرات تھے جن میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک جماعت تھی۔ اس بارے میں جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ :۔

> "----بلکہ یوں کہیے ہندوستان کے سب سے مشہور اور ہر دلعزیز مسلمان لیڈر کانگریس کے ساتھ تھے۔ ان کانگریسی مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت "قوم پرست مسلم پارٹی" کے نام سے ترتیب دی اور فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کا مقابلہ کیا۔ شروع شروع میں تو انہیں کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ اور تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک بڑا حصہ انکے ساتھ ہو گیا۔ لیکن وہ سب اونچے، وسط طبقے کے لوگ تھے۔ اور ان میں کوئی موثر شخصیت نہ تھی۔ وہ اپنے پیشے اور کاروبار میں لگ گئے۔ اور انہیں عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو کبھی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مشورے اور معاہدے کرتے تھے مگر اس کام میں انکے حریف یعنی فرقہ پرست زیادہ ماہر تھے۔"[99]

جب بااثر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ آئے دن انجمنیں بنانا اور پھر جب انکی مطلب براری پوری نہ ہو تو انہیں بے اثر کر دینا ایسے لوگوں کا مشغلہ بن چکا ہو۔ آئے دن مختلف الخیال پارٹیاں مقابل آجائیں تو آپس کے اتحاد و اتفاق کی بجائے جگ ہنسائی اور اغیار کو مضبوط ہونے کا موقع ملتا ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ مسلمان انتشار کا شکار رہے اور ہندو اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان حالات میں محمد علی کی مجاہدانہ کاوشوں کا ناکام ہونا یقینی امر تھا۔ محمد علی مسلمانوں میں آئے دن پارٹیاں بننے کے خلاف تھے۔ انکا کہنا تھا کہ یہ چیزیں مسلمانوں کو کمزور اور منتشر کر رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو جماعتیں قائم ہیں انکو مضبوط بنایا جائے اور مسلمان آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔ کیونکہ جب تک مسلمان اتحاد پیدا نہیں کریں گے۔ ہرگز اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

علماء کانفرنس کی تاسیس

محمد علی کی وفات سے ایک سال قبل اسکی تاسیس ہوئی۔ اسکے قیام کی ضرورت اس وقت پیش آئی۔ جب جمعیت العلماء ہند کانگریس کی ہمنوا ہو گئی۔ ان حالات میں کچھ علماء الگ جمعیت کی تاسیس کیلئے فکر مند ہوئے۔ ان علماء میں مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالکافی (1858ء-1930ء)، علامہ ثقہ الاسلام بمبئی، مولانا قطب الدین لکھنؤ، مولانا اعجاز حسین لکھنؤ، اور مولانا فاخر الہ آبادی وغیرہ سرفہرست تھے۔ جنھوں نے کانپور میں ایک جدید جمعیت العلماء کی بنیاد رکھی۔ جسکا صدر محمد علی جیسے شیفتۂ مذہب کو بنایا گیا۔[100] بقول سر یعقوب علی

"محمد علی کی زندگی کے سب سے نمایاں اور درخشندہ دو کارنامے ہیں۔ ایک مسلمانوں کی مذہبی جماعت میں بیداری اور سیاسی احساس پیدا کرنا---لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ گوشہ عزلت میں بیٹھنے والے علماء اسلام کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانا محمد علی ہی کی جادو اثر کوششوں کا نتیجہ تھا۔ علماء اسلام کے جادۂ عمل میں اس انقلاب کے پیدا ہونے سے جو محشر خیز نتائج آئندہ پیدا ہونگے وہ ہمیشہ اس ملک کی تاریخ میں محمد علی کے نام کے ساتھ منسوب کئے جائیں گے۔"[101]

علماء نے محمد علی کی سیاست پر اعتماد کیا۔ انہیں اپنا قائد سمجھا۔ لیکن اس جمعیت کے کچھ محترم ارکان سیاست کے فن سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے اس جمعیت العلماء کو بدنام کرنا شروع کر دیا کہ یہ محمد علی کی تابع مہمل ہے۔ اسکے ارکان محمد علی سے لرزتے ہیں۔ محمد علی سندیافتہ عالم نہیں ہیں۔ جید علماء کی موجودگی میں انکی صدارت وقیادت بے معنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ محمد علی عربی نہیں جانتے تھے۔ لیکن وہ برابر اپنے شکوک حضرت مفتی صاحب، مولانا احمد سعید وغیرہ سے رفع کر لیا کرتے تھے۔ وہ عالم بے عمل نہیں تھے۔ لیکن مخالفین کو تو جواز چاہیئے تھا۔ غرضیکہ اس قسم کے رکیک اور گھٹیا حملے کر کے جمعیت علماء کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس پروپیگنڈے کا یہاں تک اثر ہوا کہ بقول رئیس احمد جعفری

"میں نے خود جمعیت کے ایک محترم رکن سے یہ شکایت سنی کہ کوئی "عالم" بھی آج تک خلافت کا صدر ہوا ہے۔ پھر ہم محمد علی کو جمعیت کا صدر کیوں بنائیں۔؟"

پروپیگنڈہ رنگ لایا۔ مراد آباد کے جلسہ میں محمد علی کی صدارت کے خلاف فیصلہ ہوا۔ جسکا محمد علی کو صدمہ ہوا کہ انکو صدارت سے صرف اسلیئے محروم کیا گیا کہ وہ سندیافتہ عالم نہیں ہیں۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محمد علی کی قابلیت اور عربی استعداد پر بھی حملے کئے گئے۔ کہ محمد علی تو قرآن شریف تک غلط پڑھتے ہیں۔ وہ صدرات کیا کریں گے۔ گویا صدارت کیلئے خلوص و محبت، جدوجہد، جرات اور رواداری کی بجائے صرف ونحو کی قابلیت ضروری تھی۔ آخر صدارت کیلئے ہندوستان کے مشہور و مخدوم محترم مولانا معین الدین (1880ء-1940ء) کا انتخاب ہوا۔ وہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ انہوں نے نہ صرف صدارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ جمعیت کی ممبر شپ سے بھی استعفیٰ دے دیا۔[102]

جدید جمعیت العلماء

لوہا گرم تھا۔ برداشت وتحمل ختم ہو چکا تھا۔ محمد علی کے رفقاء جنہوں نے صدارت کیلئے محمد علی کا نام دیا تھا۔ انہوں نے اسے اپنی توہین قرار دیا اور کہا کہ جب جمعیت العلماء کا دائرہ اسقدر تنگ ہے کہ اسکے صدر محمد علی جیسے مجاہد راہ حق، عاشق رسول ﷺ، شیفتہ مذہب، جانباز اسلام اور وسیع النظر عالم نہیں ہو سکتے۔ تو یقیناً ایک جدید جمعیت کی ضرورت ہے جس میں اسقدر تنگ دلی کا مظاہرہ نہ ہو۔ لہذا کانپور میں ایک جدید جمعیت العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دسمبر 1929ء میں

علماء کانفرنس کا اجلاس غیر دخوبی محمد علی کی صدارت میں ہوا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے محمد علی کا نام صدر کیلئے پیش کیا۔[103]
وقت کا تقاضا اور دانشمندی تو یہ تھی کہ یہ علماء سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے۔ آپس میں لڑنے اور جمعیت پر جمعیت پر بنانے کی بجائے مفاہمت کر لیتے۔ صدارت کو انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے عام ممبران کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مزید ٹکڑوں میں بٹتے چلے گئے۔ یہ بکھرے ہوئے تسبیح کے دانے متحد ہندوؤں اور منظم انگریزی حکومت کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ محمد علی جنگی جدوجہد اور کوششوں کا مقصد انگریزی حکومت سے نجات تھا۔ ان کے نزدیک اگر ہندو مسلم اتحاد وقت کی اہم سیاسی ضرورت تھی۔ تو مسلمانوں کا آپس کا اتحاد اہم قومی ضرورت تھی۔ لیکن اب وہ بےبس ہو چکے تھے۔ انکی صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انکے اپنے رفقاء بھی نظریاتی اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ محمد علی خرابی صحت کی وجہ سے دوسروں کے محتاج تھے۔ وہ سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ اس تمام بگاڑ کی وجہ مذہبی بے راہ روی کو گردانتے تھے۔ انہوں نے جدید جمعیت العلماء کے خطبہ صدارت میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

> "اگر ہم نے عہد حاضر کے فتنوں کا نور ونار لا الہ سے مقابلہ کیا ہوتا۔ اور اجتہاد و جہاد دونوں کو جاری رکھا ہوتا۔ توآج ہم اس زمانۂ انحطاط تک نہ پہنچے ہوتے۔"[104]

اگرچہ محمد علی مخالفتوں کے گرداب میں پھنس چکے تھے۔ انکی صحت کافی بگڑ چکی تھی۔ لیکن پھر بھی ملک و قوم کی بہتری کے لیے کوشاں رہے۔

محمد علی کی گاندھی کو مشروط تعاون کی پیشکش

دسمبر 1929ء میں کانپور کی علماء کانفرنس کے بعد محمد علی نے لاہور کا رخ کیا۔ جہاں قومی ہفتہ منایا جارہا تھا۔ کانگریس اور خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کا یہ سالانہ اجلاس بڑا اہم تھا۔ کلکتہ میں گاندھی نے وائسرائے اور برطانیہ کو درجہ مستعمرات کے قیام کیلئے جو ایک سال کی "مہلت" دی تھی۔ وہ ختم ہو گئی تھی۔ اور اب دریائے راوی کے کنارے "کامل آزادی" کا پرچم لہرایا جانے والا تھا۔ محمد علی نے لاہور میں گاندھی سے ملاقات کر کے مسلمانوں کے مطالبات منظور کرنے کو کہا کہ اگر مسلمانوں کی شکایات رفع کر دیں تو ہمارا اشتراک عمل حاصل کر سکتے ہیں۔ اور دونوں ہم آہنگی سے ساتھ دیتے ہوئے اکٹھے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔[105]

گاندھی جواب "کامل آزادی" کے خیال میں تھے اور اپنی راہ میں کسی قسم کی پابندیاں برداشت نہیں کر سکتے تھے، محمد علی سے کہا کہ اس وقت توآپ لوگ غیر مشروط طور پر ہمارا ساتھ دیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد آپکے مطالبات پر غور کیا جائے گا اور حقوق کی تقسیم ہوتی رہے گی۔ لیکن ابھی یہ ناممکن ہے۔[106] وہ مسلمان جو کانگریس کے ہمنوا تھے۔ انہوں نے خلافت کانفرنس میں محمد علی پر دباؤ ڈالا کہ غیر مشروط طور پر کانگریس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن اب محمد علی ہندوؤں اور گاندھی کی چالوں کو سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے غیر مشروط تعاون سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ تحریک خلافت

کے دوران غیر مشروط اشتراک کا انجام دیکھ چکے تھے۔

محمد علی کے انکار پر اختلافات میں اور شدت آگئی۔ خلافت کانفرنس میں بھی اختلاف اسقدر بڑھ گیا کہ محمد علی پر رجعت پسندی کا الزام لگایا گیا۔ الٹی گنگا بہہ رہی تھی کہ جب محمد علی کانگریس کے ساتھ غیر مشروط اتحاد کے حامی تھے۔ تب ان پر جانبداری کا الزام لگا کر انہیں بدنام کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ اب جبکہ وہ غیر مشروط اشتراکِ عمل کے حق میں نہیں تھے۔ تو ان پر رجعت پسندی کا لیبل لگا کر انہیں بدنام کرنا شروع کر دیا۔ دراصل محمد علی نے ایک طویل عرصہ گاندھی کے ساتھ ملکر جدوجہد کی۔ انپر اندھادھند اعتماد کیا۔ انہیں مسلمانوں کا مخلص سمجھتے رہے۔ اب آخری عمر میں محمد علی پر گاندھی کا اصل روپ ظاہر ہوا تھا۔ اگر اب بھی وہ محتاط نہ ہوتے اور گاندھی کی غیر مشروط اشتراکِ عمل کی بات کو مان لیتے۔ تو نتیجہ یہ نکلتا کہ کامیابی کے بعد ہندو ہمیشہ کے لیے تمام جگہوں پر قابض ہو جاتے۔ اور مسلمانوں کو مزید محرومی کی طرف دھکیل دیتے۔ بعد ازاں جسکا مظاہرہ انہوں نے کانگریسی دورِ وزارت 1939ء میں کیا۔

محمد علی نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا بیج بو دیا۔ انہیں اپنے حقوق کی طلبی کیلئے جدوجہد کی راہ پر گامزن کیا۔ ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار کیا۔ اگر اب وہ اپنے ضمیر کی پیروی میں کانگریس سے الگ ہو گئے تو اسکے یہ معنی نہیں تھے کہ وہ رجعت پسند ہو جاتے یا حکومت کے دامِ فریب میں پھنس جاتے۔ محمد علی پر درج ذیل شعر کیا خوب صادق آتا ہے کہ :۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش سے
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

گول میز کانفرنس میں محمد علی کی شرکت

محمد علی اپنی زندگی کی آخری منازل میں گاندھی کی ذہنیت اور ہندووانہ عزائم سے آگاہ ہو گئے تھے۔ اسلیئے جب ہندوؤں نے اپریل 1930ء میں مسٹر گاندھی کے زیرِ کمان سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ تو محمد علی نے اس تحریک کی شدید مذمت کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا۔ گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک کے ساتھ ہی تشدد اور مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پہلے مرحلے میں نمک قوانین کی خلاف ورزی کی۔ ہزاروں نے ساحلی علاقوں سے نمک اکٹھا کیا اور جیل گئے۔ سوائے صوبہ سرحد کے، جہاں خان عبدالغفار خان (1881ء -1988ء) اور ان کے ساتھیوں نے ایک یادگار تحریک چلائی، باقی علاقوں میں مسلمان تحریک میں بہت کم شامل ہوئے۔[107] تحریکِ سول نافرمانی کے روحِ رواں وہی گاندھی تھے، جو تحریکِ خلافت کے دوران عدم تشدد کی پالیسی پر گامزن تھے۔ اور چوراچوری کے معمولی واقعہ کو تشدد کا بہانہ بنا کر تحریک کو ختم کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ محمد علی نے آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس کے جلسہ منعقدہ اپریل 1930ء بمقام بمبئی تحریک سول نافرمانی کی مخالفت کرتے ہوئے بڑی صاف گوئی سے کہا کہ جسطرح مسلمان برطانوی غلبے کے خلاف ہیں اسی طرح وہ ہندو غلبے کے بھی خلاف ہیں۔ بقول محمد علی

"ہم مسٹر گاندھی کے ساتھ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ انکی تحریک

ہندوستان کی مکمل آزادی کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو مہا سبھا کا ماتحت بنانے کیلئے ہے۔"[108]

وائسرائے لارڈ ارون (بحیثیت وائسرائے ہند 1926ء - 1931ء) صلح کل کے حامی تھے۔ انہوں نے تمام ہندوستانیوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو گول میز کانفرنس کے انعقاد کی طرف متوجہ کیا۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی وجہ سے پہلی گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ مگر غیر کانگریسی ہندوؤں نے شرکت کی۔ جن میں سر تیج بہادر سپرو، جیکر اور ڈاکٹر مونجے نمایاں تھے۔[109] مسلمان رہنماؤں میں لارڈ ارون (1881ء - 1959ء) کی دعوت قبول کرنے والے سر آغا خان، محمد علی، شوکت علی، مسٹر محمد علی جناح، سر ہدایت اللہ، سر عبدالقیوم (1864ء - 1937ء)، سر شاہنواز بھٹو (1875ء - 1938ء)، سر محمد شفیع اور پنجاب کے سر فضل حسین تھے۔ (جو اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔)[110]

محمد علی شدید خرابیٔ صحت کے باوجود کانفرنس میں شرکت کیلئے بے تاب تھے۔ 20 ستمبر 1930ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کو تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"اب تک صاحب فراش ہوں، کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں، بلکہ بہت سے مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنا پڑے گی۔ اور تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا---- لیکن اسپر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطانِ جابر اور رعایا دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں۔ تاآنکہ اسی کام میں مر جاؤں ----"[111]

جب محمد علی سے پوچھا گیا کہ کیا آپکو یقین ہے کہ گول میز کانفرنس آپکے مطمعِ نظر کو پورا کر دے گی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ :۔

"میں اس شخص کو عقل مند نہیں سمجھتا۔ جو اس اصول پر عامل نہ ہو کہ جو کچھ آسانی سے مل رہا ہو، اسکو لینے سے انکار کر دے۔ اور صرف اپنے مطمعِ نظر کو پیشِ نظر رکھے۔ میرا مطمعِ نظر کامل آزادی ہے۔ لیکن مجھے اگر کوئی ایسی چیز حاصل ہوتی ہو، جو کم از کم آزادی کامل کے حصول میں مدد دے سکتی ہو۔ تو میں ایک ہاتھ سے اسکو لیکر جیب میں رکھ لونگا۔ اردوسرا ہاتھ میز پر مار مار کر مطالبہ کرونگا کہ میرا سوال پورا نہیں ہوا۔"[112]

محمد علی کا نظریہ تھا کہ مایوسی کفر ہے۔ محنت و کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اسلیئے ہمت نہ ہاری۔ وہ پرامید تھے کہ یقیناً مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیاں رنگ لائیں گی۔ اسی امید پر شدید خرابی صحت کے باوجود گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے طویل ترین سفر کیا۔ محمد علی نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی وجوہات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تین

وجوہ کی بنا پر گول میز کانفرنس میں شرکت کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اول۔ اس وجہ سے کہ مجھے امید ہے کہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان کو ایسی اصلاحات ملیں گی۔ جن سے ہندوستان بیس سال کے اندر آزادی کامل حاصل کرنے کی طاقت حاصل کرلے گا۔ اگر اس قسم کی اصلاحات حاصل ہوگئیں تو سمجھوں گا کہ گول میز کانفرنس کامیاب ہوگئی۔

دوم۔ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک یا اسکے اندر فرقہ وارانہ مفاہمت کی کوشش کرونگا اور چاہوں گا کہ مسلمانوں کے جائز اور معقول مطالبات آئینی طور پر تسلیم کرلئے جائیں۔ اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو آزادی کامل کی منزل تک پہنچنے کیلئے سب سے پہلا شخص میں ہوں گا۔ جو مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے آپکو جنگ آزادی میں جو دس سال کے اندر ہونے والی ہے، آگے آگے لے جاؤنگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ قابل اطمینان طریق پر طے ہوگیا تو مسلمانوں کے دل کا کانٹا نکل جائے گا اور وہ حقیقی آزادی کی جنگ میں سب سے آگے ہوں گے۔

سوئم۔ میں ہندوستان اور اپنی قوم کے مسئلہ کو ایک دفعہ ورلڈ پلیٹ فارم پر زیرِ بحث آتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ لندن میں ہندوستان کی گول میز کانفرنس ایک ورلڈ پلیٹ فارم ثابت ہوگی۔

گول میز کانفرنس محمد علی کے مقصدِ حیات کا آخری مرحلہ تھی جس میں انہوں نے طویل ترین تقریر کی اور انگریزوں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں یہاں سے آزادی لیکر جاؤنگا یا آپکو میری قبر کیلئے جگہ دینی پڑے گی۔ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤنگا۔ پہلی گول میز کانفرنس کی صدارت لارڈ سینکی نے کی۔ محمد علی نے تقریر کے دوران لارڈ سینکی کو مخاطب کر کے کہا کہ :۔

> "مائی لارڈ ! فی زمانہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کا دستور عام ہوگیا ہے۔ مگر ہندوستان میں ہم تقسیم ہوتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں۔"[113]

یہ محمد علی کی ذہانت کا اعجاز تھا کہ انہوں نے مختصر جملے میں انگریزی دور کی ساری سیاست کا نقشہ کھینچ دیا۔

انہوں نے مسلمانوں کی آزادی اور انکے دیگر مسائل کو بنیادی طور پر مد نظر رکھا۔ اس سلسلے میں جو منصوبے انکے زیرِ غور تھے وہ انہیں ضبط تحریر میں لائے۔ 3 جنوری 1931ء کو سر عبدالقیوم سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کی۔ اور مشورہ دیا کہ کسی مفاہمت کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے۔ جب تک صوبہ سرحد کے مطالبات پورے نہ ہوں۔ صوبہ سندھ سے متعلق سر شاہنواز بھٹو سے باتیں کیں۔ 3 جنوری کو ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے حقوق سے متعلق برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ (1866ء-1936ء) کے نام خط لکھوایا۔ مختصر یہ کہ اس دوران انتہائی مصروف رہے۔ انتقال کی رات بڑی مستعدی اور انہماک سے مسلمانوں کی ترقی و کامیابی کے منصوبے بناتے رہے۔ 4 جنوری 1931ء کا آزردہ خاطر سورج جب طلوع ہوا تو محمد علی 52 سال کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس مردِ حق آگاہ کے سانحۂ ارتحال سے دنیائے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ 5 جنوری کو 6 بجے شام ہیڈ نگٹن ٹاؤن ہال میں محمد علی کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے محمد علی کی تکفین و تدفین کیلئے اپنے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی مقدس سرزمین کا انتخاب کیا۔ 24 جنوری کو انہیں بیت المقدس میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

؎ ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

محمد علی کی وفات پر علامہ اقبال نے درج ذیل اشعار میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

؎ یک نفس جاں نزار اوتپید اندر فرنگ
تامژہ برہم زنیم ازماہ پر دیں در گزشت
جلوۂ او تاابد باقی بہ چشم آ سیاست
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گزشت

ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہو تا ہے جو اسکی دلیل بن جاتا ہے۔ کسی بھی عمل میں وقتی ناکامی، کامیابی کی دلیل بن جاتی ہے۔ تحریکِ خلافت ہی کو لے لیں۔ اگرچہ ظاہری و وقتی مقصد کے حصول میں ناکام رہی۔ لیکن اس نے مسلمانانِ ہند کو بیدار کر کے حقیقی اور مستقل مقصد "آزادی" کیلئے جدوجہد کی راہ پر گامزن کر دیا۔ محمد علی فوری طور پر مسلمانوں کے باہمی انتشار و نفاق کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جلد ہی مسلمانوں کو احساس ہو گیا کہ اتحاد و یکجہتی کے بغیر وہ اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ لہذا انہوں نے محمد علی کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے اتحاد و قومی تنظیم کی راہ اختیار کی۔ اور محمد علی کے دیئے ہوئے خطوط پر چل نکلے۔ اگر محمد علی حیات ہوتے تو یقیناً آزادی کے ہراول دستے کا کام دیتے۔ اصل کام نشانِ منزل اور اسکے حصول کیلئے راہوں کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ وہ محمد علی نے کر دیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے انہی راہوں پر چل کر اس منزل یعنی آزادی کو پالیا۔ یہ وہی درخت تھا۔ جسے محمد علی نے لگایا۔ دوسروں نے سینچا اور فیض پایا۔ ہر چیز کی تکمیل ارتقائی منازل سے گذر کر ہی ہوتی ہے۔ کمال تو مضبوط بنیاد فراہم کرنا ہے۔ اگر بنیاد ہی مضبوط نہ ہو تو اسپر پائیدار عمارت کیسے تعمیر ہو سکے گی۔ لہذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ محمد علی جوہر آزادی کی مضبوط بنیاد فراہم کر گئے۔ بفضلِ تعالیٰ دیگر رہنماؤں نے اسی بنیاد اور انہی خطوط پر چل کر "آزادی" کی مستحکم و پائیدار عمارت قائم کی۔ جسکی عملی تعبیر قیامِ پاکستان ہے۔

حوالہ جات

1 - K.K Aziz : ***Britain & Muslim India.*** (London-1963) P-89

II - محمد امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.211

III - ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ جلد نمبر7 شمارہ نمبر8 جنوری-1990ء ص ص47-45

2 - احمد سعید : حصول پاکستان۔ (لاہور-1986ء) ص.128

II- معین الدین عقیل : مسلمانوں کی جدوجہد آزادی۔ (لاہور-1981ء) ص ص.104-07

III- روزنامہ : جسارت۔ کراچی۔ 4جنوری-1985ء (مولانا مودودی : مولانا محمد علی جوہر) ص.5

3 - ابو سلمان شاہجہانپوری : مولانا محمد علی اور انکی صحافت ۔ (کراچی-1983ء) ص.39-40

II- عبدالماجد دریابادی : خطوط مشاہیر۔ (لاہور-1944ء) ص ص.282-87

III- رفیق غوری : جب پاکستان بن رہا تھا۔ (لاہور-1982ء) ص ص.106-07

IV- S.Hasan : ***Mohammad Ali : Ideology and Polltics.*** (Delhi-1981)PP-205-06

4 - Choudhry Khaliquzzaman : ***Path way to Pakistan.*** (Karachi-1993) PP-75-85

II- S.M. Ikram : ***Modern Muslim India and the Birth of Pakistan.*** (Lahore-1977) PP-227-28

III- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.239-41

5- M.Hasan : ***Nationalism and Communal Politics in India.1916-1928.*** (Delhi-1979) PP-132-35

II- I.H.Qureshi : ***Ulama in Politics.*** (Karachi-1972) PP-203-11

6 - سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.154

II- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ جلد نمبر10 شمارہ نمبر8 جنوری-1993ء ص ص.115-22

7 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.355-56

II- Afzal Iqbal : ***(Ed) Select Writings and Speeches of Moulana Mohammad Ali.*** (Lahore-1963) PP-259-61

III- Allah Bakhsh Yusufi : ***Moulana Mohammad Ali Jouhar.*** (Karachi-1984) PP.225-28

8 - محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940ء) ص.282

II - عبدالماجد دریابادی : محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول۔ (اعظم گڑھ-1952ء)
ص.172

Kh. Jamil Ahmad : ***Hundered Great Muslims.*** (Lahore-1984) PP-480-85 -III

Shan Mohammad : ***The Indian Muslims-1900-1947.*** (Delhi-1983) -IV
Vol-VIII Section-11 PP-500-22

V- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ شمارہ نمبر8 جلد نمبر2 جنوری-1988ء ص ص.79-77

VI- روزنامہ : جنگ۔ کراچی۔ 20-21-22-23-25-26اپریل-1980ء (ڈاکٹر ریاض الحسن :
مولانا محمد علی اور مسٹر گاندھی۔ چھ مکمل اقساط)

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-289-92 - 9

II - سید صباح الدین عبدالرحمٰن : مولانا محمد علی کی یادمیں۔ (اعظم گڑھ-1982ء)
ص ص.52-151

III- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ جنوری-1985ء ص ص.67-63

10 - جواہر لعل نہرو : میری کہانی۔ (لاہور-1996ء) ص ص.17-215

11- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940ء) ص.282

II- محمد رفیق غوری : جب پاکستان بن رہا تھا۔ (لاہور-1982ء) ص.117

12 - روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 7مارچ-1925ء

II- رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد-1943ء) ص ص.98-97

13 - چودھری خلیق الزماں : شاہراہ پاکستان ۔ (کراچی-1967) ص ص.37-436

J. Ahmad : ***Historic Documents of the Muslims Freedom Movement.*** - II
(Lahore-1970) PP-121-23

Jamil -Ud- Ahmad : ***Early Phase Muslim Political Movement.*** -III
(Lahore-1965) PP-123-27

Rais Ahmad Jafri : ***Selection from Mohammad Ali : Commrade.*** -III
(Lahore-1965) PP-311-17

Laj Pat Rai : ***Un-Happy India.*** (Calcutta-1948) PP-170-73 - 14

II- نسیم سوہدروی : علی گڑھ کے تین نامور فرزند۔ (لاہور-1974ء) ص.185

Jawahar Lal Nehru : ***An Autobiography.*** (London-1936) PP-223-25 - 15

Afzal Iqbal : ***Select Writings and Speeches of Moulana Mohammed Ali.*** -16
(Lahore-1963) PP-266-68

II- S. Mueen-Ul-Haq : ***Mohammad Ali : Life and Works.*** (Karachi-1978) PP-111-113

17- Abdul Hamid : ***Muslim Separetism in India -1858-1947.*** (Oxford-1967) PP-187-89

II- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.364

18- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.153

II- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ فروری-1985ء ص ص.177-79

19- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء) ص ص.223-27

II- S. Mueen-Ul-Haq : ***Mohammad Ali : Life and works.*** (Karachi-1978) PP-270-73

20- Andulal Yajnik : ***Gandhi as I Know Him.*** (Delhi-1943) PP-311-13

21- خورشید علی مہر : درسِ آزادی۔ (دہلی-1932) ص. 345

II- شیخ محمد اکرام : موجِ کوثر۔ (لاہور-1984ء) ص ص.279-81

22- مظفر ہاشمی : ہمارے سیاستدان۔ (لاہور-1949ء) ص ص.131-35

II- رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص ص.251-57

23- رئیس احمد جعفری : مطائبات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1945) ص.44

II- سید سلیمان ندوی : بریدفرنگ۔ (کراچی-1956ء) ص ص.76-78

III- روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 27اکتوبر-1925ء

24- عبدالماجد دریابادی : محمد علی : ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول۔ (اعظم گڑھ-1952ء) ص ص.238-42

II- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.382

III- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.287-89

IV- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ جنوری-1931ء ص ص.75-88

25- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1944) ص ص.41-46

II- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ جون-1931ء ص ص.43-45

26- محمد امین زبیری : سایست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.315

II- محمد صدیق ہزاروی : تاریخ ساز شخصیات۔ (لاہور-1992ء) ص ص.139-42

III- I.H. Qureshi : ***Ulama in Politics.*** (Karachi-1972) PP-223-25

27- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.155-56

II- عبدالرشید ارشد : بیس بڑے مسلمان۔ (لاہور-1975ء) ص ص.348-51

III - رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد دکن-1943ء) ص ص.91-72
IV- روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 2 ستمبر-1925ء
V- واحد ندوی جام پوری : یادوں کے چراغ۔ (ڈیرہ غازی خان-1967ء) ص ص.39-238
28 - مولانا عبدالماجد دریابادی : محمدعلی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول۔ (اعظم گڑھ-1952ء)
ص ص.54-250
II - امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.329
III - رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی - حصہ اول۔ (حیدرآباد-1943) ص ص.100-92
IV- روزنامہ : ہمدرد۔ 24اگست-1926ء
29- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمد علی۔ (حیدرآباد-1944ء) ص.63
II- رئیس احمد جعفری : کاروان گم گشتہ۔ (کراچی-1968) ص ص.21-20-16
III- سید سلیمان ندوی : یادرفتگان۔ (کراچی-1983ء) ص ص.97-95
IV- سید آل احمد رضوی : عظمت رفتہ۔ (ایبٹ آباد-1994ء) ص ص.55-151
30- رئیس احمد جعفری : مقالات محمدعلی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد-1943ء) ص ص.15-110
II- روزنامہ : ہمدرد۔ 25-26-28اکتوبر-1926ء
III- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ جولائی-1931ء ص ص.32-129
31- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1944ء) ص.64
II- رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص ص.30-321
III- مولانا ظفر علی خان : رپورٹ وفد حجاز-1926ء۔ (لاہور-س ن)
32 - عبدالماجد دریابادی : محمد علی :ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول۔ (اعظم گڑھ-1952)
ص ص.39-335
II- محمد صادق قصوری : اکابرین تحریک پاکستان۔ حصہ دوم۔ (لاہور-1979ء) ص ص.62-351
III- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ اگست-1931ء ص ص.62-59
33 - اقبال احمد صدیقی : قائداعظم اور انکے سیاسی رفقاء۔ (کراچی-1990ء) ص ص.18-202
II- اردو انسائیکلوپیڈیا : (لاہور-1987) ص.391
34 - مفتی انتظام اللہ شہابی : مشاہیرِ جنگِ آزادی۔ (کراچی-1957ء) ص.285
II- کلیم نشتر : ہمارے محمد علی جوہر۔ (لاہور-س ن) ص ص.54-53
III- خان شاہد اکبرآبادی : جلوہ خورشیدِ حرم۔ (کراچی-1993ء) ص.365
35 - عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی : جنگِ آزادی کے مسلم مجاہدین۔ (دہلی-1975ء) ص.70-169
II- پروفیسر احمد سعید : حصول پاکستان۔ (لاہور-1975) ص.322
III- Shan Mohammad : *The Indian Muslims-1900-1947.* Vol-VIII PP-14-23

36- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.42-441

S. Moinul Haq : ***Mohammad Ali : Life and Works.*** (Karachi-1978) P-225 -II

Allaha Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1980) PP-276-78 - 37

II- محمد صدیق ہزاری : تاریخ ساز شخصیات۔ (لاہور-1992ء) ص ص.17-215

38 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.398

II- رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد دکن-1943ء) ص ص.87-152

III- روزنامہ : ہمدرد۔ 11-12-13 مئی-1927ء

IV- راج موہن داس : مسلم افکار۔ (مترجم: فاروق شاہین) (لاہور-1996ء) ص ص.91-142

39 - رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد-1943ء) ص ص.51-118

II- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.49-147

Shan Mohammad : ***The Indian Muslims-1900-1947.*** Vol-VIII PP-128-34 - 40

III- روزنامہ : اعلان۔ کراچی۔ 24 مئی-1978ء مولانا محمد علی جوہر۔

41- محمد سرور : مضامین محمدعلی۔ (دہلی-1940) ص ص.66-259

II- خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931) ص ص.08-207

Shan Mohammad : ***The Indian Muslims-1900-1947.*** Vol-VIII PP-139-46 -III

Laj Pat Rai : ***Un-Happy India.*** (Calcutta-1948) PP-195-99 -42

II- محمد سرور : مضامین محمدعلی۔ (دہلی-1940) ص ص.45-241

Abdul Waheed Khan : ***India Wins Freedom.*** (Karachi-1961) PP-255-58 - 43

Shan Mohammad : ***The Indian Muslims-1900-1947.*** Vol-VIII PP-159-210 - II

Subhas Chander Bose : ***The Indian Struggle.*** (London-1959) PP-209-11 -III

IV- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ ستمبر-1931ء ص ص.25-113

44- رئیس احمد جعفری : مطالبات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1945ء) ص ص.75-173

45- ایضاً . . . . ص ص.78-177

46- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.404

II- محمد علی : نمونہ جنگِ صفین۔ (دہلی-1927ء) ص ص.26-120

47- روزنامہ : غریبوں کا اخبار۔ دہلی۔ 22 نومبر-1926

48- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.400

49 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص ص.19-218

II- رئیس احمد جعفری : مطالبات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1945ء) ص ص.14-113

III- شاہ محمد قادری : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1998ء) ص ص.247

50 - صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.70-169

II- ابو سلمان شاہجہانپوری : تحریکات ملی۔ (مجلہ علم و آگہی) (کراچی-1978ء) ص.293

51- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.173

II- روزنامہ : ہمدرد۔ 25نومبر-1926ء

III- روزنامہ : جہاد۔ پشاور۔ 4 جنوری-1978ء (ساجد انصاری : مولانا محمد علی جوہر)

52- خورشید علی مہر : سیرت محمد علی ۔ (دہلی-1931ء) ص .55

II- B.N. Panday : ***The Indian Nationalist Movement-1885-1947.*** (Hangkang-1979) PP-122-23

III - سید نور احمد : مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ (لاہور-1966ء) ص ص.80-79

-53 ***The Indian Annual Register :*** 1923. Vol-II PP-161-82

II- روزنامہ : جنگ۔ کراچی۔ 17 مئی-1980ء (ڈاکٹر ریاض الحسن : مولانا محمد علی اور خلافت فنڈ) ص.3

III- روزنامہ : جنگ۔ کراچی۔ 9فروری-1980ء (ڈاکٹر ریاض الحسن : مولانا محمد علی اور خلافت فنڈ) ص.5

54- عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور1985ء) ص ص.32-230

II- روزنامہ : جنگ۔ راولپنڈی۔ 8مارچ-1979ء (تحریک خلافت اور مولانا محمد علی) ص.3

III- روزنامہ : جسارت۔ کراچی۔ 28مارچ-1979ء

55- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932) ص.430

II- ، ، ، : مضامین محمد علی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء) ص ص.40-239

III- ، ، ، : افادات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-س ن) ص ص.47-145

IV- روزنامہ : مساوات۔ کراچی۔ 24-25-26جنوری1979ء (پروفیسر چودھری ہدایت اللہ : مولانا محمد علی اور خلافت قسط نمبر1-2-3)

56 - سید نور احمد : مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ (لاہور-1966ء) ص.83

II- K.K. Aziz : ***Britain and Muslim India.*** (London-1963) PP-83-85

III- S.R. Bakshi : Ali Bothers : Role in Freedom Struggle. (Delhi-1993) PP-255-56

IV- Shan Mohammad : ***The Indian Muslims.*** Vol-VIII PP-235-36

57- رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ دوم۔ (حیدرآباد-1943ء) ص ص.194

II- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940ء) ص ص.11-305

58 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1995ء) ص ص.35-233

II- رئیس احمد جعفری : مطائبات محمد علی۔ (حیدرآباددکن-1945ء) ص ص.53-51

59 - B. N Pandey : ***The Indian Nationalist Movement 1885-1947.*** (Hangkang-1979) PP-180-83

II - T.G.P.Spear : ***India, Pakistan and the west.*** (New Yark-1967) PP-231-34

III - J-Ahmad : ***Historic Documents of the Muslim Freedom Movement.*** (Lahore-1970) PP-279-83

60- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمدعلی۔ (حیدرآباد-1944ء) ص ص.85-80

II- J.S/M. Zafar : ***Founders of Pakistan.*** (London-1950) PP-203-07

III - B. N Pandey : ***The Break up of the British India.*** (Delhi-1981) PP-211-13

61 - روزنامہ : ہمدرد۔ 13 جنوری 1929ء

62 - رفیق افضل : گفتارِ اقبال۔ (لاہور-1969ء) ص ص.27-26

63 - روزنامہ : ہمدرد۔ 15 جنوری 1929ء

II- روداد چمن : محمدعلی کی سیاسی سرگزشت۔(ہمدرد۔ 10-13-14-15 جنوری 1929ء)

64 - چودھری خلیق الزماں : بحواله سابقه۔ ص.467

65 - T.G.P. Spear : ***India, Paksitan and the West.*** (New Yark-1967) PP-273-77

II - M. Hasan : ***Nationalism and Communal Politics in India.*** (Delhi-1979) PP-221-25

III - Y.B Mathar : Growth of Muslims Politics in India. (Lahore-1980) PP-211-12

66 - Choudhry Khaliquzzaman : ***Op. cit.,*** PP-71-75

II- ابوسلمان شاہجہانپوری : علامه اقبال اور مولانا محمدعلی۔ (کراچی-1984ء) ص ص.43-41

III- روزنامہ : ہمدرد۔ 17 اگست 1927ء شاعرِ وطن اقبال

IV- روزنامہ : ہمدرد۔ 16 اگست 1927ء طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ نمبر2

V- روزنامہ : ہمدرد۔ 12 اگست 1927ء میرا استاد اقبال۔ اقبال مرحوم۔

VI - احمد سعید : گفتار قائد اعظم۔ (اسلام آباد-1976) ص .56

67 - رئیس احمد جعفری : مطائبات محمدعلی۔ (حیدرآباددکن-1945ء) ص.12-111

II- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحواله سابقه۔ ص.186

III- مظفر ہاشمی : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1949ء) ص ص.107-101

68- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحواله سابقه۔ ص.187

II- رئیس احمد جعفری : مطائبات محمد علی۔ (حیدرآباددکن-1945) ص ص.87-184

69- Mohammad Noman : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1947) PP-311-17

II- Allaha Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1980) PP-357-58

III- Shan Mohammad : ***The Indian Muslims.*** Vol-VIII PP-251-59

IV- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمدعلی۔ (حیدرآباد-1944ء) ص ص27-122

V- روزنامہ : ہمدرد۔ 29نومبر-1927ء

70 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.22-418

II- خواجہ احمد عباسی : محمدعلی جوہر۔ (دہلی-1949ء) ص ص.72-69

III - C.H. Philips : ***(Ed) The Evolution of India and Pakistan 1858-1947.*** (London-1962) P-274

71- Mushir-Ul-Hasan : ***Nationalism & Communal Politics in India.*** (Delhi-1979) P-271

II- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.74-472

72 - رفیع احمد قدوائی : رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس۔ (دہلی-1928ء) ص.45

II- ایضاً . . : (نہرو رپورٹ کی دفعات پر تبصرہ) ص.49

III- رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.568

- 73 Khalid- Bin- Syeed : ***Pakistan, The Formative Phase.*** (Lahore-1960) PP-33-35

-II ***All Parties Conference-1928.*** By All India Congress Committee. (Allahabad-1928) PP-34-69

III- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوئم۔ (دہلی-1940ء) ص.14-313

74 - ایضاً . . . . ص ص.20-317

II - اشتیاق حسین قریشی : جد و جہدپاکستان۔ (کراچی-1990) ص ص.76-74

- 75 Abdul Waheed Khan : ***India Wins Freedom.*** (The other side) (Karachi-1961) PP-315-18

76- سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.160

-II Choudhry Khaliquzzaman : ***Op. cit.,*** P-90

77- منشی عبدالرحمٰن : معماران پاکستان۔ (لاہور-1976ء) ص ص.58-237

II- محمد سرور : مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941ء) ص ص.121-25

III- رئیس احمد جعفری : ثام راج سے رام راج تک۔ (لاہور-س ن) ص.26-31

78- Allaha Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1980) P-367

II- محمد صادق قصوری : تحریک پاکستان اور علماء کرام۔ (لاہور-1999ء) ص.57

79- رئیس احمد جعفری : مقالات محمد علی۔ حصہ دوم۔ (حیدر آباد دکن-1943ء) ص.210

80- احمد سعید : حصول پاکستان۔ (لاہور-1975ء) ص.241

81- ایضاً . . . .

II- K.K. Aziz : ***The Making of Pakistan.*** (London-1967) P-42

82- روزنامہ : الجمعیتہ۔ دہلی۔ یکم اکتوبر 1928ء ص.3

II- احسن اعرانی : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1954ء) ص ص.75-80

83- رفیق غوری : جب پاکستان بن رہا تھا۔ (لاہور-1982ء) ص ص.139-40

II- Rom Gopal : ***Indian Muslims.*** (Bombay-1959) PP-213-15

84- K.K. Aziz : ***The Indian Khilafate Movement, 1915-1933.*** (Karachi-1972) PP-320-22

II- خورشید کمال عزیز : مبادیات مدنیت۔ (لاہور-1941ء) ص ص.150-55

III- دوست قدوائی : گنجینہ جوہر۔ (کراچی-1950ء) ص.127

85- Shan Mohammad : ***The Indian Muslims.*** Vol-VIII Section-12 P-6

II- Lal Bahadar : ***The Muslim League.*** (Agra-1954) PP-210-12

III- اردو دائرہ معارف اسلامیہ : جلد19 (لاہور-1986ء) ص.495

II- محمد علی : ہندوستان کی سیاسی الجھنیں۔ (مترجم: منیر احمد شاہین) (حیدر آباد دکن-1947) ص ص.69-71

86- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.485

II- Ram Gopal : ***Indian Muslims.*** (Lahore-1959) PP-213-15

87- رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص.568

II- رشید احمد صدیقی : گنج ہائے گرانمایہ۔ (لاہور-1967ء) ص ص.104-12

III- Ram Gopal : ***Indian Muslims.*** (Lahore-1959) P-205

88- روزنامہ : ہمدرد۔ 15 جنوری 1929ء

II- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.486

89- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمد علی۔ (حیدر آباد-1944ء) ص ص 35-231

II- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.492

Allah Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1980) PP-368-71 -III

90- عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.446

II- محمد سرور : محمد علی: بحثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.375.85

S. Qalb-I- Abid : ***Struggle for Independence.*** (Lahore-1997) PP-63-65 -III

I.H. Qureshi : ***A Short History of Pakistan.*** (Karachi-1992) PP-858-59 -IV

91- جواہر لعل نہرو : میری کہانی۔ آبیتی۔ (لاہور-1996ء) ص.157

92- ایضاً ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ص ص.157-58

93- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.487

II- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940) ص.317

S. Qualb-I-Abid : ***Op. cit.,*** PP-65-66 -III

94- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.488-89

95- سر محمد یامین : نامہ اعمال۔ (لاہور-1970ء) ص.392

96- طفیل احمد منگوری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.394-95

Choudhry Khaliquzzaman : ***Op. cit.,*** PP-103-104 -97

S. Qalb-I- Abid : ***Op. cit.,*** P-69 -II

III- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.491

Mohammad Arif : ***Journey to Freedom.*** (Lahore-1984) PP-104-11 -98

Frances Robinson : ***Separatism Among Indian Muslims.*** (London-1974) PP-319-23 -II

99- جواہر لعل نہرو : میری کہانی۔ حصہ اول۔ (لاہور-1996ء) ص ص.235-37

100- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء) ص ص.250-56

II- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.313-14

101- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.511

II- خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.207-8

S.M. Ikram : ***Modern Muslim India and the birth of Pakistan.*** (Lahore-1977) PP-161-66 -102

Khalid Bin Syeed : ***Pakistan : The Formative Phase.*** (Karachi-1960) P-172 -II

103- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.515

II - خورشید علی مہر : درسِ آزادی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1932ء) ص ص.29-227
104- صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.214
II- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.517
نوٹ:۔
محمد علی کی صحت اسقدر خراب ہو چکی تھی کہ جدید جمیعت العلماء کے اجلاس میں دوسرے آدمی کے سہارے کرسی پر آئے تھے۔ کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم کہ خود اپنا خطبہ نہیں پڑھا تھا۔
-105 Andulal Yajnik : ***Gandhi As I Know Him.*** (Delli-1943) PP-322-23
-II Mohammad Noman : ***Muslim India.*** (Allahabad-1942) PP215-16
-106 Andulal Yajnik : ***Gandhi As I Know Him.*** (Delli-1943) PP-345-47
II - ایم۔اے گاندھی : تلاشِ حق۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1938ء) ص ص.45-331
-III Richard Symords : ***The Making of Pakistan.*** (London-i950) PP-129-30
107- ایم۔اے۔گاندھی : تلاشِ حق۔ حصہ دوم۔ (مترجم: سید عابد حسین) (دہلی-1938ء) ص ص84-370
II- راج موہن داس : مسلم افکار۔ (لاہور-1996ء) ص ص.93-191
III - اشتیاق حسین قریشی : جد وجہد پاکستان۔ (کراچی-1990ء) ص ص.83-81
108- عبدالماجد دریابادی : محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ دوم۔ (اعظم گڑھ-1952ء) ص ص64-158
-II Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) P-371
109- معین الدین عقیل : مسلمانوں کی جدو جہد آزادی۔ (لاہور-1981) ص.114
II - فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء) ص.263
-110 Allah Bakhsh Yusufi : ***The Khilafate Movement.*** (Karachi-1980) PP-431-35
-II Mohammad Noman : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1942) PP-242-43
111- عبدلماجد دریابادی : خطوط مشاہیر۔ (لاہور-1944ء) ص ص.97-295
112- ماہنامہ : نگارِ پاکستان۔ کراچی۔ نومبر۔دسمبر1978ء ص.144
II- روزنامہ : الامان۔ رئیس الاحرار نمبر۔ 19فروری-1931ء
III- نشتر عوامی : حیات جوہر۔ (علی گڑھ-1931ء) ص.79
113- چودھری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص.429
II- رئیس احمد جعفری : نگارشات محمد علی۔ (حیدرآباد دکن-1944ء) ص ص.56-255
III- حبیب احمد ندوی : رئیس الاحرار اور مولانا محمد علی کے آخری الفاظ۔ (کراچی-1963) ص ص.93-87

اختتامیہ

محمد علی (1878ء تا 1931ء مطابق 1295ھ تا 1349ھ) بلند ہمت لیڈر تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کی سرپرستی سے نکال کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ہمت دلائی اور آزادی کی روح پھونکی۔ لیکن انکی زندگی کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے سیاست و مذہب کو باہم ملانے اور ساتھ لیکر چلنے کی بھرپور کوشش کی۔ جو غلام ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مسلمانوں میں مذہبی اتحاد اور تنظیم کا خواب دیکھا۔ حقیقتوں نے انہیں جھنجوڑ کر جگایا اور جتانا چاہا کہ یہ منصوبہ ناقابلِ عمل ہے۔ تب بھی وہ یہ خواب دیکھتے رہے۔ مثلاً جب ترکی میں انہیں قیامِ خلافت کے سلسلے میں ناکامی ہوئی۔ تو اس خواب کی تعبیر انہوں نے حجاز میں چاہی۔ لیکن انکا یہ خواب وہاں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد علی کو اسلام سے حقیقی محبت تھی۔ وہ ان چند اشخاص میں سے تھے۔ جنھیں دل سے اسلام کو عہد جدید کے نقطہ نظر کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کی لگن تھی۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تحفظ پسندی اور سید احمد خان کی تجدید پسندی کے بین بین راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پیشتر ندوۃ العلماء لکھنو نے بھی جدید اور اسلامی تعلیم میں امتزاج و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکامی ہوئی۔ محمد علی نے بھی یہ روش اختیار کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔

محمد علی نے اپنے مقاصد کے حصول میں تحمل سے زیادہ تیزی اور ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیا۔ جس نے دوستوں کو کنارہ کش اور بعض کو درپے آزار کر دیا۔ مخالفتوں کا ہجوم خود محمد علی کے سکونِ خاطر اور حصولِ مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا۔ پیر طریقیت مولانا عبدالباری فرنگی محل (1878ء -1926ء) سے اختلاف ہوا۔ ظفر علی خان (1872ء -1956ء) جیسے شعلہ بیان، خواجہ حسن نظامی (1878ء -1955ء) جیسے جادو نگار سے عنت چھڑ گئی۔ علامہ محمد اقبال (1877ء -1938ء) اور مہاراجہ محمود آباد (1881ء - 1931ء) سے اختلاف پیدا ہوا۔ ہندو مسلم مخالفین نے اعتراضات والزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ محمد علی پر یہ اعتراض ہوا کہ انکا ترکوں کی مدد کیلئے روپیہ ملک سے باہر بھیجنا ایک غلط اقدام تھا۔ اسکو ملک کے اندر خرچ ہونا چاہیے تھا۔ ترکی کا مسئلہ ایک غیر ملکی مسئلہ تھا وغیرہ وغیرہ۔ محمد علی نے اسکا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی کہ :-

> "یہ غیر ملکی ترکوں کی مدد نہ تھی۔ خود ہماری اپنی مدد تھی اسلامی نقطہ نظر سے ترک اور ہندوستان کے مسلمان، عرب ایرانی اور افغانی سب بھائی بھائی ہیں ---- تم پر صرف ایک ہندوستان کا فرض عائد ہوتا ہے۔ لیکن ہم پر اس فرض کے علاوہ مسلمانانِ عالم کی آزادی کا بھی فرض ہے۔ تمہارا کاشی، تمہارا گیا، تمہارا

اجودھیا سب یہی ہیں۔ میرا مکہ، میرا مدینہ میرا بیت المقدس یہاں سے باہر
ہے۔ میں انکو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن میں کعبہ اور کاشی دونوں کی آزادی کیلئے لڑنے
کو تیار ہوں۔"[1]

محمد علی جذبہ اخوت سے مزئین اور اتحاد اسلامی کے زبردست حامی تھے۔ انکا نظریہ تھا کہ اسلام کا پیغام ایک انقلابی پیغام ہے۔ قومیت کی بنیاد نظریہ اور عقیدہ ہے۔ جو عالمگیر ہے۔ اس میں کسی رنگ و نسل، وطن و زبان کی قید نہیں۔ جو شخص دین اسلام کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ اسکا فرد بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس بنیاد کا یوں تذکرہ کیا ہے۔

سے

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

محمد علی، سید جمال الدین افغانی کی تحریک "پان اسلام ازم" سے بہت متاثر تھے۔ طرابلس و بلقان کی جنگوں میں مسلمانوں کی مدد اور تحریک خلافت میں کسی قسم کی جانی و مالی قربانی سے دریغ نہ کرنا اس جذبے کا نتیجہ تھا۔ محمد علی نے مسلمانوں کو یہ بھولا ہوا سبق اس وقت یاد دلایا۔ جب اسلامی سلطنتوں کی بقا حکومتِ برطانیہ کی آہنی گرفت سے معرضِ خطر تھی۔ بقول محمد علی

"اسلام تمام دنیا کو متحد کرنے اور جنگ کو مٹانے کیلئے آیا ہے ---پان اسلام ازم کا یہ
مقصد ہے کہ اسلامی سلطنتوں کو زوال سے بچایا جائے۔"[2]

جب محمد علی کی سربراہی میں وفد خلافت بے نیل و مرام یورپ سے واپس آیا۔ تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کی آزادی میں عالم اسلام کی آزادی کا راز مضمر ہے۔ اگر ہندوستان کی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہے۔ تو یہاں کی مادی و اخلاقی طاقت اسلامی ممالک کو غلام بنانے کیلئے استعمال نہ کی جا سکے گی۔ اسطرح اس پان اسلام ازم تحریک سے محمد علی کے دو مقاصد تھے۔ (جنکے دو مختلف مرکز تھے۔) یعنی 1. تحفظ ممالک اسلامی 2. آزادی ہند۔ تحریک خلافت یا بالفاظ دیگر تحریک پان اسلام ازم کی بدولت مسلمان کثرت سے کانگریس میں شریک ہوئے۔ گوشہ نشین علماء نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا۔ عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ غلامی سے نفرت اور آزادی کے حصول کا جذبہ بیدار ہوا۔ یعنی ہندوستانیوں میں معاشرتی اور سیاسی تحریک پیدا ہوئی۔ اسلیئے تحریک خلافت کو مشکوک نظروں سے دیکھنا مناسب نہیں۔ کہ یہ تحریک آزادیِ ہند کی ممد و معاون ہے۔ محمد علی کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے اس تحریک کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو اپنے ملکی و ملی حقوق کی حفاظت کیلئے بیدار کیا۔

انتہا پسند ہندو محمد علی کی سیاسی ساکھ کو خراب کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ محمد علی نے گاندھی (1869ء-1948ء) کو اسلامی مقاصد کی تکمیل کیلئے تحریک خلافت میں شامل کیا۔ اور پھر گاندھی نے مسلمانوں کی خاطر ہندوؤں کو خلافت کے جھگڑے میں پھنسا دیا۔ ان معترضین میں سب سے پیش پیش بنگال کے مشہور صحافی بپن چندر پال

تھے۔ جو کلکتہ کے مشہور اخبار "انگلشمین" (English Man) میں محمد علی کے خلاف لکھتے رہے۔ محمد علی نے اس الزام یا اعتراض کا انتہائی مدلل جواب دیتے ہوئے کہا کہ :۔

> "یاد رکھیے کہ اگر گاندھی ہمارے ساتھ نہ بھی شامل ہوتے۔ بلکہ یہ کہو کہ پیدا بھی نہ ہوتے۔ تب بھی میں وہی کرتا، جو میں نے کیا۔ اور اسطرح میرے بھائی شوکت صاحب بھی نہ ہوتے۔ تو تب بھی میں وہی کرتا جو میں نے کیا۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ (شوکت علی) بھی وہی کرتے جو انہوں نے کیا۔ ہمارا بھروسہ مہاتما گاندھی پر نہیں، بلکہ خدا پر ہے۔"[3]

اگر یہ کہا جائے کہ گاندھی کو اسلامی مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ گاندھی نے سادہ اور مخلص مسلمانوں کو ہندوؤں کے سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کیا تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں تک گاندھی کو تحریک میں شامل کرنے کا تعلق ہے۔ وہ محمد علی کی اسیری کے دوران ہی تحریک خلافت میں شامل ہو چکے تھے۔ حقیقتاً گاندھی کے خود اپنے مقاصد تھے۔ وہ اپنے آپکو "کل ہند نمائندہ" بنانے، مسلمانوں کے اندر رہ کر ہندوؤں کو مضبوط کرنے کے علاوہ "سوراج" حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں مسئلہ خلافت سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ وہ تو سب کچھ صرف اور صرف ہندوؤں کی بھلائی اور خیر خواہی کیلئے کر رہے تھے۔ ہندو غیر مشروط طور پر نہیں بلکہ مشروط طور پر تحریک میں شامل ہوئے تھے یعنی "سوارج" کے مطالبے کے ساتھ۔ خلافت کانفرنس نومبر 1919ء کے موقع پر گاندھی کا ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ ایجنڈے میں نہ رکھنے دینا ایک ڈھونگ اور سیاسی چال تھی۔ جو ہندوؤں کیلئے بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ لیکن سادہ لوح اور مخلص مسلمان گاندھی کو اپنا سب کچھ تسلیم کر بیٹھے۔ محمد علی کی عدم موجودگی ہی میں مسلمان گاندھی کی ثناخوانی میں اسقدر بڑھ گئے تھے۔ کہ نومبر 1919ء میں تحریک خلافت کے مشہور رہنماء اور معروف عالم دین اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امرتسری نے گاندھی کو امام "عبداللہ بن مبارک" (خلیفہ ہارون الرشید کے دور کے) کے مشابہ قرار دیا۔[4] مولانا ظفر علی خان نے راولپنڈی میں اگست 1920ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

> "اب ہندو مسلمانوں میں تفرقہ نہیں پڑ سکتا۔ ہندوؤں نے اور مہاتما گاندھی نے مسلمانوں پر جو احسان کئے ہیں۔ انکا عوض ہم نہیں دے سکتے۔ ہمارے پاس زر نہیں ہے۔ جب جان چاہیں، ہم حاضر ہیں۔"[5]

لیکن مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856ء-1921ء) ہندوؤں پر بے جا اعتماد کے خلاف تھے۔ ان صاحبِ بصیرت کا کہنا تھا کہ گاندھی کو مہاتما کہنا ہی تعظیمِ مشرک اور کلمۂ کفر ہے۔[6] مقام حیرت ہے کہ مسلم رہنماؤں نے گاندھی اور ہندوؤں پر اندھا دھند اعتماد کیا۔ مذہبی احکامات تک میں لچک پیدا کر دی۔ حالانکہ تحریک خلافت ایک مذہبی تحریک تھی۔ ہندو تحریک کے ساتھ قطعاً مخلص نہ تھے۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کیا، تو وہ انکی سیاسی ضرورت تھی۔ جسکا مقصد مسلمانوں کے سہارے ہندو تحریک کو عوامی بنانا تھا۔ تحریک خلافت کی مدد سے انکا یہ مقصد پورا ہو گیا۔ تو ہندو مسلم اتحاد کی بلند و بالا عمارت زمین بوس ہو گئی۔ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ ہر ضلع کانفرنس میں ہندوؤں کی طرف سے ترک ذبیحہ گاؤ کا مطالبہ ضرور ہوتا تھا۔ لیکن مسلم رہنما ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشاں رہے۔ آخر سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔

تصویر کا دوسرا رخ دیکھیئے کہ مسلمانوں کی اس انتہا پسندی کے باوجود گاندھی مسلم رہنماؤں کے بارے میں انتہائی کمزور رائے رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں لکھا کہ :۔

> "شوکت علی خلیق آدمی ضرور ہے لیکن ایک جوشیلا مذہبی پاگل ہے اور اسکی رائے کسی شخص کیلئے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ حسرت موہانی ایک نکما آدمی ہے۔ جس پر ہر وقت سودیشی کی دھن سوار رہتی ہے۔ ڈاکٹر (سیف الدین) کچلو ابھی کل کا بچہ ہے۔ اور امرتسر سے باہر اسے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"[7]

مولانا عبدالباری فرنگی محل کے بارے میں گاندھی کی رائے ملاحظہ کیجیے کہ :۔

> "مجھ سے کہا گیا کہ وہ ہندوؤں کے جذبہ مخالفت سے بھرے ہوئے ہیں۔ انکی بعض تحریریں بھی مجھے دکھائی گئیں، جنکو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اور میں نے ان پر سر بھی نہیں مارا۔ اسلیئے کہ وہ خدا کی سادہ مخلوق ہیں ---- وہ اکثر بلا سوچے سمجھے بات کرتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں کو مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔"[8]

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ گاندھی مسلم رہنماؤں کو سادہ اور بیوقوف سمجھتے ہوئے بلکہ بناتے ہوئے اپنے ہندووانہ مقاصد کیلئے استعمال کرتے رہے۔ انکا یہ کہنا کہ :۔

> "میں شوکت علی کی جیب میں ہوں۔"[9]

دھوکا دینے کے مترادف تھا۔ اور مسلمانوں نے گاندھی کو نبوت کے درجے تک پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ظفر الملک مولوی اسحاق علی نے گاندھی کے متعلق کہا کہ :۔

> "اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔"[10]

افسوس کہ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلم علماء آپس میں فروعی اختلاف کا شکار رہے اور ہندو اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اگر ان میں اتفاق واتحاد ہوتا تو انہیں کبھی اغیار کے ساتھ اتحاد کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہندوؤں کے آلۂ کار نہ بنتے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خود کو مضبوط اور انہیں کمزور کر دیا۔ گاندھی کے بارے میں مسلم رہنماؤں کی آراء کے پیش نظر محمد علی پر یہ اعتراض صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ وہ گاندھی کو تحریک خلافت میں لانے اور مرکزی حیثیت دلوانے کا باعث بنے۔ زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گاندھی پر حد درجہ اعتماد کیا۔ جسے اندھے اعتماد سے تشبیہ دینا مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ محمد علی کی سنگین سیاسی غلطی تھی۔ جسکی وجہ سے مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے غیر مذہب کے آدمی کو اپنا رازدار بنانے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

یایھا الذین امنو الا تتخذوا بطانة من دونکم لا یالو نکم خبالا ط و دواما عنتم ج قد بدت البغضاء من افواھھم ج و ما تخفی صدورھم اکبر ط قد بینا لکم الایت ان کنتم تعقلو ن ٥

ترجمہ:۔ مومنو! کسی غیر (مذہبِ غیر کا آدمی) کو اپنا راز دار نہ بنانا۔ یہ لوگ تمہاری خرابی میں (فتنہ انگیزی کرتے) کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ (جسطرح ہو) تمہیں تکلیف پہنچے۔ انکی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے۔ اور جو (کینے) ان کے سینوں میں مخفی ہیں۔ وہ کہیں زیادہ ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔ (118-3)

انسان ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے کہ مترادف، اگر چہ محمد علی اور مسلمانوں کو شدید دھچکا تو لگا۔ لیکن آخر کار انہوں نے گاندھی یا ہندوؤں پر اعتماد کرنے کی بجائے خود اپنی تنظیم اور اتحاد کی راہ نکالی۔

محمد علی پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا گیا ہے کہ جب محمد علی وفد خلافت لے کر یورپ گئے۔ تو انہوں نے وہاں فضول خرچی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے دریغ قوم کا روپیہ خرچ کیا۔ لیکن اس الزام کا بھی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض مخالفت اور حقائق سے لاعلمی کی بنا پر عائد کیا گیا۔ "جمعیت مرکزیہ خلافت" کی شائع کردہ رپورٹ "حسابات وفد خلافت یورپ" میں تمام آمدنی وخرچ، اعتراضات اور انکے جوابات تفصیلاً درج ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میوزیم میں تمام ریکارڈ موجود ہے۔ اسکے علاوہ "لوح سلیمان" میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی درج ہے۔ جس میں "خلافت فنڈ اور وفد خلافت یورپ" کے تمام حسابات کی تفصیل موجود ہے۔ مزید براں رئیس احمد جعفری کی تصنیف "سیرت محمد علی" باب نمبر 16 صفحہ نمبر 306-280 "وفد خلافت یورپ" میں مخالفین و معترضین کے اعتراضات و سوالات کے تفصیلاً اور مدلل جوابات موجود ہیں۔

اسی طرح محمد علی پر "خلافت فنڈ" کے غبن کا بھی الزام لگایا گیا۔ حالانکہ یہ غبن خواہ اتفاقی تھا، اس وقت ہوا، جب محمد علی جیل میں تھے۔ یہ غبن محض مخالفت کی بنا پر محمد علی کے سر تھوپنا سراسر زیادتی تھا۔ جبکہ تمام حقائق بھی سامنے آچکے تھے۔ صحیح علم نہ رکھنے کی بنا پر بہت سے حضرات آج تک محمد علی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری (1912ء-1968ء) نے کیا خوب تحریر کیا ہے کہ:۔

> "حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہماری قوم میں بہت زیادہ محامد و محاسن ہیں۔ وہاں سب سے بڑی خصوصیت خاص انکا ملکۂ تنقید ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زعماء پر، مخلص قائدین پر، ایثار پیشہ رہنماؤں پر جس بے دردی، سنگدلی اور شقاوت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے۔ تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ اور بالاخر انکے قوائے عمل کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور پھر آنسو بہائے ہیں۔ اسکی مثال شاید ہی کوئی اور قوم پیش کر سکے۔" [11]

اگر چہ محمد علی کے شخصی وقار اور عظمت کے تخیل میں ان شر پسند عناصر کے پروپیگنڈے سے فرق نہ آیا۔ لیکن جو نقصان ہوا، اور بعد میں جو کیچڑ اچھلا، اسکے ذمہ دار ایک حد تک محمد علی خود بھی تھے۔ انکے اندر دو بڑی خامیاں تھیں۔ ایک تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکتے تھے۔ جو دل میں آتا کہہ دیتے۔ دوسرا ان میں تحمل و برداشت کی کمی تھی۔ انکی جذباتیت اور تیز و تند طبیعت اپنا رنگ دکھا جاتی تھی۔ حالانکہ شروع میں محمد علی کی مزاجی کیفیت ایسی نہ تھی۔ وہ اختلاف کو برداشت کر لیتے تھے۔ جب

علامہ اقبال نے وفدِ خلافت کے یورپ جانے کی مخالفت کی تو محمد علی خاموش رہے۔ لیکن بعد ازاں جسمانی امراض، اعصابی عوارض اور ذہنی صدمات کی بنا پر وہ تھوڑے سے اختلاف پر بھی مشتعل ہو جاتے تھے۔ مثلاً محمد علی کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ خواجہ حسن نظامی نے چیف کمشنر دہلی سے انکی شکایت کی اور گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔ محمد علی نے انکے خلاف "ختمِ خواجگی" کے عنوان سے اپنے اخبار ہمدرد میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر ہاپوڑی صاحب والے خط کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی جیسے سرکاری آدمی کی مخالفت مول لی۔

اس طرح محمد علی کی پر جوش اور پر خلوص طبیعت مسئلہ حجاز میں الجھ کر رہ گئی۔ جب عبدالعزیز بن سعود (1881ء-1953ء) نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو شریف حسین مکہ کے تسلط سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ اور جنتُ البقیع وغیرہ کے مزارات کے قبے منہدم کرادیے۔ تو ہندوستانی مسلمانوں میں اس اقدام کے موافقین اور مخالفین کی جماعتیں وجود میں آگئیں۔ جو" قبہ شکن "اور" قبہ نواز" کہلائیں۔ اس معاملے میں محمد علی کے اپنے اکابرین کے ساتھ تعلقات خوشگوار نہ رہے۔ حتیٰ کہ اپنے پیرو مرشد مولانا عبدالباری سے بھی انکا اختلاف ہو گیا۔ محمد علی کے بارے میں عبدالماجد دریابادی (1892ء -1977ء) تحریر کرتے ہیں کہ :۔

> "وہ محض حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا۔ جس چیز کو اس نے حق سمجھ لیا۔ پس دانت سے پکڑ لیا۔ پھر چاہیے اس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے۔ حق کے معاملے میں پرواہ نہ کسی دوست کی، نہ عزیز کی، نہ بزرگ کی، نہ خورد کی، نہ اپنے محسن کی، نہ اپنے مرشد کی۔"[12]

محمد علی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ انپر یہ شعر صادق آتا ہے کہ :۔

سہ گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

محمد علی جوہر رائے قائم کرنے اور بدلنے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ جسکی وجہ سے انکے خلاف محاذ بنتے رہتے تھے۔ مثلاً ایک زمانے میں انکے ساتھ مولانا ظفر علی خان نے خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جب اختلاف ہوا تو محمد علی نے انھیں "غدار" کا خطاب دے دیا۔ علامہ محمد اقبال کے ساتھ محمد علی کے گہرے مراسم تھے۔ 1915ء میں اپنے مقدمہ کے سلسلے میں لاہور گئے تو انہی کے ہاں قیام کیا۔ لیکن تحریکِ عدمِ تعاون میں تعاون نہ کرنے کی بنا پر انھیں "اقبال مرحوم" لکھنے لگے تھے۔ اپنی انہی کمزوریوں کی وجہ سے محمد علی کی زندگی کا بڑا حصہ اپنے دفاع اور مناظرہ و مجادلہ میں گذرا۔

محمد علی کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ غلط یا صحیح جس بات پر ڈٹ جاتے تھے، پھر اس میں لچک ناممکن تھی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ مسئلہ حجاز کے سلسلے میں محمد علی نے "اختلافات و نزع" کو ختم کروانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسپر سمجھوتہ کر لینا چاہا۔ کہ ابن سعود کو موقع دیں کہ وہ اپنے وعدے ایفا کریں۔ یعنی موتمرِ اسلامی منعقد کرائیں۔ اگر وہ مطالبات قبول کریں تو بہتر، ورنہ میں آپکے ساتھ ہوں۔ اور جو کوششیں آپکی حمایت اور ابن سعود کی مخالفت میں کر سکتا ہوں کرونگا۔[13] لیکن مخالفین نے محمد علی کی اس مثبت اور احسن پیشکش کو رد کر دیا، قومی اتحاد و مفادات کی پرواکئے بغیر۔ نتیجہ یہ نکلا

کہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔ اور محمد علی کا وہ حال ہوا کہ :۔

بات بھی کھوئی التجا کر کے ؎

کیا ملا عرض مدعا کر کے

ابن سعود کی خاطر اپنے پیر و مرشد کو چھوڑا۔ ابن سعود کے بادشاہت کا اعلان کرنے پر محمد علی انکے مخالف ہو گئے۔ لیکن پنجاب میں مولانا ظفر علی خان ابن سعود کے حامی ہو گئے۔[14] پنجاب خلافت کمیٹی باغی ہو گئی۔ اور اس نے ابن سعود کی حمایت شروع کر دی۔ اختلاف کے باوجود جب مولانا ظفر علی خان نے سر محمد شفیع کو مسلم لیگ سے خارج کرنے کی تجویز پیش کی تو محمد علی نے انکی تائید کی۔[15] کیونکہ انکے نزدیک یہ تجویز صحیح تھی۔ حیرت ہے کہ محمد علی تو ابن سعود کی حمایت کر کے معتوب و مغضوب ہو گئے۔ حالانکہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ابن سعود کے اقدامات جمہوریت کے منافی ہیں۔ تو انہوں نے حمایت ترک کر دی۔ لیکن جب پنجاب خلافت کمیٹی اور مولانا ظفر علی خان ابن سعود کے حامی بن گئے، تو وہ قابلِ گرفت کیوں نہ ہوئے ؟ دراصل محمد علی کے مخالفین انکی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچا کر اپنی دکانِ سیاست چمکانا چاہتے تھے۔ اسکے علاوہ اس میں لسانی اور صوبائی عصبیت کا بھی بڑا دخل تھا۔

اگرچہ محمد علی کا علامہ محمد اقبال سے بھی اختلاف رہا۔ لیکن وہ سیاسی اور نظریاتی تھا، ذاتی نہیں۔ ان دونوں شخصیات میں اختلاف کا پہلا سبب تحریکِ ترکِ موالات بنا۔ اختلاف کا دوسرا موقع 1927ء میں پیدا ہوا۔ جب قانون ساز اسمبلی پنجاب کے اجلاسِ شملہ میں علامہ اقبال نے سردار اجل سنگھ کی مخالفت کی تھی۔ اجل سنگھ نے قرارداد پیش کی تھی کہ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مقابلے کا امتحان ہو۔ اگر ایسا کرنا ناممکن ہو تو بلا امتیاز اہل شخص کو تعینات کر دیا جائے۔ لیکن علامہ اقبال نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے برٹش آفیسروں کی تعداد میں اضافے کی تجویز پیش کی۔[16] حالانکہ اس سے قبل اختلاف کے باوجود محمد علی قیامِ امن کے سلسلے میں علامہ اقبال کے بیانات کی تعریف کر چکے تھے۔ 8 مئی 1927ء کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ کسطرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر و تحمل کی تلقین فرمائی ہے۔ تو میرے دل سے ایک سچے محبِ وطن کیلئے دعا نکلی۔ کاش میں اسی وقت اسکی بھی دعا مانگ لیتا کہ لاہور کے مسلمان انکی نصیحت پر آخر تک عمل پیرا ہیں۔"[17]

فسادات لاہور کے سلسلے میں محمد علی کا کہنا تھا کہ مسلمانوں نے برائی کا بدلہ برائی سے دیا، جو غلط ہے۔ سائمن کمیشن کی آمد پر کشیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ محمد علی سائمن کمیشن کو ملک میں افتراق و انتشار کا ایک نیا شاخسانہ تصور کرتے تھے۔ لیکن علامہ اقبال اس سے مفید نتائج پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ اسلیئے انہوں نے کمیشن کے ساتھ تعاون کیا اور اسکے خیر مقدم کی اپیل کی۔ علامہ اقبال کی یہ اپیل محمد علی کیلئے گویا۔

ع سمندِ شوق کو اک اور تازیانہ ہوا۔

ان اختلافات کے باوجود محمد علی علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے انکاری نہ تھے۔ وہ علامہ اقبال کے اسلامی افکار اور شاعرانہ

حسن و جمال کے گرویدہ تھے۔ عبدالطیف اعظمی لکھتے ہیں کہ :۔

"علامہ اقبال کی شاعری سے محمد علی اس قدر متاثر تھے کہ جامع ملیہ کے طلباء کو
پڑھاتے ہوئے قدم قدم پر اقبال کے اشعار پڑھتے اور لطف لے لے کر سناتے"

اس سلسلے میں اسرار خودی، رموز بے خودی، بانگ درا اور علامہ اقبال کی دیگر تصنیف پر اخبار "ہمدرد" میں محمد علی کے مثبت تبصرے قابلِ ذکر ہیں۔ یہی نہیں محمد علی نے نہ صرف علامہ صاحب کے کلام کو اپنی اردو، انگریزی تحریروں اور خطوط میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور اپنی نگارشات کی تزئین کا کام لیا ہے۔ بلکہ کلامِ اقبال کے ادبی محور فکری و شعری محاسن نے انکے ذہین و فکر پر بھی بڑا اثر ڈالا ہے۔

محمد علی اور خواجہ حسن نظامی میں ہمیشہ نظریاتی اختلاف رہا۔ لیکن محمد علی مذہب کو سیاسی و نظریاتی اختلاف پر فوقیت دیتے تھے۔ جب خواجہ صاحب نے انسداد آتشبازی کے سلسلے میں اصلاحی تحریک شروع کی تو محمد علی نے "ہمدرد" کے سب ایڈیٹر کو حکم دیا کہ اس تحریک سے متعلق تمام اعلانات، اشتہارات اور پوسٹر دغیرہ بلا معاوضہ شائع کئے جائیں۔ حتیٰ کہ دہلی خلافت کمیٹی کو اس نیک کام کی حمایت کیلئے وقف کر دیا۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اگر دہلی خلافت کمیٹی کی حمایت شاملِ حال نہ ہوتی تو خواجہ صاحب کو اسقدر غیر معمولی کامیابی نہ ہوتی۔ پھر جب خواجہ صاحب کی جدت آفرین طبیعت نے آتشبازی کے جنازے کی تجویز پیش کی، توبقول خواجہ حسن نظامی

"محمد علی نے اسکی حمایت کی اور خود جلسہ اور جلوس میں شریک ہوئے جو اس جنازہ
کو جمنا کے کنارے دفن کرنے گیا تھا۔"[18]

ان حقائق کی روشنی میں محمد علی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جس شخص کے بارے میں ایک بار غلط یا صحیح، جو رائے قائم کر لیتے تھے اسپر ہمیشہ قائم رہتے تھے۔ کم علمی، تنگ نظری اور تعصب کے مترادف ہے۔

سیکولر نظریات کے پروردہ نیازی برکس، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر بابور اور پروفیسر فرانسس رابنسن وغیرہ نے بھی محمد علی کو مذہب اور تحریک خلافت کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔[19] لیکن تحقیق کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ ان الزامات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ محمد علی کے بارے میں مسٹر رابنسن کے الزامات کی فہرست کچھ زیادہ ہی طویل ہے۔ انکا کہنا ہے کہ محمد علی کے اخباروں نے "مسلم تخریبی سیاست" کو جنم دیا۔ سرکاری ملازمتوں میں ناکامی، ترکی کی امداد میں ناکامی، تقسیم تنسیخ بنگال اور مسلم یونیورسٹی اسکیم کو رد کئے جانے پر محمد علی نے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو مشتعل کیا۔ سید امیر علی سے رشوت لی اور مرکزی خلافت کمیٹی کے فنڈز کو خرد برد کر کے ذاتی "عیش و عشرت" میں لائے۔[20] لیکن محمد علی کی زندگی کے تمام حالات و واقعات کی روشنی میں ایک قاری فوری طور پر تجزیہ کر سکتا ہے کہ ان الزامات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ محمد صادق، میم کمال او کے، افضل اقبال، پروفیسر گن گور، پی ہارڈی اور جی منیالٹ کی تحقیقات، شواہد اور ٹھوس دلائل سے بھی ان الزامات کی نفی ہو جاتی ہے۔[21] جنکا مقصد سوائے محمد علی کو بدنام کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ نام نہاد اور فرضی تحقیقات جو اصل دستاویزات اور ماخذ کو دیکھے اور پڑھے بغیر سطحی طور پر کی جاتی ہیں۔ وہ یقیناً سازشوں، دباؤ، تعصب و عناد اور تنگ نظری کی بنیاد پر دائرہ تحریر میں لائی جاتی ہیں۔ جو نا مکمل، ناقص، نا قابلِ اعتماد اور گمراہ کن ہوتی

ہیں۔ جن میں اصل حقائق کو چھپا کر سادہ اور لاعلم لوگوں کو بھکایا اور بھڑکایا جاتا ہے۔ حالانکہ حقائق کو چھپانا بہت بڑی علمی بددیانتی ہے۔ بقول اتاترک

"تاریخ لکھنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ تاریخ بنانا۔ تاریخ لکھنے والا، بنانے والے کے ساتھ ایمانداری سے پیش نہ آئے، تو نہ بدلنے والے حقائق بالکل ہی عجیب و غریب شکل اختیار کر سکتے ہیں۔" [22]

محمد علی کے مخالفین و معترضین نے بھی جانبداری، تنگ نظری و تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل حقائق کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

محمد علی کے خلافتی و سیاسی کردار کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ آزادی کامل اور جمہوریت کے خواہاں تھے۔ جمہوریت کی کامیابی کیلئے انہوں نے پانچ نکات پر خصوصی زور دیا۔

1. ہندو مسلم اتحاد
2. اقلیتوں میں احساس سلامتی
3. نسل پرستی سے علیحدگی
4. تعلیم میں سدھار
5. رائے عامہ کی تربیت

محمد علی کا کہنا تھا کہ جب تک ہندو مسلم اتحاد نہیں ہوتا۔ غلامی سے نجات ناممکن ہے۔ وہ تمام عمر ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشاں رہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہر طرح سے سمجھایا کہ جب تک باہمی اتحاد نہ ہوگا ملک آزاد نہ ہوگا۔ محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"جب تک ہم میں یکجہتی پیدا نہ ہوگی۔ ہم آزادی ہند کے دشمنوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔" [23]

محمد علی نے اجلاس کوکناڈا میں خطبہ صدارت کے دوران کہا کہ :۔

"مسلمانوں کو اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہم باہر سے آنے والوں کا مقابلہ کریں گے اور اسطرح ہندوؤں کو بھی اعلان کر دینا چاہیے کہ ہم بھی مسلمانوں کو غلام نہ بنائیں گے ---- مخالفت کی بنا پر اتحاد کمزور ہو جاتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد ایک پائیدار بنیاد پر قائم ہو۔" [24]

محمد علی اپنے عہد کے دیگر رہنماؤں علامہ اقبال (1877ء -1938ء)، محمد علی جناح (1876ء -1948ء)، ابو الکلام آزاد (1888ء -1958ء)، حکیم اجمل خان (1863ء -1928ء)، ڈاکٹر انصاری (1880ء -1936ء) اور شوکت علی (1872ء-1938ء) وغیرہ کی طرح ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور مبلغ تھے۔ انہوں نے ہندو مسلم کشیدگی دور کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی۔ اتحاد کانفرنسوں کا سہارا لیا۔ آل پارٹیز کانفرنس طلب کی، جسکا مقصد ہندو مسلم اتحاد کیلئے قابلِ عمل تجاویز پیش کرنا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے تعصب، تنگ نظری، ہٹ دھرمی، اور عددی برتری کے زعم کی وجہ سے تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ ایک عرصہ تک گاندھی کے بارے میں محمد علی کا یہ حسنِ ظن رہا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن واقعات و تجربات نے محمد علی کے اس حسنِ ظن کو بری طرح مجروح کیا۔ گاندھی تو سیاسی حکمت عملی کے تحت محض اسٹینڈنٹ کے طور پر ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپتے تھے، قطعاً مخلص نہ تھے۔ ہندو مسلم

فسادات پر گاندھی کے طرز عمل اور جانبداری نے محمد علی کو چونکا دیا۔ بالآخر 1928ء میں محمد علی نے اپنی حکمت علمی تبدیل کی۔ اور کانگریس سے بھی مستعفی ہو گئے۔

محمد علی کے نزدیک سیاست کے معنی محض حکومت و قوت کا حصول نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہ سیاست پوری انسانی زندگی سے متعلق اور اسپر محیط ہے۔ بالخصوص مذہب تعلیم اور سیاست ایک دوسرے کو ہر وقت متاثر کرتے رہتے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ محمد علی کے نزدیک سیاست کا مرکزی مقصد خالص تعلیمی تھا۔ انکی سوچ یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ حکومت واقتدار انکے ہاتھوں سے چھن گئے ہیں۔ بلکہ ایک نئی اور زندہ تہذیب سے تصادم کے طور پر خود اپنی تہذیبی زندگی کو باقی رکھنا اور اسکی تشکیلِ نو کا اہتمام ہے۔ محمد علی کے نزدیک سیاسی خود مختاری اور آزادی کا حصول اسلیئے ضروری تھا کہ اس نشاط ثانیہ کا خمیر خود اپنی مرضی، مزاج اور شعوری کوششوں سے اٹھایا جا سکے۔ اسطرح سیاست انکے لئے بجائے خود ایک مقصد نہ تھی، بلکہ ایک وسیلہ تھی۔ اسلیئے محمد علی نے جب بھی سیاست کا تذکرہ کیا۔ تو وہ مذہب کی بات کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ مسلمانوں کی سیاست کو مذہب کی ترویج و ترقی کیلئے ایک وسیلے کی حیثیت دیتے تھے۔ اور سیاست کا عمل دخل صرف قوتِ اختیاری کی حد تک، جسکے حصول کے بعد مسلمانوں کو انکی مرضی کے مطابق زندگی کی تشکیل کا موقع مل سکے۔ محمد علی کا نظریہ تھا کہ زندگی کی تشکیل، اسکا پروان چڑھنا اور اسکو صحیح خطوط پر استوار کرنا۔ سیاست کا نہیں بلکہ تعلیم کا کام ہے۔ وہ سید احمد خان کی طرح مسلمانوں کیلئے تعلیم کو اسلیئے ضروری قرار دیتے تھے کہ ان میں خود شناسی کا مادہ پیدا ہو سکے۔ تاکہ وہ ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ محمد علی اس کوشش میں تھے کہ اپنی تہذیب کو اصل بنیاد بنا کر جدید اثرات کے ذریعے اسکی نشو و نما کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اپنی تہذیب کو مغربی تہذیب سے بدل دیا جائے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ بقول سید عابد حسن

> "جامعہ ملیہ دو تحریکوں کے ملنے سے وجود میں آئی ایک تو تعلیمی آزادی اور ذہنی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کے دینی مدارس میں عملی شکل میں اور دنیوی مدارس خصوصاً علی گڑھ کالج میں ایک نصب العین کی صورت میں موجود تھی۔ دوسرے سیاسی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک جسے مسلمانوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد اختیار کیا۔"[25]

محمد علی نے اپنے تعلیمی افکار و نظریات کو ایک کتابچہ کی شکل میں منضبط کیا۔ جسکا عنوان تھا "ہندوستان میں مسلمان قومی تعلیمی اداروں کیلئے مجوزہ نصاب"[26] انہوں نے گوناگوں سیاسی مصروفیات کے باوجود تعلیمی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ دراصل انکی سیاست کا مرکز و محور مذہب اور تعلیم تھا۔ محمد علی کا یہ کتابچہ دو پہلوؤں سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اولاً یہ ہمارے قومی تعلیمی نظام کی تشکیل اور نصاب کی تدوین میں رہنمائی کرتا ہے۔ ثانیاً اسکے ذریعے محمد علی ایک تعلیمی مفکر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کے زمانہ طالب علمی میں جدید تعلیم کے بارے میں محمد علی کا وہ مضمون جو رامپور اسٹیٹ گزٹ میں شائع ہوا، علی گڑھ کالج میں درس و تدریس کی خواہش، بطورِ آفسر اعلیٰ محکمہ تعلیمات رامپور میں تعلیمی اصلاحات کے نفاذ کی کوششیں اور آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستگی اس کی واضح مثالیں ہیں۔

محمد علی زندگی کے ہر مسئلے کا حل خواہ سیاسی ہو یا تعلیمی، معاشی ہو یا معاشرتی، مذہب کی روشنی میں تلاش کرتے۔ خواہ اسکے لئے انہیں کتنی ہی مخالفت کیوں نہ مول لینا پڑے۔ کلکتہ خلافت کانفرنس کے موقع پر انہوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"میں مذہب کو ایک زندہ اور ناقابل انکار حقیقت سمجھتا ہوں۔۔۔ میں اپنے فہم وادراک کی رہنمائی کیلئے کارل مارکس اور لینن کا محتاج نہیں ہوں، نیٹشے اور برگساں کا دست نگر نہیں ہوں۔ بلکہ میرے فکر و نظر کا محور صرف حضور رسالت مآب ﷺ کا فلسفہ حیات ہے۔"[27]

؎ نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے
کہ بس نام محمد ﷺ مرتے دم وردِ زباں پایا[28]

محمد علی کے خیالات کا سرچشمہ اسلامی تصور حیات تھا۔ انہیں مذہب وسیاست دونوں سے عشق تھا۔ وہ آزادی وطن کیلئے بھی بیقرار تھے اور قرطبہ وبغداد اور دمشق وقسطنطنیہ کی مٹتی ہوئی عظمتوں کو زندہ پائندہ دیکھنے کے خواہش مند بھی تھے۔ وہ مذہب وسیاست کو ملازم وملزوم قرار دیتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کے نزدیک محمد علی کا ایسا کرنا غلط تھا۔ حالانکہ وہ خود اس سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ کانگریس اور ہندوؤں نے مذہب کو دورِ قدیم سے اپنایا ہوا تھا۔ محمد علی نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں اس اعتراض کا جواب دیا۔ انہوں نے بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا کہ :۔

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مذہب دانتوں اور مسواک جیسا ہو جائے کہ ایک دوسرے کا دانتوں یا مسواک سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ایک نجی اور خانگی چیز ہو جائے۔ اور پبلک معاملات سے اسکو سروکار نہ رہے۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو اپنے مذہب کے عقیدے کی بنا پر مسلمانوں کو خود انکی گائے ذبح کرنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مذہب ساری زندگی کی تفصیل ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ سے اسکا تعلق ہے۔"[29]

محمد علی سیاست ومذہب کی ہم آہنگی کے قائل تھے۔ انہوں نے طرز حکومت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"میں تھیوکریسی (مذہبی حکومت) پر اعتماد رکھتا ہوں۔ میرا بادشاہ کون ہے۔ سب سے پہلے میرا بادشاہ خدا ہے اور خدا نے مجھے ویسا ہی آزاد پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ جارج پنجم کو۔"[30]

یہ محمد علی کا جذبہ ایمانی تھا کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی ہمت نہ ہارتے۔ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ خود کہتے ہیں کہ :۔

؎ امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہے وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

محمد علی کے افکار و جذبات پر حزن و یاس اور ترک و تعطل کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ نصرتِ خداوندی پر یقین کامل کی

حوالہ جات

1 - رئیس احمد جعفری : نگارشات محمدعلی۔ (حیدرآباد دکن-1944ء) ص ص.155-56

II- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : مولانا محمدعلی کی یاد میں۔ (اعظم گڑھ-1982ء) ص ص.149-50

2- روزنامہ : کامریڈ۔ دہلی۔ 4 ستمبر 1925

II- رئیس احمد جعفری : اوراق گم گشتہ۔ (لاہور-1968ء) ص.343

III- ، ، ، : کاروان گم گشتہ۔ (کراچی-1971ء) ص ص.209-10

3- عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص ص.139-40

II- سید محمود آزاد : حیات جوہر۔ (راولپنڈی-1979ء) ص.132

4- ہفت روزہ : اہل حدیث۔ امرتسر۔ نومبر 1919ء ص.12

5- روزنامہ : زمیندار۔ لاہور۔ 19 اگست 1920ء ص.2

6- محمد مصطفیٰ رضا خان قادری : الطاری الداری لھفوات عبدالباری۔ حصہ اول۔ (بریلی-1339ھ) ص.24

7- روزنامہ : پیسہ اخبار۔ لاہور۔ 18 جولائی 1920ء ص.2

8- : علی گڑھ گزٹ۔ 13 جون 1924ء (بحوالہ الطاری الداری۔ حصہ سوم۔ ص.131)

9- محمد طفیل : نقوش۔ شخصیات نمبر۔ (لاہور-1956ء) ص.351

10- روزنامہ : دبدبہ سکندری۔ رام پور۔ یکم نومبر 1920

11- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.305

12- عبدالماجد دریابادی : محمدعلی: ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ دوم۔ (اعظم گڑھ-1952ء) ص-151

II- سید نظر برنی : مولانا محمدعلی شخصیت اور خدمات۔ (دہلی-1971ء) ص.177

III- آفتاب مجی : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1952ء) ص.109

13- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص.169

II- ماہنامہ : نگار پاکستان۔ کراچی۔ جنوری 2000ء

14- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.357-58

II- رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.395

III- سہ ماہی : العلم۔ جوہر نمبر۔ اکتوبر تا دسمبر-1979ء ص ص.69-71

IV- ماہنامہ : الجامعہ۔ جوہر نمبر۔ دہلی۔ جلد دوم۔ جنوری۔فروری1980ء
ص ص.131-33

V- مجلہ : پاکستان نمبر۔ حصہ اول۔ گورنمنٹ سٹی کالج کراچی 1983 ص ص.209-20

15- چودھری خلیق الزماں : شاہراہ پاکستان۔ (کراچی-1967ء) ص.467

16- ابو سلیمان شاہجہانپوری : علامہ اقبال اور مولانا محمد علی۔ (کراچی-1984ء) ص ص.46-81

17- روزنامہ : ہمدرد۔ 8 مئی 1927ء فسادات لاہور۔

18- مولانا اسد القادری : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1986ء) ص.47

II- روزنامہ : غریبوں کا اخبار۔ دہلی۔

III- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص ص.174-75

IV- حمیدہ ریاض : محمد علی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص ص.94-95

Niyazi Berkes : ***Development of Secularism in Turkey.*** (MeGill-1964) -19
PP-210-17

Y.H.Bayur : ***Hindistan Tariki-C-I.*** (Ankara-1946) P-127 -II

Mohammad Mujeeb : ***The India Muslims.*** (Londra-1967) P-235 -III

Francis Robinson : Separatism among Indian Muslims London 1974 PP-371-74 -IV

B.N Pandey : ***Leadership in South Asia.*** (Delhi-1977) PP-375-79 -20

(Francis Robinson : ***17 Professional Politicians in MuslimPolitics-1911-1923.***)

Mohammad Sadiq: ***The Turkish revolultion and The Freedom Movement.*** -21
(Delhi-1983) P-78

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammad Ali.*** (Lahore-1979) PP-293-94 -II

G. Gangor : ***Islam in Bugunku Meseldcri.*** (اسلام کے موجودہ مسائل) -III
(Istambul-1966) P-155

P. Hardy : ***The Muslims of British India.*** (Cambridge-1972) PP-179-80 -IV

Gail Minault : ***The Khilafate Movement.*** (Bombay-1982) PP- -V

VI- میم کمال او۔ کے : تحریک خلافت1919-1924ء (کراچی-1991ء) ص ص.233-36

22- میم کمال او۔ کے : تحریک خلافت1919-1924ء (کراچی-1991ء) ص.241

23- روزنامہ : ہمدرد۔ 15نومبر1926ء

II- ثروت صولت : ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ (لاہور-1983ء) ص.88-90

24- روزنامہ : ہمدرد۔ 7جنوری-1927

II- سید صباح الدین عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.161-62

III- گلشیر خان : محمد علی جوہر۔ (برار-س ن) ص ص.113-14

25- رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (لاہور-1963ء) ص ص

26- محمد علی جوہر : قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام۔ (دہلی-1924ء) ص ص.53-55

27- خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.128-29

28- دوست قدوائی : گنجینہ جوہر۔ (کراچی-1950ء) ص.127

II- نورالرحمٰن : دیوان جوہر۔ (پشاور-1967ء) ص.54

29- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء) ص ص.229-31

30- محمد سرور : مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940ء) ص ص.215-16

کتابیات

اعرانی، احسن : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1954ء)

افضل، رفیق : گفتار اقبال۔ (لاہور-1969ء)

انجم، زاہد حسین : انسائیکلو پیڈیا۔ (لاہور-1988ء)

احمد، سید نور : مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ (لاہور-1966ء)

اظہر، سید اشتیاق : تاریخ کانپور۔ (کراچی-1990ء)

آزاد، سید محمود احمد : حیات جوہر۔ (راولپنڈی-1979ء)

الحذیفی، شیخ عبدالرحمٰن : خطبته جمعته المبارک۔ (ذی قعدہ 1418ھ مدینہ منورمسجد نبویؐ)

اکرام، شیخ محمد : موج کوثر۔ (لاہور-1984ء)

ایبک، ظفر حسن : آپ بیتی۔ حصہ اول۔ (لاہور-س ن)

ارشد، عبدالرشید : بیس بڑے مسلمان۔ (لاہور-1975ء)

ارشد، عبدالرشید : مقدمہ کراچی و قول فیصل۔ مقدمات و بیانات اکابر۔ (لاہور-1975ء)

اعظمی، عبداللطیف : مولانا محمد علی : ایک مطالعہ۔ (دہلی-1980ء)

احمد، محمد سلیم : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء)

ایاز، مقصود، محمد ناصر : شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا۔ (لاہور-1987ء)

او کے، میم کمال : تحریک خلافت۔ (کراچی-1991ء)

اقبال، محمد : کلیات اقبال۔ (لاہور-1975ء)

احمد، منشی مشتاق : بیان مولانا محمد علی۔ (میرٹھ-س ن)

اسد القادری، مولانا : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1986ء)

احمد، وصی : مطالعہ تاریخ پاکستان۔ (کراچی-1985ء)

: اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد 19 (لاہور-1986ء)

بریلوی، احمد رضا خان : اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام۔ (بریلی-1306ھ)

بچی، آفتاب : مولانا محمد علی جوہر۔ (لاہور-1952ء)

بایور، وائی۔ایچ : بیسویں صدی میں ترکی کی تاریخ اور عالمی سیاست پر چھوڑے ہوئے اثرات۔ (انقرہ-1974ء)

برنی، سید نظر : مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات۔ (دہلی-1971ء)

بریلوی، سید الطاف : علی گڑھ تحریکیں اور قومی نظمیں۔ (کراچی-1970ء)

بریلوی، سید مصطفیٰ : انگریزوں کی لسانی پالیسی۔ (کراچی-1970ء)

برنی، ضیاء الدین : عظمت رفتہ۔ (کراچی-1961ء)

بٹالوی، عاشق حسین : ہماری قومی جدوجہد۔ (لاہور-1966ء)

بیگ، میرزا عبدالقادر : مقدمہ کراچی۔ (لکھنو-1985ء)

پیرزادہ، شریف الدین : پاکستان منزل بہ منزل۔ (کراچی-1965ء)

تھانوی، محمد اشرف علی : تحذیر الاخوان عن الربوافی الہندوستان۔ (تھانہ بھون-س ن)

جعفری، رئیس احمد : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء)

. . . : کاروان گم گشتہ۔ (کراچی-1971ء)

. . . : علی برادران۔ (لاہور-1963ء)

. . . : اوراق گم گشتہ۔ (لاہور-1968ء)

. . . : سر سید سے قائداعظم تک۔ (لاہور-1970ء)

. . . : خطبات محمدعلی۔ (کراچی-1950ء)

. . . : تقاریر محمد علی۔ حصہ اول۔ (لاہور-1954ء)

. . . : تقاریر محمدعلی۔ حصہ دوم۔ (لاہور-1954ء)

. . . : مقالات محمد علی۔ حصہ اول۔ (حیدرآباد دکن-1943ء)

. . . : مقالات محمدعلی۔ حصہ دوم۔ (حیدرآباد دکن-1943ء)

. . . : مطائبات محمدعلی۔ (حیدرآباد دکن-1945ء)

. . . : نگارشات محمدعلی۔ (حیدرآباد دکن-1944ء)

افادات محمد علی (حیدرآباد دکن۔ س ن)

. . . : ثام راج سے رام راج تک۔ (لاہور-س ن)

جامعی، عزیز الرحمٰن : جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین۔ حصہ دوم۔ (کراچی-1975ء)

جوہر، محمد علی : قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام۔ (دہلی-1924ء)

جوہر، محمد علی : ہندوستان کی سیاسی الجھنیں (مترجم منیر احمد شاہین) (حیدرآباد دکن-1947ء)

جوہر، محمد علی : خطبہ صدارت۔ دہلی واجمیر میواڑ پولیٹکل دوسری کانفرنس۔ (جامعہ دہلی-1931ء)

جامپوری، واحد ندوی : یادوں کے چراغ۔ (ڈیرہ غازی خان-1967)

چراغ، محمد علی : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1979ء)

چراغ، محمد علی : تاریخ پاکستان۔ (لاہور-1993ء)

حالی، الطاف حسین : حیات جاوید۔ (لاہور-1966ء)

حسین، مرزا اختر : تاریخ مسلم لیگ۔ (بمبئی-1940ء)

خان، ایچ۔ بی : برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار۔ (اسلام آباد-1985ء)

خلیق الزماں، چودھری : شاہراہِ پاکستان۔ (کراچی-1967ء)

خانم، خالدہ ادیب : ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش۔ (لاہور-1963ء)

خان، عبدالوحید : مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی۔ (لکھنو-1938ء)

خان، عبدالوحید : تقسیمِ ہند۔ (لاہور-1969ء)

خان، گلشیر : مولانا محمدعلی جوہر۔ (برار-س ن)

خورشید، عبدالسلام : تاریخ تحریک پاکستان۔ حصہ اول۔ (اسلام آباد-1993ء)

روشن آراء راؤ

خان، محمد اکرام اللہ : وقارِ حیات۔ (علی گڑھ-1925ء)

خان، مولانا ظفر علی : رپورٹ وفدِ حجاز-1926ء۔ (لاہور-س ن)

داس، راج موہن : مسلم افکار۔ (مترجم: محمد فاروق قریشی) (لاہور-1996ء)

دہلوی، شاہ عبدالعزیز : فتاوی عزیزی۔ جلد اول۔ (دہلی-1239ھ)

درانی، عطش : پاکستان ایک نظریہ ، ایک تحریک۔ (لاہور-1983ء)

دریابادی، عبدالماجد : خطوطِ مشاہیر۔ (لاہور-1944ء)

،، ،، : محمد علی : ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول۔ (اعظم گڑھ-1952ء)

،، ،، : محمد علی : ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ دوم۔ (اعظم گڑھ-1952ء)

دہلوی، محمد مرزا : مسلمانانِ ہند میں حیات سیاسی۔ (دہلی-1940ء)

زبیری، محمد امین : سیاستِ ملیہ۔ (آگرہ-1941ء)

،، ،، ،، : تذکرۂ محسن۔ (لاہور-1991ء)

،، ،، ،، : حیاتِ محسن۔ (علی گڑھ-1934ء)

،، ،، ،، : تذکرۂ محسن۔ (دہلی-1935ء)

،، ،، ،، : تذکرہ وقار الملک۔ (اٹاوہ-1925ء)

ذوالفقار، غلام حسین : موہن داس کرم چند گاندھی۔ (لاہور-1994ء)

،، ،، ،، : جلیانوالہ باغ کا قتل اور مظالم پنجاب۔ (لاہور-1996ء)

روزینہ، پروین : جمعیت العلماء ہند ، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے 1919-1945۔ جلد اول۔ (اسلام آباد-1980ء)

ریاض، حمیدہ : محمد علی جوہر۔ (ناگپور-1988ء)

ریاض، سید حسن : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء)

رضوی، سید آل احمد : عظمتِ رفتہ۔ (ایبٹ آباد-1994ء)

رحمانی، عشرت : محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1985ء)

،، ،، : پاکستان سے پاکستان تک۔ (لاہور-1984ء)

سعید، احمد : حصولِ پاکستان۔ (لاہور-1975ء)

سعید، احمد : گفتارِ قائداعظم۔ (اسلام آباد-1976ء)

سالک، عبدالمجید : یارانِ کہن۔ (لاہور-1955ء)

سوہدروی، نسیم : علی گڑھ کے تین نامور فرزند۔ (لاہور-1976ء)

سرور، محمد : مولانا محمدعلی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء)

، ، ، : محمدعلی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941ء)

، ، ، : خطوطِ محمدعلی۔ (دہلی-1940ء)

، ، ، : مضامین محمدعلی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1938ء)

، ، ، : مضامین محمدعلی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1940ء)

، ، ، : مسلمان اور غیر مسلم حکومت۔ (لاہور-1947ء)

شوق، احمد علی خان : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء)

شاہجہانپوری، ابو سلیمان : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمدعلی جوہر (سیاسی)۔ (کراچی-1978ء)

، ، ، : مولانا محمدعلی اور انکی صحافت۔ (کراچی-1983ء)

، ، ، : علامہ اقبال اور مولانا محمدعلی۔ (کراچی-1984ء)

، ، ، : تحریك نظمِ جماعت۔ (کراچی-1986ء)

شاہ، سید دربار علی : ہجرت افغانستان۔ (کراچی-1977ء)

شہابی، مفتی انتظام اللہ : مشاہیر جنگ آزادی۔ (کراچی-1957ء)

صدیقی، اقبال احمد : قائداعظم اور انکے سیاسی رفقاء۔ (کراچی-1990ء)

صولت، ثروت : ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ حصہ دوم۔ (لاہور-1983ء)

صدیقی، ثناالحق : محمدعلی جوہر : حیات اور تعلیمی نظریات۔ (کراچی-1998ء)

صدیقی، رشید احمد : گنج ہائے گرانمایہ۔ (لاہور-1967ء)

طفیل، محمد : نقوش۔ شخصیات نمبر۔ (لاہور-1956ء)

طفیل، محمد : نقوش۔ آپبیتی نمبر۔ جلد اول۔ (لاہور-1964ء)

عبدالرحمٰن، ابو رحمت : معرکہ سیاست و خلافت۔ (امرتسر-س ن)

عزیز، خورشید کمال : مبادیات مدنیت۔ (لاہور-1941ء)

عباس، خواجہ احمد : مختصر سوانح حیات شہد رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم۔ (دہلی-1936ء)

عبدالغفار، قاضی : حیات اجمل۔ (علی گڑھ-1950ء)

عباسی، قاضی محمد عدیل : تحریک خلافت۔ (لاہور-1986ء)

عبدالحق، مولوی : چند ہم عصر۔ (کراچی-1970ء)

عقیل، معین الدین : مسلمانوں کی جدوجہد آزادی۔ (لاہور-1981ء)

عبدالرحمٰن، منشی : معماران پاکستان۔ (لاہور-1976ء)

عباسی، محمود احمد : تحقیق الانساب۔ (دہلی-1932ء)

عباسی، محمود احمد : تاریخ امروہہ۔ جلد اول۔ (دہلی-1932ء)

عباسی، محمود احمد : تذکرۃ الکرام۔ (دہلی-1930ء)

عوامی، نشتر : حیات جوہر۔ (علی گڑھ-1931ء)

غوری، رفیق : جب پاکستان بن رہا تھا۔ (لاہور-1982ء)

فتحپوری، فرمان : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء)

فاراتی، محمد الیاس : برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء۔ (کراچی-1968ء)

فیروز سنز : اردوانسائیکلوپیڈیا۔ (لاہور-1987ء)

قریشی، اشتیاق حسین : برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1967ء)
(مترجم : ہلال احمد زبیری)

قریشی، اشتیاق حسین : جدو جہد پاکستان۔ (مترجم : ہلال احمد زبیری) (کراچی-1990ء)

قدوائی، دوست : گنجینہ جوہر۔ (کراچی-1950ء)

قدوائی، رفیع احمد : رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس۔ (دہلی-1928ء)

قادری، سید شاہ محمد : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1998ء)

قادری، محمد جلال الدین : ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست۔ (لاہور-1980ء)

قصوری، محمد صادق : تحریک پاکستان اور علماء کرام۔ (لاہور-1999ء)

قصوری، محمد صادق : اکابرین تحریک پاکستان۔ (گجرات-1976ء)

قادری، محمد مصطفیٰ رضا خان : الطاری الداری لہفوات عبدالباری۔ حصہ اول۔ (بریلی-1339ھ)

گیلانی، سید اسعد : برصغیر میں بیداری ملت کی تحریکیں۔ (لاہور-1985ء)

گاندھی، ایم۔اے : تلاشِ حق۔ (مترجم : سید عابد حسن) حصہ دوم۔ (دہلی-1938ء)

گاندھی، مہاتما : تلاشِ حق۔ آپ بیتی۔ (لاہور-1993ء)

لین پول، اسٹینلے : سلاطین ترکیہ تا خاتمہ خلافت۔ (مترجم نصیب اختر) (کراچی-1975ء)

لکھیم پوری، مسعود حسن : عندلیب تواریخ۔ (الہ آباد-1963ء)

لکھنوی، مرزا ابوالحسن : مسٹر محمدعلی (نظر بند چھندواڑہ) سوانح عمری اور خدمات۔ (کلکتہ-1952ء)

مودودی، آل حسن : نُخبَتہ التواریخ۔ (امروہہ-1297ھ)

مرزا، جانباز : حیات امیر شریعت۔ (لاہور-1976ء)

مہر، خورشید علی : سیرت محمدعلی۔ حصہ اول۔ (دہلی-1931ء)

مہر، خورشید علی : درسِ آزادی۔ حصہ دوم۔ (دہلی-1932ء)

محمود، راجا رشید : تحریک ہجرت -1920ء۔ (لاہور-1986ء)

محمود، سید : خلافت اور انگلستان۔ (پٹنہ-س ن)

مہر، غلام رسول : مطالب بانگ درا۔ (لاہور-1976ء)

مہر، غلام رسول : تبرکات آزاد۔ (لاہور-1975ء)

میاں، محمد : جمعیت العلماء کیا ہے۔ (دہلی-1946ء)

مظہر، ولی : عظمتوں کے چراغ۔ حصہ دوم۔ (ملتان-1988ء)

مظہر، ولی : ہماری تحریکیں۔ (ملتان-1991ء)

: مقالات صدی کانفرنس۔ بر مولانا محمد علی جوہر۔ (کراچی-1988ء)

: مجاہد اعظم۔ مولانا محمد علی جوہر۔ (کراچی-1985ء)

: مقالات یوم جوہر۔ اتر پردیش اکیڈیمی۔ (لکھنو-1983ء)

نہرو، جواہر لعل : میری کہانی۔ حصہ اول۔ (لاہور-1996ء)

ندوی، حبیب : رئیس الاحرار مولانا محمدعلی جوہر کے آخری الفاظ۔ (کراچی-1963ء)

نقشبندی، سید عزیز حسن : حالات علی برادران۔ (دہلی-1942ء)

ندوی، سید سلیمان : برید فرنگ۔ (کراچی-1956ء)

ندوی، سید سلیمان : یاد رفتگاں۔ (کراچی-1983ء)

نشتر، کلیم : ہمارے محمدعلی جوہر۔ (لاہور-س ن)

نور الرحمٰن : انتخاب مضامین جوہر۔ (علی گڑھ 23-1922ء)

نسیم، الطفر : شب چراغ : پاکستان کا پس منظر و پیش منظر۔ (لاہور-1954ء)

وساہن، پرتھوی لاجپت رائے : مولانا محمدعلی۔ (لاہور-1962ء)

واصف، حفیظ الرحمٰن : جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ۔ (دہلی-1969ء)

ولیمس، رشبرک : مرقع ہند بابت1920ء۔ (مترجم عبدالماجد دریابادی) (لکھنو-1922ء)

ہنٹر، ڈبلیو-ڈبلیو : ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ (مترجم : صادق حسین) (لاہور-1955ء)

ہادی، سید محمد : علی برادران اور انکا زمانہ۔ (دہلی-1978ء)

ہاشمی، ظفر : ہمارے سیاستدان۔ (لاہور-1949ء)

یوسفی، اللہ بخش : سرحد اور جدوجہد آزادی۔ (لاہور-1968ء)

یامین، محمد : نامہ اعمال۔ (لاہور-1970ء)

ماہنامے، سہ ماہی، مجلّے

ماہنامہ	:	انجمن اسلامیہ۔	لاہور۔	جوہر نمبر۔	فروری-1966ء
، ،	:	انجمن اسلامیہ۔	،	، ،	اکتوبر-1974ء
، ،	:	انجمن اسلامیہ۔	،	، ،	اکتوبر-1976ء
ماہنامہ	:	الحق۔	اکوڑہ خٹک۔	پشاور۔	جنوری-1975ء
، ،	:	الحق۔	،	، ،	نومبر۔دسمبر-1975ء
ماہنامہ	:	الجامعہ۔	دہلی۔	جوہر نمبر۔	اپریل-1979ء
ماہنامہ	:	بدایوں۔	کراچی۔		جولائی-1995ء
ماہنامہ	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1984ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	فروری-1985ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1988ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1990ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1991ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	اکتوبر-1991ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1992ء
، ،	:	تہذیب۔	،	، ،	جنوری-1993ء
ماہنامہ	:	تہذیب الاخلاق۔	لاہور۔	جوہر نمبر۔	اپریل-1966ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	مئی-1977ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	فروری۔مارچ-1979ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	جنوری-1990ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	اپریل-1991ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	جنوری-1995ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	جنوری-1996ء
، ،	:	تہذیب الاخلاق۔	،	، ،	جنوری-1997ء
ماہنامہ	:	حریت۔	اسلام آباد۔	یوم آزادی نمبر۔ حصہ اول۔	اگست-1982ء
ماہنامہ	:	صدق۔	لکھنو۔		20 فروری-1946ء
ماہنامہ	:	علی گڑھ میگزین۔			جنوری-1936ء
ماہنامہ	:	ماہ نو۔	کراچی۔		مارچ-1968ء

ماہنامہ	: معارف۔	اعظم گڑھ۔		جنوری-1931ء
، ،	: معارف۔	، ،		جون-1931ء
، ،	: معارف۔	، ،		جولائی-1931ء
، ،	: معارف۔	، ،		اگست-1931ء
، ،	: معارف۔	، ،		ستمبر-1931ء
ماہنامہ	: نگار پاکستان۔	کراچی۔	حصہ اول۔	نومبر۔دسمبر-1978ء
، ،	: نگار پاکستان۔	کراچی۔	حصہ دوم۔	مئی-1979ء
، ،	: نگار پاکستان۔	کراچی۔		جنوری-2000ء
	: نصرت۔	آزادی نمبر۔		14اگست-1959ء
	: گپ۔	شمارہ نمبر2	جامعہ ملیہ دہلی۔	
سہ ماہی	: العلم۔	کراچی۔	جوہر نمبر۔	اکتوبر۔دسمبر-1978ء
سہ ماہی	: الزبیر۔	بھاولپور۔	تحریک آزادی نمبر۔	1970ء
، ،	: الزبیر۔	، ،	، ،	اپریل-1991ء
ماہنامہ	: نوائے آزادی۔	بمبئی نمبر8	جامعہ نگر دہلی۔	1958ء
مجلّہ	: تحریکات ملی۔			

مرتبین: ڈاکٹر ابو سلیمان شاہجہانپوری۔ پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد۔ پروفیسر فصیح الدین صدیقی

مجلّہ	: برگِ گل۔	جوہر نمبر۔	گورنمنٹ اردو کالج کراچی۔	1401ھ
مجلّہ	: علم واگہی۔	جوہر نمبر۔	گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی۔	1980ء

مرتبین: ڈاکٹر ابو سلیمان شاہجہانپوری۔ پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد۔ پروفیسر فصیح الدین صدیقی

مجلّہ	: جوہر نمبر۔	گورنمنٹ سٹی کالج کراچی۔	1978-79ء
مجلّہ	: جوہر نمبر۔	گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی۔	1978-79ء
مجلّہ	: پاکستان نمبر۔	گورنمنٹ سٹی کالج کراچی۔	1983ء

اخبارات

اہل حدیث۔	:	امرتسر۔	13 نومبر-1919ء
البشیر	:	دہلی	19دسمبر-1934ء
الامان	:	دہلی۔	رئیس الاحرار نمبر۔ فروری-1931ء
امروز	:	لاہور۔	5جنوری-1953ء

امروز	:	لاہور۔	4جنوری-1978ء
؍	:	؍	5جنوری-1979ء
؍	:	؍	4جنوری-1980ء
؍	:	؍	6جنوری-1984ء
؍	:	؍	4جنوری-19785ء
اعلان	:	کراچی۔	24مئی-1978ء
؍	:	؍	8دسمبر-1978ء
؍	:	؍	25دسمبر-1979ء
امن	:	کراچی۔	11دسمبر-1979ء
؍	:	؍	یکم جنوری-1984ء
؍	:	؍	4جنوری-1985ء
؍	:	؍	4جنوری-1986ء
؍	:	؍	4جنوری-1993ء
؍	:	؍	23اگست-1996ء
انقلاب	:	کراچی۔	یکم مارچ-1985ء
؍	:	؍	5جنوری-1987ء
انصاف	:	کراچی۔	27دسمبر-1978ء
امت	:	کراچی۔	28جنوری-1977ء
؍	:	؍	5جنوری-1997ء
پیسہ اخبار	:	لاہور۔	28اپریل-1920ء
؍ ؍	:	؍	18جولائی-1920ء
؍ ؍	:	؍	12اگست-1920ء
تجارت	:	لاہور۔	28جنوری1979ء
تہذیب	:	کراچی۔	4جنوری-1988ء
جسارت	:	کراچی۔	5جنوری-1979ء تا15مارچ-1994ء
جہاد	:	پشاور۔	4جنوری-1978ء
؍	:	؍	16ستمبر-1983ء
؍	:	؍	4جنوری-1987ء
؍	:	؍	24اپریل-1998ء
جدت	:	پشاور۔	10جنوری-1985ء

جنگ	:	کراچی۔	4جنوری-1975ء تا5جنوری-1994ء
جنگ	:	لاہور۔	13اپریل-1980ء
جنگ	:	راولپنڈی۔	8مارچ-1979ء
جنگ	:	لندن۔	7اکتوبر-1977ء
حریت	:	کراچی۔	6جنوری-1975ء تا4جنوری-1991ء
خلافت	:	دہلی۔	یکم مئی-1920ء
〃	:	〃	23مئی-1920ء تا-1923ء
دیانت	:	سکھر۔	5اکتوبر-1987ء
〃	:	〃	20اکتوبر-1987ء
〃	:	〃	27اکتوبر-1987ء
دبدبہ سکندری	:	رام پور۔	یکم نومبر-1920ء
رہبر	:	بھاولپور۔	14جنوری-1985ء
زمیندار	:	لاہور۔	19اگست-1920ء
〃	:	〃	21اگست-1920ء
زمانہ	:	لاہور۔	7فروری1977ء تا21جنوری-1991ء
سعادت	:	فیصل آباد۔	20دسمبر-1978ء تا7جنوری-1987ء
〃	:	〃	4جنوری-1993ء
〃	:	〃	23اگست-1996ء
علی گڑھ گزٹ	:		29اگست-1921ء
〃 〃	:		13جون-1924ء
〃 〃	:		13اکتوبر-1924ء
عوام	:	فیصل آباد۔	9جنوری-1980ء
〃	:	〃	4مارچ-1980ء
غریبوں کا اخبار	:	دہلی۔	19اکتوبر1926ء
غریب	:	فیصل آباد۔	یکم جنوری1979ء تا11جنوری-1989ء
فتح اسلام	:	حیدرآباد۔	22جنوری-1979ء تا29جولائی-1979ء
قلت	:	فیصل آباد۔	4مارچ-1984ء
کلیم	:	سکھر۔	19اگست-1978ء تا8جنوری-1987ء
مغربی پاکستان	:	لاہور۔	17دسمبر-1978ء
مشرق	:	کراچی۔	4جنوری-1975ء تا6جنوری-1995ء

مسلم	:		18نومبر-1921ء
مساوات	:	لاہور۔	24-25-26جنوری-1979ء
مزدور	:	کراچی۔	13جنوری-1991ء
نوائے وقت	:	لاہور۔ کراچی۔	4جنوری-1976ء تا4جنوری-1993ء
نئی آواز	:	کراچی۔	28فروری-1979ء
نقیب	:	فیصل آباد۔	28فروری-1979ء
نوائے پاکستان	:	فیصل آباد۔	16فروری-1986ء
،	:	،	یکم فروری-1988ء
ہلال	:	کراچی۔	13دسمبر-1978ء
ہمدرد	:	دہلی۔	8مارچ-1913ء تاجنوری-1915ء
،	:	،	نومبر-1924ء تااپریل-1929ء

BIBLIOGRAPHY

(Books)

Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom.* (Bombay-1964)

Albirani, A.H., *Makers of Pakistan and Modern India.* (Lahore-1950)

Ambedkar, B.R., *Pakistan on the Partition of India.* (Bombay-1945)

Ahmad, Gulzar, *Turkey Rebirth of a Nation.* (Karachi-1961)

Allana, G., *Our Freedom Fighters-1562-1947.* (Lahore-1985)

Ahmad, Jamil-ud-Din, *Historic Documents of Muslim Freedom.* (Lahore-1965)

——————— *Early Phase of Muslim Political Movement.* (Lahore-1965)

Ahmad, Kh. Jamil, *Hundred Great Muslims.* (Lahore-1984)

Ahmad, Mohammad Saleem, *The All India Muslim League.* (Bahawal Pur-1988)

Aziz, K.K., *Britain and Muslim India.* (London-1967)

——————— *The Making of Pakistan.* (London-1967)

——————— *Syed Ameer Ali, His Life and Works.* (Lahore-1968)

——————— *The Indian Khilafate Movement-1915-1933. A Documentory Record.* (Karachi-1972)

Ali, Mohammad, *Presidential Address of Moulana Mohammad Ali, Cocanada,26,Dec.1923.* (Jamia Millia Press Aligarh-1928)

Akhtar, Rafique, (Ed) *Historic Trial Moulana Mohammad Ali and others.* (Karachi-1971)

Abid, S. Qalb-I., *Muslim Struggle for Independence.* (Lahore-1997)

Ahmad Sufia, *Muslim Community in Bengal-1884-1912.* (Dacca-1974)

Bahadur Lal, *The Muslim League.* (Agra-1954)

Brown, J.M., *Gandhi Rise to Power in India Politics-1915-1922.* (Cambridge-1972)

Bose, Subhas Chander, *The Indian Struggle.* (London-1959)

Banerji, Surrendar Nath, *A Nation in the Making.* (Oxford-1925)

Berkes, Niyazi, *Turkiye,d Cagdaslasma,* (Istambul-1978)

——————— *Ataturk Ve Devrimle.* (Istambul-1982)

Berkes, Niyazi, *Development of Secularism in Turkey.* (MeGill-1964)

Bakshi, S. R., *Ali Brothers : Role in Freedom Struggle.* (Delhi-1993)

Burn, William Wedden, *Allan Actavan hume.* (London-1913)

Bayur, Y.H., *Hindistan Tarike C.I.* (Ankara-1946)

Chesney, G., *India, The Political out look. Nineteenth Century.* (Delhi-1994)

Craik, Henry, *Impressions of India.* (London-1908)

Chand, Tara, *History of the Freedom Movement in India.* Vol-3. (Lahore-1972)

Dilks, David, *Curzon in India.* (Newyark-1970)

Durani, F.K.K., *The Meaning of Pakistan.* (Lahore-1966)

Demello, F.M., *The Indian National Congress. A Historical Sketch.* (London-1938)

Everaly, Lord, *The turkish Empire.* (Lahore-1952)

Gungor, G., *Islam in Bugunku Meseldcri.* (Istambul-1966)

Greenwel, Hery, J., *His Highness : The Aga Khan, Imam of Ismailies.* (London-1952)

Gandhi, M. A., *Story of My Experiences With Truth.* (Ahmad Abad-1976)

Gopal, Ram, *Indian Muslims : A Political History.* (Bombay-1959)

Ghosh, S., *Political Ideas and Movement in India.* (Bombay-1975)

Hamid, Abdul, *Muslim Separatism in India-1858-1947.* (Oxford-1967)

Hameed, J.A., *Historic Documents of the Muslim Freedom Movement.* (Lahore-1970)

Hardinge, Lord, *My Indian Years.* (London-1948)

Hasan, Mushirul, *Mohammad Ali in Indian Politics, Select writings-1906-1916.* (Karachi-1985)

———————— *Mohammad Ali in Indian Politics. Select Writings-1917-1919.* (Karachi-1985)

———————— *Muslims and Congress Select Correspondence of Dr. M.A Ansari-1919-1935.* (Delhi-1979)

———————— *Mohammad Ali : Ideology and Politics.* (Delhi-1981)

———————— *Nationalism and Communal Politics in India.* (Delhi-1974)

Haq, Moinul, *Mohammad Ali, Life and Works.* (Karachi-1978)

Haq, Moinul, (Ed), *History of the Freedom Movement.* Vol-3 (Karachi-1979)

Hardy, Peter, *The Muslims of British India.* (Cambridge-1972)

Hunter, W.W, *Our Indian Muslims.* (London-1971)

H. William,Me Neilt &, Marilyn Robinson Valdman, (Ed) *The Islamic World.* (Oxford-1977)

Iqbal, Afzal, *My Life : A Fragment.* (Lahore-1942)

——————— *Life and Times of Mohammad Ali.* (Lahore-1979)

——————— *Selected Writings and Speeches of Mohammad Ali.* (Lahore-1963)

Ikram, S.M., *Modern Muslim India and the birth of Pakistan.* (Lahore-1978)

Jafri, Ris Ahmad, *Selection from Commarade.* (Lahore-1965)

Jackson, Stanley, *The Aga Khan, Prince, Prophet, and Sportsman.* (London-1952)

Khan, Abdul Waheed, *India Wins Freedom. (Other Side)* (Karachi-1961)

Khan, Aga, *The Memories.* (London-1954)

Khaliquzzaman, Choudhry, *Path Way to Pakistan.* (Lahore-1993)

Kaland, Keth, *A Pakistan Political Study.* (London-1957)

Khan, S. Sardar Ali, *India of Today.* (Bombay-1908)

Khan, Shafeeq Allah, *Two Nation Theory.* (HadraAbad Dakun-1973)

Lelyveld, D., *Aligarh's First Generation, Muslim Solidarity in British India.* (Princeton-1978)

Minault, Gail, *The Khilafate Movement.* (Bombay-1982)

Minto, Lady, *India Minto and Moraeley.* (Countess of Minto-1905-1910) (London-1943)

Mujeeb, Mohammad, *The Indian Muslims.* (Londra-1967)

Mowat, R.B., *A History of the European Diplomacy.* (London-1922)

Majumder, R.C., *History of the Freedom Movement in India.* (Lahore-1981)

Mahmood Safder/ Javeed Zafar, *Founders of Pakistan.* (Lahore-1968)

Mohammad, Shan, *The Indian Muslims.* (Delhi-1980-83)

——————— *Freedom Movement in India : The Role of Ali Brothers.* (Delhi-1979)

Mathur, Y.B., *Growth of Muslims Politics in India.* (Lahore-1980)

Niemejer, A.C., *The Khilafate Movement in India-1919-1924.* (London-1972)

Nehru, Jawahar Lal, *An Autobiography.* (Delhi-1962)

Noman, Mohammad, *Muslim India.* (Allah Abad-1942)

Pandey, B.N (Ed), *Leadership in South Asia.* (Delhi-1977) (Essay : Francis Robinson : 17 Professional Politicians in Muslim Politics-1911-1923)

Philips, C.H, *The Evolution of India and Pakistan-1858-1947.* (Lonon-1962)

Pteabhi, Seata Ramia, *History of the India National Congress.* Vol-I Mudres-1935. Vol-2 Bombay-1947.

Pirzada, Shereef-ud-Din, *Evolution of Pakistan.* (Lahore-1963)

——————— *Foundations of Pakistan, All India Muslim* Documents-1906-1947. (Karachi-1970)

Qurashi, I.H, *The Muslim Community of the Indo Pakistan-Subcontinent.* (Hage-1962)

——————— *A Short History of Pakistan.* (Karachi-1984)

——————— *Ulema in Politics.* (Karachi-1972)

Qurashi, M.N, *Khilafate Delegation to Europe.* Feb,October-1920. (Karachi-1980)

——————— *The Khilafate Movement in India-1919-1924.* (London-1973)

Rajput, A.B, *Muslim League Yesterday and Today.* (Lahore-1948)

Robinson, Francis, *Separatism Among Indian Muslims, The Politics of the United Provinces.* (London-1974)

Ronaldshay, Lord, *Life of Curzon.* (London-1928)

Reading, Lord, *Rufus Isaacs, First Marquers of Reading.* Vol-2 (London-1945)

Rai, Lajpat, *Un-Happy India.* (Calcutta-1928)

Roy Manabendra Nath, *One Year of Non-Cooperation.* (Delhi-1933)

Syeed, Khalid Bin, *Pakistan the Formative Phase.* (Karachi-1960)

Sundarm, Lanka, *The Last Political Testament of The late Moulana Mohammad Ali.* (Delhi-1944)

Sdiq, Mohammad, *The Turkish Revolution and the Freedom Movement.* (Delhi-1983)

Spear, Percivald, *India : A Modern History.* (Ann Harbor-1961)

Spear, T.G.P., *India : Pakistan and The West.* (NewYark-1967)

Symods, Richard, *The Making of Pakistan.* (London-1950)

Taunk, B.M, *Non Co-operation Movement in Indian Politics-1919-1924. A Historical Study.* (Delhi-1978)

Temple, Richard, *India in 1880.* (London-1980)

Wasti, S. Razi, *Memories and Other Writings of Syed Ameer Ali.* (Lahore-1968)

——————— *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.* (Oxford-1964)

Yusufi, Allah Bakhsh, *The Kilafate Movement.* (Karachi-1984)

——————— *Moulana Mohammad Ali Jauhar.* Vol-1 (Karachi-1970)

Yajnik, Indulal, *Gandhi as I Know Him.* (Delhi-1943)

Official Records and Reports

— Private Dairy of Sir Fazil-I-Husain-1902.

— Private Papers of Lord Hardinge-1911-1916.

— Montagu-Chelmsford Report on Indian constitutional Reforms Cmd. 9109, 1918.

— Written Statement filed by Mohammed Ali to the Enquiry Committee appointed by the Government of India to enquire into the Question of his Release-J&P. 3915,1919.

— Report of B. Lindsay, Judicial Commissioner of Oudh, and Mr. Rauf, Judge, High Court, AllahAbad, on the Case against Ali Brothers J&P. 1451,1919.

— Private Papers of Lord Reading-1921-1926.

— Collection of Malik Lal Khan. File-No.5

— (Complete Files) File-No.6

— The Indian Annual Register-1923.

Articles and Pamphlets

— Journal of the Pakistan Historical Society Part II April-1988. Karachi

— Journal of the Research Society of Pakistan. April-1981.

— Modern Asian Studies. VIII 1974.

— Mohammad Ali : Proceedings of A Public Meeting of the Mohammedans Assembled from different Parts of India at Dacca on the 30th Decembar, 1906, to discuss the formation of the All India Muslim League, under the Chairmanship of Nawab Viqar-Ul Mulk, Lucknow, (Reprinted by the National Archives of Pakistan-1967.)

— Aligarh Institute Gazette-1888.

— RamPur State Gazette-1888.

— Aligarh Magazine, Special Number-1953-54.

— Aligarh Magazine, Special Number-1954-55.

News Papers

Busniss Recorder	:	Karachi	17-Dec-1978.
________________	:	---------	19-Dec-1978.
________________	:	---------	7-April-1988.
Civil and Military gazette	:	Lahore	3-June-1913
Dawn	:	Karachi	16-Dec-1978.
________________	:	---------	17-Dec-1978.
________________	:	---------	18-Dec-1978.
________________	:	---------	19-Dec-1978.
________________	:	---------	31-Dec-1978.
________________	:	---------	6-Jan-1984.
________________	:	---------	23-Feb-1988.
________________	:	---------	4-Jan-1989.
________________	:	---------	4-Jan-1993.
________________	:	---------	4-Jan-1994.
________________	:	---------	4-Jan-1995.
________________	:	---------	4-Jan-1996.
________________	:	---------	4-Jan-1997.
Muslim News	:	Karachi	17-Dec-1978.
________________	:	--------	22-Feb-1985.
________________	:	--------	4-Jan-1989.
Manchester Guardian	:	Calcutta	3-June-1907.
Morning News	:	Karachi	4-Jan-1976.
________________	:	--------	30-Dec-1977.
________________	:	--------	18-Dec-1978.

Morning News	:	Karachi	20-Dec-1978.
———————	:	———	4-Jan-1980.
———————	:	———	6-Jan-1991.
Mussalman	:	Calcutta	14-Jan-1938.
The Muslim World	:	Islam Abad	23-Dec-1978.
———————	:	———	4-Jan-1988.
———————	:	———	15-Jan-1988.
———————	:	———	4-Jan-1991.
Pakistan Times	:	Lahore	2-March-1979.
	:	RawalPindi	16-Dec-1978.
———————	:	———	17-Dec-1978.
———————	:	———	2-Feb-1979.
———————	:	———	4-Jan-1984.
Son	:	Karachi	21-Dec-1978.
The Commarade	:	Vol-1	No-1-1911
———————	:	Vol-1	No-4-1911
———————	:	Vol-4	No-1-1912
———————	:	Vol-4	No-2-1921
———————	:	Vol-5	No-1-1913
———————	:	Vol-6	No-1-1913
———————	:	Vol-14	No-9-1914
———————	:	Vol-1	No-1-1924